اُردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

جلد ۱۶

نمبر ۱

وری سنہ ۱۹۱۴ عیسوی - مطابق دلو سنہ ۱۳۳۲ محمدی

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

داز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

دلگداز! دلگداز! دلگداز!!!

۱۸۸۷ء سے مولنا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر کی ایڈیٹری مین نکل رہا ہی مضامین مین تیر و نشتر یا کسی چشم فتان کی نگاہ ناز ہین جو دل مین اُترتی اور دل ہی دلمین رہ جاتی ہے اعلیٰ درجے کے ادبی و تاریخی مضامین ہوتے ہین۔ ختم سال پر بشرط خریداری سال مابعد مولانا شرر کا ایک نیا ناول خریداران دلگداز کو مفت دیا جاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے سالانہ مع محصول ڈاک

المشتہر منیجر دلگداز کٹرہ بزن بیگ خان۔ لکھنؤ

مولانا شرر کی کتابون کے نئے لائبریری ایڈیشن

نفیس مزاج قدردانان علم کے لیے مولانا شرر کی نئی اور پرانی کتابین بڑے اہتمام کے ساتھ صحیح مسطر پر چھپائی جاتی ہین۔ جن کی نفاست دیکھنے کے قابل ہی اس سلسلۂ طبع کا نام لائبریری ایڈیشن رکھا گیا ہی جو حضرات پہلے سے اجازت دے دیتے ہین اُن کا نام لائبریری ایڈیشن مین درج کر لیا جاتا ہی اور [illegible] کارڈ بھیجکے بلا انتظار جواب وی۔ پی بھیجدی جاتی ہین۔ مجلد کتابون کے خریدارون سے اصل قیمت پر [illegible] اضافہ کر لیا جاتا ہی۔ اگر علمی مذاق کی مربی گری منظور ہو تو فوراً لائبریری ایڈیشن کے رجسٹر مین اپنا نام درج کرائیے

نمبر ۱۔ افسانۂ قیس۔ مجنون عامری کی الف لیلہ جو از سر نو مکمل کی گئی ہے قیمت فی جلد ۱۳ر

نمبر ۲۔ قیس و لبنیٰ۔ مشہور عاشق عرب قیس بن ذریح عذری اور اسکی معشوقہ لبنیٰ کے حالات کو ایک نہایت پر اثر اور دلچسپ ناول کا لباس پہنایا گیا ہے قیمت فی جلد ... عہ

نمبر ۳۔ حسن بن صباح۔ بانی فرقہ باطنیہ کے حالات زندگی اُسکی تعلیمین اُس کا علم و فضل اور اس کے سر بکف فدائی ۱۶ر

نمبر ۴۔ عصر قدیم۔ ایک نہایت مکمل اور سلیس لکھی ہوئی تاریخ جسمین حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کی تمام قومون اسرائیلیون مصریون آسیریا بابل والون ایرانیون یونانیون مقدونیہ والون رومیون ساسانیون بطلیموسیون وغیرہ کے اجمالی حالات ہین .... عہ

نمبر ۵۔ آغا صادق کی شادی۔ لکھنؤ کے [illegible] کی ایک بامذاق تصویر کسی دلہن کے ساتھ قیمت ۔ ۱ر

نمبر ۶۔ فلورا فلورنڈا۔ اندلس کا آخری دور مسلمانون کی برداشت اور مسیحیون کا احمقانہ تعصب نہایت دلچسپ اور پر اثر تاریخی ناول قیمت .... عہ

المشتہر حکیم محمد سراج الحق منیجر دلگداز کٹرہ بزن بیگ خان۔ لکھنؤ

دوستو! اب ہم ۱۹۱۴ء میں ہیں۔ اور ۱۹۱۳ء اُسی عدم آباد میں پہونچ گیا جہاں اُس کے سے ہزارہا سنین ماضیہ جا چکے ہیں۔ ۱۹۱۳ء کے خاتمہ سے ذرا پہلے ہم نے آپ کو متنبہ بھی کر دیا تھا کہ یہ برس رخصت ہوا چاہتا ہے۔ اپنی منازل دوازدہ گانہ پوری کر چکا اور اب جانے ہی کو ہے۔ لیکن اس بتا دینے پر بھی جس وقت یہ راتوں رات منہ چھپا کے ہماری دنیا سے بھاگا ہے شاید آپ کو خبر نہ ہوئی ہوگی۔

آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کس طرح خاموشی و سہولت سے اور ہم سب کی آنکھ بچا کے چوروں کی طرح بھاگا ہے۔ اور کیسے دبے پاؤں گیا ہے کہ ۳۱ دسمبر کی رات کو آپ آرام اور بے فکری سے سوئے اور یکم جنوری کی صبح کو اُٹھے تو معلوم ہوا کہ ۱۹۱۳ء گیا اور ہم ۱۹۱۴ء کے آغوش میں ہیں۔

برس آتے تو خوشیوں اور امید و آرزو کے پُرلطف خیالوں کے ساتھ ہیں۔ مگر جاتے اس طرح چھپ کے ہیں کہ اُنھیں رخصت کرتے وقت دو آنسو بہانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم سال کے پہلے دن خوشیاں مناتے مسرت و شادکامی پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں مگر جانے والے سنین کو گرمجوشی سے الوداع کہنے کا ارادہ ہی کرتے رہ جاتے ہیں اُس کی نوبت نہیں آتی۔ اور

اسی اندیشہ سے ہم نے رخصت کی گھڑی آنے سے پہلے ہی اُسے رخصت کر دیا اور چند کلمات حسرت زبان سے ادا کر کے دل کی حسرت نکال لی۔

یہ اُس کامیابی ہی کی برکت ہے کہ اب فارغ البالی کے ساتھ ہم اپنے نئے دوست سنہ ۱۹۱۴ء سے معانقہ کرتے ہیں۔ یہ نیا سال اپنے آغاز ہی میں ہمارے شہر کے لیے ایک غیر معمولی خوشی و خوش نصیبی لایا ہے۔ وہ یہ کہ حضور وائسراے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل بہادر اوائل جنوری میں ہمارے شہر میں رونق افروز اور ہمارے مہمان ہوئے۔ اور قبل اس کے کہ ہمیں کسی فکر و تردد یا کسی رنج و الم سے سابقہ پڑے سب سے پہلے ہم نے اپنے مہربان وائسراے کے ورود مسعود پر جشن طرب منایا۔ سچ یہ ہے کہ ہماری اس سال کی زندگی کی بنیاد اچھی پڑ گئی۔ اور سنہ ۱۹۱۴ء کے واقعات مسرت و کامرانی سے آغاز ہو گیا۔ جس پر لکھنؤ جس قدر فخر کرے بجا ہے۔

لہذا جس طرح دکاندار صبح صبح کوئی اچھا سودا ہو جانے پہ خوش ہو کے کہتا ہے "بھئی اچھی ہوئی ہے دن بھی اچھا کٹے گا" ویسے ہی ہم بھی آغاز سال کی اس اعلیٰ مسرت مارے خوشی کے جامے سے باہر ہو کے کہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۴ء کا آغاز لطف و مسرت سے ہوا ہے تو بارھوں مہینے انشاء اللہ شادکامی و لطف میں گزریں گے۔

نیک فالی کے اس سے زیادہ نمایاں کیا آثار ہوں گے کہ پالٹکس کے اُفق سے قتل و خونریزی اور تاخت و تاراج کا ابر چھنٹ گیا اور مطلع صاف نظر آ رہا ہے۔ جتنے فتنے فساد تھے اور جو کچھ شور و شر تھا سنہ گذشتہ کے ساتھ گیا۔ اور سنہ حال کی پہلی صبح صبح اقبال اور امن و امان کی سحر بن کے نمودار ہوئی ہے۔

بس۔ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ اس عیش کو افکار زمانہ سے مکدر اور اس لطف کو کل کی فکروں سے منغص کر کے ہم خود بھی پریشان ہوں اور اپنے احباب اور قدر افزایان دلگداز کے اطمینان میں بھی خلل ڈالیں۔ لہذا اس مسرت و شادکامی کے موقع پہ ہم خوشی خوشی اپنے احباب سے بغلگیر ہوتے اور نہایت ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ خدا ہمیں بھی مبارک کرے اور ہمارے سارے دوستوں کو بھی۔

آل عثمان میں پہلی سلطانۂ مسیحیہ

ترکان آل عثمان کا دوسرا تاجدار اُورخان ہے جو عثمان خان بانی خاندان کا سعادتمند فرزند تھا۔ اُس کا عہد ۱۳۲۶ء سے لے کے ۱۳۶۰ء یعنی ۳۴ سال تک رہا۔ اور یکہ آرائی کے اعتبار سے گو کہ وہ اپنے خاندان کا دوسرا تاجدار تھا مگر سچ یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ اُسی کے عہد سے ایک ترقی کرنے والی زبردست سلطنت بننا شروع ہوئی۔ اُس زمانے تک اُدھر کی تمام اسلامی قلمرو ون میں پُرانا سلجوقیون کا سکہ مروّج تھا اورخان نے خاص اپنے خاندان کا سکہ جاری کیا۔ سب سے پہلے اُس نے شہر بروصہ پر قبضہ کر کے اُسے اپنا مرکز حکومت بنایا۔ عالی شان جامع مسجد، شاہانہ عظمت وجلال کے دارالعلوم۔ اور رفیع الشان خیرات خانے سے اُس نے اپنے اُس نئے دارالسلطنت کو رونق دی۔ اور آراستہ ایک اسلامی شہر بنا دیا۔ توحید کی صدا بلند ہوتے ہی نیقیہ کا عیسائی کلیسیا (فرقہ) فنا ہو گیا۔ اور جس طرح خدا کے شریک دیوتاؤن کے مندر مسیحیت کی صدا سے منہدم ہو لئے تھے ویسے ہی اب بیٹے والے خدا کے معبد خداے "لم یلد ولم یولد" کے آگے سربسجود ہو گئے۔

چند ہی روز میں اُورخان نے مسیحی دولت یونان کے اُن شہرون اور علاقون کا قبضہ کر لیا جو ایشیاے کوچک میں واقع تھے اور جنھیں یونانیون کی قدیم مہابھارت جنگ ٹرائے سے تعلق تھا۔ اُن دنون یونانی سلطنت جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا وحشی بلغاریون کے دست ستم سے خائف تھی۔ وارثان سلطنت میں جھگڑے تھے۔ اور سلطنت یونان اپنے پڑوسیون کا نام لے لے کے دہائیان دے رہی تھی اسی اثنا میں ترکون نے اپنی بحری قوت مضبوط کرنا شروع کی تاکہ جزائر یونان اور بلاد یورپ پر حملہ آور ہون۔ ترک اُدھر بڑھنے کا منصوبہ دل میں ٹھہرا ہی رہے تھے کہ "کانتا کوزین" نے جو ولی کی حیثیت سے نظم ونسق سلطنت کا ذمہ دار تھا بلغاریون کی آفت سے بچنے کے لیے اُنھیں خود ہی اپنا مدد پر

بُلایا - یہ مدد نہایت ہی فیاضی اور کشادہ دلی سے دی گئی - ایک ترک سردار اپنے زبردست لشکر کو جہازون مین بٹھا کے ساحل بلقان پر لے گیا - ساری فوج جہازون ہی پر چھوڑی اور تھوڑے سے منتخب جوانمردون کے ساتھ شہر ڈیوٹکا مین پہونچا جہان یہ حالت تھی کہ "کاناکوزین" منھ چھپا کے سرویا کی طرف بھاگ گیا تھا - لوگون کو خبر بھی نہ تھی کہ زندہ ہے یا مر گیا - اُس کی بی بی "ایرینہ" شہر کے اندر محصور تھی - اور بلغاری محاصرہ کیئے ہوے تھے - ترکون نے پہونچتے ہی بلغاریون کو بھگا دیا - اور اگرچہ سخت سردی کا موسم تھا فصیل شہر کے باہر اُتر پڑے -

ملکۂ ایرینہ نے اظہار شکرگزاری کے لیئے بہت سے قیمتی تحف وہدایا اور نفیس گھوڑے ہدیۂ نذر کیئے اور سردار عساکر ترک کو اپنے محل مین بطریق دعوت بُلایا - اُس کی دلچسپی کے لیے بڑے بڑے سامان کیئے - اور کہلا بھیجا کہ جلدی تشریف لایئے مین آپ کی منتظر ہون - مسلمان سردار نے اس دعوت کے قبول کرنے سے انکار کیا - مگر کیون ؟ خیال کیا گیا کہ شاید سردار ترک اس لیئے عیش کدۂ شاہی مین نہین آتا کہ اُس کے ہمراہی شہر کے باہر برف اور سردی مین پڑے اکڑ رہے ہین - وہ نہین چاہتا کہ اپنے رفیقون کو تکلیف مین چھوڑ کے خود دعوت کھائے اور قصر شاہی مین عیش منائے - لیکن نہین مسلمان سردار کا معیار شرافت یونانیون کے خیال و مذاق سے بہت بلند اور نہایت شریفانہ تھا - اُس نے کہلا بھیجا "میرا نفس اس بات کو نہین گوارا کرتا کہ میرا جو برگشتہ بخت دوست گھر سے غائب اور خانمان برباد ہے اُس کی غیبت مین اُس کی جورو کے پاس اُٹھون بیٹھون اور اُس سے ہم صحبت ہون" یہ ایک ایسی اعلیٰ تہذیب تھی جس سے یورپ والون کے کان اُس وقت تک ناآشنا تھے - الغرض اُس نے جہان تک بنا حاکم یونان "کاناکوزین" کی جستجو کی - اور جب اُس کا پتہ نہ لگا تو بغیر اس کے کہ اُس کی بی بی سے تنہائی مین ملے بہت سا مال غنیمت اور بہت سے لونڈی غلام جو دشمنون سے ملے تھے - لے کے واپس چلا آیا -

مورخین یورپ کہتے ہین کہ ترکون نے دول بلقان کو باہم لڑا کے اُس ملک پر قبضہ کر لیا - مگر دغا بازی کے اُس فن کے استاد یورپی تھے - مسلمانون اور ترکون کو یہ کاٹ پھانس نہین آتی تھی - اُن کا قدم خالص ہمدردی کے خیال سے پہلے پہل یورپ مین گیا تھا - لیکن اس موقع پر یورپ والون نے اُن کی زبردست بحری قوت کو دیکھ کے کوشش کی کہ اُن کا استیصال کر دین چنانچہ قبلۂ و کعبہ جناب پوپ نے اُن کے خلاف جہاد (کروسیڈ) کا فتوی دے دیا - شاہ قبرس - سلطنت جمہوری وینس - اور سینٹ جان کی نیتھ والے مذہبی بانکے جو صلاح الدین اعظم کے ہاتھون بیت المقدس سے نکالے گئے تھے اور سبھی دنیا مین خدائی فوجدار بنے پھرتے تھے مع حواریین حضرت پوپ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے - مگر لڑائی میں اپنا رنگ کچھ ایسا بگڑتا نظر آیا کہ گھبرا گئے اور ترکون سے صلح کر لی -

ان موافقانہ و مخالفانہ واقعات نے پوپ صاحب کو تو ترکون کی قوت توڑنے کی مصلحت سجھائی لیکن ترکون کو جو مصلحت سوجھی وہ انوکھی دلچسپ اور مزہ دار تھی - وہ یہ کہ حاکم یونان سے قرابت پیدا کی جائے سلطان اورخان نے کانتاکوزین کی حسین و نازنین خورو شِ و پری جمال بیٹی تھیوڈورا کو کہین دیکھ لیا تھا - اور دیکھتے ہی اُس کے رخ زیبا پر فریفتہ ہو گیا تھا - اس پولٹیکل مصلحت کا خیال آتے ہی کانتاکوزین سے باادب و تہذیب درخواست کی گئی کہ اگر آپ اپنی بیٹی تھیوڈورا کو میرے عقد نکاح مین دے دین تو مین آپ کا دوست بن جاؤن - اور ایک ادنیٰ خادم اور بیٹے کی طرح آپ سے پیش آیا کرون "

شریعت اسلام نے کتابیہ یعنی نصرانیہ اور یہودیہ عورت کے ساتھ نکاح پہلے ہی سے جائز بتایا تھا - عیسائی پُر تعصب دنیا مین اس کا فتویٰ حاصل کرنا البتہ دشوار نظر آتا تھا - لیکن جب شہنشاہ قسطنطنیہ کو اس قرابت مین اپنی پولٹیکل مصلحت نظر آئی تو یونانی کلیسا نے بھی ذوق و شوق سے اجازت دے دی - اور قسطنطنیہ کے محل مین شاہانہ جشن کا سامان شروع ہوتے ہی

جوش و خروش سے ہر یاے گائے جانے لگے -

خود اور خان دُلھن کے بیاہنے کو نہین گیا بلکہ اُس کی جگہ اُس کا سفیر اور بہت سے معزز سرداران ترک ۳۰ جہازون پر سوار ہوکے گئے اور مقام سلیبریا مین پہونچے جہان دُلھن والون کی طرف سے جشن طرب منعقد ہونے والا تھا - شاہانہ جاہ و جلال سے ایک عالیشان کوشک بنا کے حجلۂ عروسی کی طرح آراستہ کی گئی - جس کے چارون طرف ریشمی زرکار پردے پڑے ہوئے تھے - اور آراستگی کا کوئی سامان نہین اُٹھا رکھا گیا تھا - صبح کا سہانا وقت تھا کہ مسلح فوج زرق و برق وردیان پہنے صفین باندھ کے گرد کھڑی ہوگئی - کل اعلی و ادنی افسر ادب سے پا پیادہ کھڑے تھے فقط سردار کا نائب گھوڑے کی پیٹھ پر تھا - کوشک کے اندر ایک مرصع تخت زرین پر مہ جبین تھیوڈورا بڑے بناؤ چناؤ کے ساتھ لاکے بٹھائی گئی - وہ پُر تکلف بھاری کپڑے پہنے تھی - سر سے پاؤن تک زیور و جواہرات سے آراستہ تھی - بڑی بڑی ہوشیار مشاطاؤن نے اس کا سنگھار کیا تھا - اور وہ ایک آسمانی دیوی یا حور بنا کے اپنے تخت زرنگار پر نزاکت و انداز سے بٹھائی گئی -

جب سب سامان درست ہوگیا تو ایک تُرہی بجی - اور اُس کی طلسمی آواز کے ساتھ ہی تمام حاضرین اور سمدھیانے والون یعنی سرداران ترک کو ایک جادو کا سا کارخانہ معلوم ہوا - یعنی وہ تمام زرنگار پردے ایک چشم زدن مین خود بخود کھنچ کے غائب ہوگئے - اور نظر آیا کہ مشعلین بلند ہین - مہتابین چھوٹ رہی ہین - ملائک فریب تھیوڈورا اپنے زرنگار مرصع تخت پر جلوہ افروز ہے - اُس کی ماں شہنشاہ بیگم ایرینہ اُس کے برابر بیٹھی شوق و محبت کی نگاہون سے بیٹی کے پروان چڑھنے کا تماشا دیکھ رہی ہے - اور صدہا خواجہ سرا - فرشتہ صورت غلام اور حور طلعت کنیزین آگے پیچھے اُس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہین جو ادب کے ساتھ گھٹنے ٹیکے اور ہاتھ جوڑے ہین - گویا سب اپنی پری رخسار دیوی کی پرستش کر رہے ہین - پردون کے ہٹتے ہی ہر چہار طرف باجے بجنا شروع ہوئے - نفیری اور شہنائی کا نغمہ بلند ہوا - نقارون پر چوبین پڑین - ڈونیون نے میری

ہریالی بنو کا ترانہ گایا- اور مستند شعراے زمانہ نے اُس کی مدح کے
قصیدے سنائے- اس شان اور اُن بان سے بغیر اس کے کہ گرجے مین
عقد نکاح کی کوئی رسم ادا ہو دُلھن رخصت کر کے ترک سفیرون کے سپرد کر
دی گئی- اور خان نے صرف اس بات کا اقرار کیا تھا کہ دُلھن اپنا مذہب
بدلنے پر مجبور نہ کی جاے گی- اور کسی مسیحی رسم کو نہین قبول کیا تھا- جیسے ہی
دُلھن کی سواری بروسہ مین پہونچی اور خان نے اپنے چارون بیٹون
اور تمام بی بیون حرمون اور مخصوصین دربار کے ساتھ شہر کے باہر آکے استقبال
کیا- یہان اسلامی اصول کے مطابق عقد نکاح ہوا- اور تھیوڈورا مسلمانون کی سلطانہ بن گئی

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

اس کے تسلیم کرنے مین شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ ہندوستان مین مشرقی تہذیب و
تمدن کا جو آخری نمونہ نظر آیا وہ گزشتہ دربار اودھ تھا- اگلے دور کی یادگار
اور بھی کئی دربار موجود ہین مگر جس دربار پر پرانی تہذیب اور اگلی معاشرت کا
خاتمہ ہوگیا وہ یہی دربار تھا جو بہت ہی آخر مین قائم ہوا اور عجیب و غریب
ترقیان دکھا کے بہت ہی جلد فنا ہوگیا- لہذا مندرجۂ بالا عنوان کے تحت مین
ہم اس مرحوم دربار کے مختصر حالات اور اُس کی خصوصیتون کو بیان کرنا چاہتے ہین

اس کے تسلیم کرنے مین تو شاید کسی کو عذر نہ ہوگا کہ جس خطۂ زمین پر یہ پچھلا دربار
قائم ہوا اُس کی وقعت اور اہمیت ہندوستان کے تمام صوبون سے بڑھی ہوئی
ہے- پُرانے چندربنسی خاندان خصوصاً راجہ رام چندر جی کے اعلی کارنامے اور
عدیم النظیر ناموریان اس درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی ہین کہ تاریخ کے ظرف کو
تنگ اور محدود دیکھ کے اُنھون نے مذہبی تقدس کا جامہ پہن لیا ہے- اور
آج ہندوستان کا شاذونادر ہی کوئی ایسا بدنصیب گاؤن ہوگا جہان اُن کی
یاد ہر سال رام لیلا کے مذہبی ناٹک کے ذریعے سے تازہ نہ کر لی جاتی ہو- لیکن اودھ
کے اُس قدیم ترین دیوتائی دربار کے حالات اور اجودھیا کا اُس عہد کا جاہ و
جلال والمیکی نے ایسی معجز نما فصاحت کے ساتھ دکھایا کہ وہ ہر عقیدت کیش کی

لوحِ دل پر لکھ گیا - لہذا ہمیں اُس کے اعادے کی ضرورت نہیں - جن لوگوں نے اجودھیا کے پُرانے پُرشکوہ زمانے کی تصویر دالملکی کے لٹرری مرقع میں دیکھی ہے وہ اُسی مبارک خطے پر آج دلگداز میں فیض آباد کی تصویر دیکھیں - لہذا ہم سلسلۂ واقعات کو اُس وقت سے شروع کرتے ہیں جب اس آخری دربار کی بنیاد پڑی جسے فنا ہوئے کچھ اوپر پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا -

جب نواب برہان الملک امین الدین خان نیشاپوری شہنشاہی دربار دہلی کی طرف سے صوبہ دار اودھ مقرر ہوکے آئے تو شیخزادگان لکھنؤ کو مغلوب کرکے قدیم مستقر اودھ یعنی محترم و متبرک شہر اجودھیا میں پہونچے اور آبادی سے فاصلے پر دریاے گھاگرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا - چونکہ انتظام صوبہ کی محویت میں اُنھیں عالیشان عمارت بنانے کی فرصت نہ تھی اور نہ اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے ایسے نمائشی کروفر کا اُنھیں شوق تھا اس لیئے ایک زمانے تک خیموں میں بسر کی - اور جب چند روز کے بعد اُنھیں برسات میں تکلیف ہوئی تو وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کے ایک مناسب مقام پر اپنے لیئے ایک چھپر بنوایا پھر اس کے بعد اُس چھپر کے گرد کچی دیوار کا ایک بہت وسیع مربع حصار کھچوالیا جس کے چاروں کونوں پر قلعہ بندی کی شان سے چار کچے برج بنوا دیئے تاکہ گرد و پیش کی نگرانی کی جاسکے - یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اُس کے اندر رسالے - پلٹنیں - توپخانے اصطبل اور دیگر ضروری کارخانے آسانی سے رہ سکتے تھے - برہان الملک کو چونکہ عمارت کا شوق نہ تھا اس لیئے اُن کے زنانے اور بیگمات کے قیام کے لیئے بھی کچے مکانات ہی بنا لیے گئے - غرض اُس کچے بنگلے میں اُس وقت کا والی اودھ جب اُسے اضلاع کے دورے اور سفرہاے حکمرانی سے فراغت ہوتی آرام و آسائش کے ساتھ رہتا تھا اور کسی بات کی شکایت نہ تھی - اور اُس کا یہ دارالامارت چند روز میں "بنگلہ" کے نام سے مشہور ہوگیا -

---

عہ فیض آباد کے یہ تمام حالات منشی محمد فیض بخش کی "تاریخ فرح بخش" سے لیے گئے ہیں - اصل کتاب ہم نے نہیں دیکھی مگر اُس کا انگریزی ترجمہ مترجمہ ولیم ہوئی جو ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد میں چھپا ہے ہمارے پاس موجود ہے -

برہان الملک کے انتقال کے بعد جب نواب صفدر جنگ کا زمانہ شروع ہوا تو یہ بستی فیض آباد مشہور ہوئی۔ یہ ہے بنیاد شہر فیض آباد کی جس نے اپنے بننے اور بگڑنے کی سرعت مین لکھنؤ کو بھی مات کر دیا۔ اب ان دنون اُس کچی چار دیواری کے گرد اکثر مغل سرداران فوج نے اپنی دلچسپی کے لیے باغ اور پُرفضا فرحت بخش نزہت گاہین بنائین۔ اور شہر کی رونق ترقی کرنے لگی۔ اس کے احاطہ کا ایک پھاٹک "دلی دروازہ" کہلاتا تھا جو مغرب کی طرف تھا اس کے باہر دیوان آتما رام کے بیٹون نے ایک شاندار بازار بنوایا۔ اور اُسی کے سلسلے مین رہنے کے لیے مکانات بھی تعمیر کرائے۔ اسی طرح اسمعیل خان رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا۔ اور چار دیواری کے اندر خواجہ سراؤن اور مختلف فوجی لوگون کے بہت سے مکان بھی تیار ہو گئے۔

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی برس گئی۔ جس کی وجہ سے اتنے دنون مین جو کچھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے رکھ دیا۔ اس لیے کہ اُن کے فرزند نواب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہین رہتے تھے۔ گو سال مین دو ایک راتین اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن مین ضرور بسر کر لیا کرتے۔ یہان تک کہ ۱۷۶۴ء مین اُنھین بکسر کی لڑائی مین انگریزون سے شکست ہوئی۔ اُس وقت وہ کمال بے سر و سامانی سے بھاگتے ہوئے فیض آباد مین آئے اور وہان کے قلعہ مین جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے راتون رات چل کھڑے ہوئے۔ اور لکھنؤ پہونچے۔ یہان بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی۔ تا کہ افاغنۂ روہیلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ لین۔ لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزون سے اُن سے صلح ہو گئی۔ جس کی رُو سے شجاع الدولہ کے ذمے واجب تھا کہ محاصل ملک مین سے ہرج اُٹھائی انگریزون کو ادا کیا کرین۔

صلح ہونے سے پہلے اس سفر مین اتفاقاً شجاع الدولہ کا گزر فرخ آباد مین بھی ہوا تھا جہان احمد خان بنگش سے ملاقات ہوئی جو اُس عہد کے پُرانے تجربہ کار شجاعون مین خیال کیے جاتے تھے۔ اُنھون نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کی

جو تم باگ ڈور حکومت ہاتھ مین لینا تو میری ان دو باتون کو نہ بھولنا۔ ایک تو یہ کہ مغلون کا کبھی اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنے دیگر ملازمون اور خواجہ سراؤن سے کام لو۔ اور دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑ دو اور فیض آباد ہی کو اپنا دار الحکومت بناؤ۔

یہ باتین شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئین۔ اور انگریزون سے معاہدہ ہونے کے بعد ۱۷۶۵ء مین جو اُنھون نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور اسی کو اپنا دار الحکومت قرار دے دیا۔ اب یہان اُنھون نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی۔ نئے رسالے مرتب کرنے لگے۔ اور نئی عمارتون کی بنیاد ڈالی۔ پرانے حصار کو ایک مضبوط شہر پناہ کی شان سے از سر نو تعمیر کرایا۔ جو اب قلعہ کہلاتا تھا۔ مغلون کے جو مکانات اندر واقع تھے ڈھا دیے۔ اور اپنے اکثر خانگی ملازمون کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنوائین۔ اُس حصار کے گرداگرد ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی وضع درست کی گئی۔ اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت کے مناسب قطعات زمین لے کے اُسی میدان مین مکان بنائین۔ جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رُخ ادھر پھر گیا۔ ہزار ہا نفوس آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئے۔ شاہجہان آباد مین یہ حالت تھی کہ جسے دیکھیے فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ دہلی کے اکثر باکمالون نے وطن کو خیرباد کہی اور پورب کا رُخ کیا۔ شب و روز لوگون کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے۔ جو آ کے یہان بستے اور فیض آباد کی سواد مین کھپتے چلے جاتے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش۔ اہل قلم۔ اہل سیف۔ تاجر۔ صناع۔ اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہان جمع ہو گئے۔ اور جو آتا آتے ہی اس فکر مین پڑ جاتا کہ کوئی قطعۂ زمین حاصل کر کے مکان بنا لے۔

چند ہی سال کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلین تعمیر ہو گئین۔ ایک جو پہلے مربع کے جنوبی پہلو سے ملی ہوئی تھی اُس کے رقبے کا طول و عرض دو دو میل کا تھا۔ اور دوسرا حصار ایک میل کے پھیلاؤ مین تھا جو قلعہ اور بیرونی فصیل کے درمیان

واقع تھا - اسی زمانے مین ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوئے - جن کی سڑک قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کے سڑک الہ آباد کے نگر تک چلی گئی تھی اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر برابر دس چھکڑے آسانی سے گزر سکتے تھے۔ فصیل شہر کا اٹھاو زمین کے پاس چالیس ہاتھ ہو اور میان مین وہی گز سے کم نہ تھا جو اوپر پہونچ کے پانچ گز رہ گیا تھا۔ اس فصیل پر قاعدہ اور بے قاعدہ دونون طرح کی فوجون کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے۔ اور جا بجا پہرے دیتے۔ باقاعدہ سپاہیون کی وردی لال تھی اور بے قاعدہ سپاہیون کی وردی سیاہ - انھین سپاہیون کی ضرورت سے برسات مین فصیل پر جا بجا چھپر ڈال دیے جاتے مگر برسات کے ختم ہوتے ہی آگ لگنے کے اندیشے سے وہ لازمی طور پر اٹھا دیے جاتے - چنانچہ صرف فصیل کی دیوارون کے لیئے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر چھائے اور چار مہینے بعد نوچ کے پھینک دیئے جاتے -

حوالی شہر مین دو مرغزار شکارگاہ قرار دیئے گئے تھے جن مین سے ایک مغرب کی جانب گرجی بیگ خان کی مسجد سے گپتار گھاٹ تک چلا گیا تھا جو ایک معتدبہ مسافت ہے - اُس کے دونون طرف کچی دیوارین تھین اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی - اس مین ہرن چیتل - بارہ سنگے - نیل گائین وغیرہ شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے - جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوکڑیان بھرنے لگتے - دوسری شکارگاہ شہر سے مشرق طرف موضع جنورا اور چھاؤنی گوشائین سے دریا کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل کا تھا - اس کے رقبہ مین گیارہ موضع اور اُن کی اراضی آگئی تھی - مگر یہ شکارگاہ ناتمام ہی رہی - اور اس کی نوبت نہ آنے پائی کہ اُس مین وحشی جانور چھوڑے جائین -

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے نزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے آ کے اُن مین سیر کرین اور اُن کی بہار اور شادابی سے لطف اُٹھائین - ایک انگوری باغ جو قلعہ کے اندر واقع تھا - اور اُس کے رقبہ کے چوتھائی حصہ پر حاوی تھا - دوسرا موتی باغ جو عین چوک کے اندر واقع تھا -

تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی۔ اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی۔ اور دُور دُور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفا اکثر روز سہ پہر کو اُس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جان فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر اُن کا قیام رہا۔ ان تین باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ بھی نواح شہر میں لکھنؤ کے راستہ پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام سوار ہو کے سڑکوں اور مکانوں کو معائنہ کرتے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دکاندار کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبا لی ہے فوراً اُسے کھدوا کے برابر اور سیدھا کرا دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلیٰ سردار نواب مرتضیٰ خان بریچ اور بہت بہادر اور امراؤ گیر نام دو گوشائیں تھے۔ ان کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ اور جتنے چھوٹے چھوٹے جمعدار تھے سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے ان میں سے ہر ایک کی جمعیت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کمبوہ۔ گرجی بیگ خان گوپال راؤ مرہٹہ۔ میر جملہ کے داماد نواب جمال الدین خان۔ مظفر الدولہ تہور جنگ بخشی ابوالبرکات خان ساکن کاکوری۔ اور محمد معز الدین خان لکھنؤ کے ایک شیخزادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے خواجہ سرا اور وہ نوعمر خواجہ سرا جو اُن کے زیر نگرانی تربیت پاتے چیلے اور محلّے گروہ شیہ تھے۔ بسنت علی خان خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈیڑھ ہزار فوج کی چودہ ہزار باقاعدہ فوج تھی جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنتہ

تھا جس کے زیر کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ معنبر علی خان خواجہ سرا کی افسری مین پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی۔ جن کی وردیان سیاہ تھین۔ محبوب علی خان خواجہ سرا کے زیر علم پانسو سوار اور چار پلٹنین تھین۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خان کے ماتحت تھی۔ رگھناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ مین سے ہر ایک کے زیر کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹنین تھین۔ اسی طرح مقبول علی خان اول و دوم اور یوسف علی خان کے ہمراہ پانسو مغل سوار و ن اور پیادون کی جمعیت تھی۔ اور توپخانہ بے حد و بے حساب تھا۔

لہذا کل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضہ مین تھی اور فیض آباد مین موجود رہا کرتی اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی۔ سرخ وردی والے تیس ہزار باقاعدہ اور سیاہ وردی والے چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسر اعلی یعنی سپہ سالار اعظم سید احمد تھے جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے۔ جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقون کے مقابلے مین انگریزی فوج کی بندوقین کوئی وقعت نہ رکھتی تھین۔

اس جمعیت کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار ہرکارے اور مخبر تھے۔ جو ہر ساتوین روز پونا سے اور ہر پندرھوین دن کابل سے خبرین لاتے۔ دربار مین ہمیشہ بلاد دور و دراز کے حکمرانون کے نائب موجود رہا کرتے۔ ایک نائب مرہٹون کا تھا۔ ایک نظام علی خان فرمان روائے دکن کا۔ ایک ضابطہ خان کا۔ اور ایک نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان کا۔ جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی تھے۔ ان لوگون کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیتون کے ساتھ یہان موجود رہتے۔ جیسے میر نعیم خان جن کے جھنڈے کے نیچے ثابت خانی بندیلکھنڈ کا چندیلا اور سیواتی سپاہیون کا ہجوم تھا۔

محمد بشیر خان قلعہ دار تھے شہر کی فصیلون اور پھاٹکون پر اُنھین کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے۔ اور قلعے کے اندر ہی اُن کے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُن کے سپاہیون کی بارکین بنی ہوئی تھین۔ جب بیرونی دیوارون مین بھی جگہ نہ باقی رہی تو سید جمال الدین خان اور گوپال راؤ مرہٹا نے

باہر نکل کے موضع نوراہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کیمپ وہان بنائے- اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نواب مرتضیٰ خان بڑیچ میر احمد بانسی والا- میر ابوالبرکات اور شیخ احسان اجودھیا اور فیض آباد کے دریا کنارے چھوات مین رہتے تھے۔

آدمیون کی کثرت اور سپاہیون کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک مین اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گزرنا دشوار تھا- اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر دھکے ہوئے سیدھا چلا جائے- فیض آباد نہ تھا انسانون کا جنگل تھا- بازار مین دیکھیے ملکون ملکون کا مال ڈھیر تھا- اور یہ خبر سن کے کہ فیض آباد مین نفیس مزاج رئیسون اور شوقین امیرون کا منتخب مجمع ہے ہر طرف سے تاجرون کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے- اور چونکہ چاہے کیسا ہی قیمتی مال ہو ہاتھون ہاتھ بک جاتا اچھی سے اچھی چیزون کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا جب دیکھیے ایرانی- کابلی- چینی- اور فرنگی سوداگر نہایت گران قیمت اور بھاری مال لیے ہوئے موجود رہتے- اور جو جو نفع اٹھاتے ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو و جانفشانی سے نیا مال لے آتے- مسیو ژانتیل مسیو سون سون اور مسیو پیدرو وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسیسی جو یہان اقامت گزین ہو گئے تھے سرکار مین ملازم تھے- اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابط اتحاد رکھتے تھے- جو سپاہیون کو فوجی تعلیم دیتے- اور توپین بندوقین اور دیگر اسلحۂ جنگ اپنے اہتمام مین تیار کراتے۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش جن کی عنایت سے ہمین یہ واقعات معلوم ہوئے ہین خود اس زمانے مین موجود تھے اور انھون نے جو کچھ لکھا ہے اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہین کہ مین جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد مین گیا ہون ممتاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کی مسافت پر ہے مین نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیان گرما گرم کھانا- کباب- سالن- روٹیان- اور پراٹھے وغیرہ بھرے ہین سبیلین رکھی ہوئی ہین- نان خطائیان مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی

بک رہا ہے اور صدہا آدمی خریداری کے لیے اُن دُکانوں پر گرے پڑتے ہین - مجھے خیال گزرا کہ مین شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک مین ہون - مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہین مین اندر کیسے پہونچ گیا ؟ لوگون سے پوچھا تو ایک راہ گیر نے کہا "جناب شہر کا پھاٹک یہان سے چار میل ہے - آپ کس خیال مین ہین ؟"

اُس جواب پر حیرت کرتا ہوا مین شہر مین داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی - رنگینیان تھین اور دلچسپیان - جدھر دیکھتا ہون ناچ ہو رہا ہے - مداری تماشا کر رہے ہین - اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشون مین سرگرم ہین - مین یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا - صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوجون اور پلٹنون کے نقارون کی آواز نہ سنی جاتی ہو - پہرون اور گھڑیون کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالون پر موگریان پڑتین جن کے شور غل سے کان اُڑے جاتے - سڑکون پر دیکھیے تو ہر دم گھوڑون - ہاتھیون - اونٹون - خچرون - شکاری کُتّون گائے بھینسون - بیلون - چھکڑون - اور توپون کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا - جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا - راستہ چلنا دشوار تھا -

ایک عجیب رونق و تمکنت کا شہر نظر آیا جس مین وضعداران دہلی مین سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے - حاذق اطبائے یونانی - اعلی درجے کے مردانے اور زنانے طائفے - ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویّے سرکار مین ملازم تھے - اور بڑی بڑی تنخواہین پا کے عیش و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے - ادنی و اعلی سب کی جیبین روپون اشرفیون سے بھری ہوئی تھین - اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہان کبھی کسی نے افلاس و احتیاج کو خواب مین بھی نہین دیکھا ہے - نواب وزیر (نواب شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی و رونق اور رعایا کی مرفہ الحالی مین ہمہ تن مصروف تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز مین فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوی کرے گا -

چونکہ کسی سلطنت اور کسی شہر کا رئیس اُس نفاست اور شان و شکوہ سے نہین

رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے - اور اُس کے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ کہیں کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام مین اور ہر موقع و محل پر دولت صرف کرنے کو نہیں تیار ہو جاتے تھے۔ اسی لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلی دستکارون صناعون اور طالب علمون نے وطنون کو خیر باد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا - اور یہان ہر زمانے مین ڈھاکے - بنگالے - گجرات - مالوہ - حیدر آباد - شاہجہان آباد - لاہور - پشاور - کابل - کشمیر - اور ملتان وغیرہ کے طالب علمون کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علما کی درس گاہون مین تعلیم پاتے۔ اور اُس چشمۂ علم سے جو فیض آباد مین جاری تھا سیراب ہو ہو کے اپنے گھرون کو واپس جاتے - کاش نواب وزیر اور دس بارہ برس جی جاتے تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا - اور دنیا ایک نئی زندہ دلی کی صورت دیکھ لیتی۔

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا - اور ان نو سال مین بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر مین رونق افروز رہتے - باقی زمانہ اپنی قلمرو کے دورے اور سیر و شکار مین صرف ہوتا تھا - شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبین عورتون کی اور رقص و سرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتون اور ناچنے والے طائفون کی شہر مین اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اُن سے خالی نہ تھا - اور نواب کے انعام و اکرام سے وہ اس قدر خوش حال اور دولتمند تھین کہ اکثر رنڈیان ڈیرہ دار تھین جن کے ساتھ دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے - اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر مین ہوتے تو نوابی خیمون کے ساتھ ساتھ اُن کے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑون پر لد لدکے روانہ ہوتے اور اُن کے گرد دس بارہ بارہ تلنگون کا پہرہ رہتا - اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سردارون نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کر لی - اور سفر مین سب کے ساتھ رنڈیان رہنے لگین - اگرچہ اس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی لیکن اس مین شک نہین کہ ان

شاہدان بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد دلھن بن گیا تھا۔

سنہ ۱۷۷۳ء مین شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر مین شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوے پہونچے جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے مین اُسے اُن سے چھین کے اپنے قبضے مین کیا اور احمد خان بنگش کی قلمرو مین داخل ہو کے کوٹریا گنج اور کاس گنج مین خیمہ زن ہوے۔ یہان سے اُنھون نے حافظ رحمت خان فرمان روا سے بریلی کو لکھا "گزشتہ سال مین نے ایک کروڑ روپیے مہاجی سیندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دوآب ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے مین نے آپ کا وہ علاقہ اُس کے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا لہذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے مین نے ادا کی تھی فوراً ادا کیجیے" حافظ رحمت خان نے اپنے تمام افغان سردارون اور بھائی بندون کو جمع کر کے کہا "شجاع الدولہ لڑائی کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے ہین۔ مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کر دی جاے۔ بیس لاکھ مین اپنے پاس سے دیتا ہون اور مابقی تیس لاکھ تم جمع کر دو" نا عاقبت اندیش پٹھان سردارون نے جواب دیا "شجاع الدولہ کے سپاہی دیکھے ہی کے ہین وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کر سکین گے۔ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے تو اُن کی توپون پر جس وقت ہم تلوارین سوت سوت کے جا پڑین گے سب کے حواس جاتے رہین گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہین" حافظ رحمت خان نے یہ سُن کے کہا "تمھین اختیار ہے۔ مگر مین ابھی سے کہے رکھتا ہون کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو مین میدان سے زندہ نہ آؤن گا۔ اور اُس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تمھین کو بھگتنا پڑے گا"

بہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا۔ فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی کا وہی انجام ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خان کی زبان سے پہلے ہی سُنوا دیا تھا۔ حافظ صاحب شہید ہوے۔

اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر یہ فتح شجاع الدولہ بہادر کو بھی سزاوار
نہ ہوئی۔ ۱۳ صفر ۱۱۸۸ھ (سنہ ۱۷۷۴ء) کو لڑائی ہوئی تھی۔ ۱۱ شعبان کو
شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کرکے لکھنؤ آئے۔ ماہ مبارک رمضان لکھنؤ مین
بسر کیا۔ ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کرکے ۱۴ کو فیض آباد مین داخل ہوئے
اور فتح کو مہینے دس ہی دن ہوئے تھے۔ اور گھر مین پورے ڈیڑھ مہینے
بھی آرام کرنے کا موقع نہین ملا تھا کہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (سنہ ۱۷۷۵ء)
رہگزاے عالم جاودان ہوئے۔ اور افسوس اُن کی وفات ہی کے ساتھ
فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

اس وقت حکومت اودھ مین سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی
بی بی بہو بیگم صاحبہ کا تھا۔ جو نہایت ہی دولت مند بھی سمجھی جاتی تھین۔ اُن کی منظوری
سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوے۔ مگر اُن کی اخلاقی حالت نہایت
خراب تھی۔ اور مصاحبون کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹون کو الگ رکھین۔
چند روز تک سیر و شکار مین مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے
لکھنؤ مین قیام اختیار کر لیا۔ جو یہین سے بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے۔ اور بار
بار اُن سے روپیہ طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی
بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی مین بھی نواب آصف الدولہ کی
نالائقیون نے بہو بیگم صاحبہ کے اطمینان مین اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے
امن و امان مین خلل ڈالا۔ مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے
اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے اُن کی وفات پر
فیض آباد کی تاریخ ختم ہو گئی۔ اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم
آیندہ لکھین گے۔

مغرور جوتا

مین اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے کو اُتار رہا تھا کہ اُس نے اور دانت نکال دیئے۔ اور

مین ایسا جھنجھلایا کہ اُسے نوچ کے پھینک دیا - میری یہ متکبرانہ برہمی اُسکو ناگوار سی گزری اور زبان حال سے بولا "میرا قصور؟" مین نے بے پروائی سے کہا "ع نفش چون وندان نماید مے کنند انہ پائے دور" اُس نے کہا "خیر آپ کو میری ضرورت نہین رہی ہے تو نکال دیجئے مگر یون ذلیل کر کے تو نہ نکالیئے!" اُس کے اس غرور پر مجھے ہنسی آگئی - اور کہا "کیا دنیا مین تجھ سے بھی زیادہ ذلیل کوئی چیز ہے؟ تو انسان کے اسفل ترین حصۂ جسم سے وابستہ ہے - ہر وقت پاؤن سے کچلا اور روندا جاتا ہے - اور ہمیشہ راستہ کی نجاستون مین آلودہ ہوتا رہتا ہے - تہذیب کی صحبتون مین تیرا گزر نہین ہو سکتا - صفائی کی محفلون مین تو گھُسنے نہین پاتا - ہم جب کبھی کسی احسان فراموش کو دیکھ کے کہتے ہین کہ یہ ہماری ہی جوتیون کا صدقہ ہے اس وقت تجھے انتہا درجے کی ذلت سے دیکھتے ہین - اور ہماری محبوبۂ مہ جبین نے کل جو اپنی زلف برہم کی طرح پیچ و تاب کھا کے "میری جوتی کی نوک سے" کہا تھا تو اُس نے تجھے حد سے زیادہ حقیر خیال کیا تھا - تو یہ بھی نہین دیکھتا کہ جسے کمال درجہ ذلیل کرنا ہوتا ہے اُسے تیری مار ماری جاتی ہے؟ اور تیری ایک بے نتیجہ چوٹ بھی اپنے تیر و سنان اور شمشیر و خنجر کے ہزار جان ستان زخمون سے زیادہ ناگوار گزرتی ہے؟ یہ سب کیون؟ اس لیے کہ تو نہایت ہی حقیر اور حد سے زیادہ ذلیل ہے - لیکن باوجود ان سب باتون کے تجھے بیحیائی سے اپنی عزت کا خیال ہے؟"

مین سمجھتا تھا کہ یہ باتین اس سرکش جوتے کو خاموش کر دین گی مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا اور بولا "یون تو آپ کو اختیار ہے کہ اپنے نزدیک جسے چاہین معزز خیال کر لین اور جسے چاہین ذلیل کرین - لیکن خدائی فیصلہ آپ کی تجویز اور مرضی سے نہین ہو سکتا - خدا نے ہر شخص اور ہر چیز کو اپنے مقام پر ایک فضیلت اور خصوصیت عطا کی ہے جس پر وہ جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے - لیکن اُس پر آپ کی طرح کسی کو اترانا نہ چاہیے - مجھ مین اگر کوئی ذلت کی بات ہے تو وہ آپ کی بدولت ہے - آپ اپنے گھر مین مجھے ذلیل سمجھا کرین -

لیکن میں اپنی جگہ پر غور کرتا ہون تو اپنے مین کوئی ذلت و حقارت کی بات نہیں پاتا۔ مین جس چیز سے بنا ہون اُسی سے آپ کا جسم بنا ہے۔ یہی زندگی یہی نرمی۔ یہی حس۔ اور یہی خوبی جو آپ کی کھال مین ہے کبھی مجھ مین بھی تھی۔ یہی غذائین جو روز آپ کا جزو بدن ہوا کرتی ہین کبھی میرا جزو بھی ہوا کرتی تھین۔ مرنے کے بعد میری حالت آپ سے اچھی ہی رہی۔ مین تو سڑنے گلنے سے بچ کے آپ کے پاؤن کا لباس بن گیا۔ آپ کی کھال مین اگر نفع رسانی خلق کا کوئی مادہ تا ید ہو بھی تو اس مستعار زندگی ہی تک ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے جسم کے کسی حصہ کو خلق اللہ کی خدمت کا کوئی موقع ملے اس کی ہرگز امید نہین۔ ممکن تھا کہ مین ایک پُر تکلف ٹوپی کا استر بن کے آپ کے سر پر جا پہونچتا۔ ممکن تھا کہ مین پوستین کی صورت مین نمودار ہو کے آپ کے جسم سے لپٹ جاتا۔ ممکن تھا کہ مین ایک پیٹی بنتا اور آپ کی کمر مین بندھا رہتا۔ اور ممکن تھا کہ مین کوئی اور ایسی خوبصورت چیز بن جاتا جسے آپ نہایت عزیز رکھتے"

جوتے کی ان واعظانہ باتون سے مین دل مین کانپ گیا مگر یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ ایک ایسی ذلیل شے سے قائل ہو جاؤن۔ جواب دیا "ان صورتون مین سے جو صورت ہوتی ویسی ہی تمھاری قدر و منزلت بھی کی جاتی۔ مگر اب تو تم ایک جوتے ہو اور ٹوٹے ہوے جوتے! ایسی حالت مین عزت کا نام لیتے تمھین شرم نہین آتی ہے" مگر وہ جوتا بھی کچھ ایسا جھنجھلایا ہوا تھا کہ کسی طرح جان نہ چھوڑی اور کہا "مین تو جوتا ہونے مین بھی اپنی توہین و تذلیل کی کوئی وجہ نہین پاتا۔ جوتا ہونے سے کیا کوئی ذلیل ہو جاتا ہے؟ اگر مین آپ کے بادشاہ یا کسی معمولی حاکم ہی کا جوتا ہوتا تو آپ زمین پر سر رکھ کے مجھے چومتے۔ اگر مین آپ کے مرشد یا کسی ولی اللہ کا جوتا ہوتا تو آپ مجھے باوجود شکستگی کے آنکھون سے لگاتے۔ اگر مین آپ کے اُستاد یا کسی دوسرے بزرگ کا جوتا ہوتا تو آپ اپنی سعادتمندی تصور کر کے مجھے سیدھا کر لیتے۔ اور بالفرض اگر مین اُسی معشوقہ کی جوتیان ہوتا جس کے "میری جوتی کی نوک سے" کہتے مین آپ کو میری حقارت نظر آئی تو آپ میری مار کو بڑے شوق اور مزے سے کھاتے۔ اب آپ ہی

فرمائیے کہ جوتا ہونے سے میری کیا آبرو گھٹ گئی؟ ہاں اس بات کو مین البتہ مان لون گا کہ آپ کے ایسے ناحق شناس انسان کی پاپوش بننے سے میری عزت جاتی رہی - اور مجھ مین ذلت و حقارت جو کچھ ہے آپ سے ملنے آپ کے پاس آنے اور آپ کی صحبت مین رہنے کی وجہ سے ہے"

اب گفتگو نے ایسی صورت اختیار کرلی تھی کہ اپنی کمزوری ظاہر ہوتا دیکھنا مجھے یہ نظر آرہا تھا کہ میرا ہی جوتا مجھے کمال بے باکی سے ذلیل کر رہا ہے - برہمی کے ساتھ کہا "تیری حقارت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جب مقدس دربار الٰہی مین پہونچے تو حکم ہوا کہ "فاخلع نعلیک" (اپنی جوتیان اُتار ڈالو) جوتے نے کہا "بے شک اس مقام پر جناب موسیٰ کو جوتیان اُتارنا پڑین - مگر جس منزل تک وہ جوتیان پہنے چلے گئے اور جہان تک میرا اُن کا ساتھ رہا وہان تک آپ تو کیا مین بڑے بڑے آئمہ دین کی بھی رسائی نہین ہو سکتی - ذات وحدت کی قربت مین ضرورت تھی کہ حضرت موسیٰ دنیا کی تمام نمائشون سے معری ہوجائین - جوتیان تو جوتیان وہان تو انھین سارے کپڑے اُتار ڈالنا چاہیے تھے - اس مین اول تو میری ذلت نہین ہوئی اور جو ہوئی بھی تو آپ کے مقابلے مین نہین - آپ سے افضل ہی ہون"

آخر مین نے تنگ آکے پوچھا "کیا تو سچ مچ اپنے آپ کو مجھ سے افضل و اعلیٰ سمجھتا ہے یا یہ فقط تیری سخن پروری ہے؟" اُس نے کہا "سخن پروری اور ضد انسان کے صفات ہین - اور انسان کے سوا ساری مخلوقات مشرکانہ صفات سے مبرا ہے - رہا اپنی بڑائی اور فضیلت کا خیال - تو وہ نفس پرستی کا تقاضا ہے - اور خدا نے مجھے اس مرض سے محفوظ رکھا ہے اپنے مخلوقیت کے فرائض ادا کرنے کی دُھن مین کبھی مجھے اس مسئلہ پر غور کرنے کی فرصت ہی نہین ملی - مین کیا جانون کہ آپ افضل ہین یا مین؟ ہان ایک بات البتہ خیال مین آتی ہے - مگر آپ شاید اسے مانین یا نہ مانین؟" مین نے گھبرا کے پوچھا "وہ کون سی بات ہے؟" جواب ملا کہ "اپنے فرائض زندگی کو جو شخص جتنی زیادہ عمدگی و مستعدی سے بجا لائے اُسی قدر اُسے افضل

ہونا چاہیے۔" مین نے کہا "بے شک!" میری زبان سے بے شک کا لفظ سنتے ہی
وہ ایک جوش مسرت کے ساتھ بولا اچھا "تو پھر مین۔ آپ سے افضل ہون
مین سچ کہتا ہون کہ اپنے فرائض ادا کرنے مین کبھی مین نے کوتاہی نہین کی۔
مین آپ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور دربار الٰہی سے آپ کے یہان میرا تقرر ہوا تھا۔
آپ نے جب اور جو کام لینا چاہا مین نے عذر نہین کیا۔ آپ برے کامون کے
لیے گئے۔ سیہ کاریون مین مبتلا ہونے کے لیے گھر سے نکلے۔ ایذا رسانی اور مخلوق کو
آزار پہونچانے کے لیے روانہ ہوے اور ہمیشہ مجھے پہن کے گئے۔ میری طرف سے آپ کی
فرمان برداری مین ذرا بھی کمی ہوئی ہو تو فرمایئے؟ آپ مجھے پہنے ہوے نجاستون
مین چلے گئے۔ کانٹون اور پتھرون مین گھس گئے۔ مجھے ان باتون سے تکلیف ہوئی
مگر مین نے اطاعت سے منہ نہ موڑا۔ آپ کی رفاقت مین مجھے حد درجے کی بے نفسی سے
کام لینا پڑا۔ نیکی اور بدی کی طرف سے اپنے آپ کو بالکل بے حس کر لینا پڑا۔
غرض مین نے ہر طرح کی مصیبتین جھیلین مگر آپ کی نافرمانی نہین کی۔ اب اس کے
مقابلے مین آپ اس کا ثبوت دین کہ آپ بھی اپنے فرائض زندگی کو بے عذر و
بے تامل ادا کرتے رہے۔ اور کبھی آپ سے ان مقاصد زندگی کے بجا لانے مین
قصور نہین ہوا۔ اگر آپ اسے ثابت کر لے جائین تو گو کہ اس سے صرف میری
آپ کی مساوات ثابت ہوگی مگر مین آپ کو اپنے سے افضل مان لون گا۔ ورنہ
بندہ نواز قصور معاف آپ ہزار بڑھ بڑھ کے باتین بنائین مین آپ سے
اچھا ہون!"

اب مین کلیۃً لاجواب تھا خصوصاً اس لیے کہ اُس کے یاد دلانے سے
زندگی بھر کے گناہ اور قصور میری آنکھون کے سامنے پھر رہے تھے کمال
بے اختیاری سے قبول کر لینا پڑا کہ "مین ہارا اور تم جیتے۔ واقعی تم مجھ سے
ہزار درجے بہتر ہو۔ اور مین نے جو تمھاری تحقیر کی اُسے معاف کرو!"

ریویو

اردو۔ لاہور سے اردو زبان کا یہ ایک نیا لٹریری رسالہ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء سے

شایع ہونا شروع ہوا ہے جس کے مالک و ایڈیٹر مولوی فتح محمد خان صاحب جالندھری ہین جنھون نے اپنے تصانیف صرف و نحو اردو کے ذریعے سے زبان اردو پر اپنے حقوق پیدا کر لیے ہین۔ اور جن کی ذات سے امید ہے کہ تہذیب و ترقی اردو کا سلسلہ خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھ سکین گے۔ اس کے پہلے دو نمبر جو ہماری نظر سے گذرے قابل قدر ہین۔ اور اردو کے شایقین کے لیے اچھا ذخیرہ رکھتے ہین۔ لکھائی۔ چھپائی۔ اور کاغذ قابل اطمینان ہین۔ سائز ۱۸ × ۲۲ ہے۔ اور سالانہ قیمت مع محصول ڈاک تین روپیہ ہے۔ جن حضرات کو زبان اردو کی تحقیق و تدقیق کا شوق ہو اس رسالے کی ضرور قدر فرمائین۔ اور جناب ایڈیٹر صاحب موصوف کی خدمت مین لاہور کے پتہ پر مراسلت کر کے طلب۔ فرمائین۔

ظریف یہ بھی ایک نیا اردو رسالہ ہے جس کو "زندہ دل احباب کا رسالہ" ہونے کا دعوی ہے۔ اور دسمبر ۱۹۱۳ء سے لاہور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ ایڈیٹر پیرزادہ عبد الرشید صاحب ہین۔ اگر یہ رسالہ اپنے مذاقیہ لٹریچر کو اچھی طرح سنبھال کے نباہ لے گیا تو عام پسند ثابت ہوگا۔ لیکن یہ نہایت ہی مشکل کام ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ زبان جتنی عام ہوتی ہے اُتنی عام ظرافت نہین ہوتی۔ ہر مقام اور ہر سوسائٹی کی ظرافت اپنی خصوصیتون کے لحاظ سے جدا ہوتی ہے۔ ظرافت کی بنیاد جن واقعون محاورون اور خیالون پر ہوتی ہے وہ اُس قدر عام نہین ہو سکتے جتنی کہ عام زبان ہوتی ہے۔ اور ایسے لطیفے اور مضامین ظرافت جو تمام لوگون کو یکسان لطف دے جائین دشواری سے ہاتھ آسکتے ہین۔ پہلے نمبر کی ضخامت ۱۸ × ۲۲ پیمانے کے ۳۲ صفحون کی ہے۔ قیمت عام شایقین سے ایک روپیہ بارہ آنے طلبہ سے دو آنے کم۔ نمونے کے لیے ۲؍ کے خریداری کے لیے پیرزادہ عبد الرشید صاحب سے وکٹوریہ ہال لاہور کے پتہ پر مراسلت کی جانے۔

انتخاب توحید۔ ۱۸ × ۲۲ پیمانے کے ۱۴۴ صفحون کا رسالہ ہے جس مین مرحوم اخبار توحید میرٹھ کے بہت سے منتخب مضامین جمع کر دیے گئے ہین۔ پہلے حصے مین جو

۱۱۰ صفحات پر ختم ہوا ہے مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کے مضامین ہیں۔ اور دوسرے حصے میں جو ۶۴ یا ۶۵ صفحات پر ہے دیگر انشا پردازون کے مضامین ہیں۔ مضامین موثر۔ شوخ۔ انوکھے۔ دلچسپ۔ اور جدت کوٹی ہوئی یہ چیزیں ہیں کہ ہمارے محترم دوست خواجہ صاحب کا خاص جوہر ہیں۔ چھپائی نہایت واضح اور صاف ہے اور کاغذ اُجلا اور روشن قیمت فی جلد ایک روپیہ۔ شایقین منشی محمد انور صاحب ہاشمی منیجر اخبار "توحید" سے "لال کورتی۔ میرٹھ" کے پتہ پر لکھ کے طلب فرمائیں۔

ہیر ورانجھا۔ یہ پنجاب کی مشہور "لیلیٰ مجنون" کا دلچسپ اور عام پسند قصہ ہے جسے منشی مولا بخش صاحب کشتہ نے نئے لطف کے ساتھ پنجابی نظم میں تحریر فرمایا ہے ہمارے اکثر پنجابی احباب نے اسے پسند فرمایا۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ زندہ دلان پنجاب بہت پسند فرمائیں گے۔ قیمت فی جلد ۱۲ار مصنف صاحب سے "اورنٹ سمر ڈھاب کھٹیکان۔ کوچہ ڈاکٹر جھنڈے خان" کے پتہ پر خط لکھ کے منگوایا جائے۔

دربار حرام پور کے اسرار

ناول "محسن کا ڈاکو" کی نسبت بعض حلقون میں مشہور ہے کہ اس کو کسی خاص ریاست یا رئیس سے تعلق ہے۔ واقعات میں تو اردو توافق ہو جانا اور بات ہے مگر ہمارا روی سخن کسی کی طرف نہیں۔ ہماری غرض عام والیان ملک و رؤسا کی تنبیہ و اصلاح ہے نہ کسی خاص نواب صاحب کی۔ لیکن لوگون نے اس ناول اور اس کے عنوان کو اس قدر پسند کیا کہ ہمارا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب ہمارے دوستون کا بہت جی چاہتا ہے کہ یہ مشغلہ ختم نہ ہو۔ لہذا اس قسم کے ناولون کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے جس کا نام ہم نے "دربار حرام پور کے اسرار" قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک نہ ایک حصہ ہر دوسرے تیسرے مہینے شایع ہو جایا کرے گا جو نہایت دلچسپ و پُر لطف اور مقبول عام ہو گا۔ اور امید ہے کہ اس کا مجموعہ ایک مشرقی نواب کی مکمل اور عبرت خیز زندگی کی تصویر بن کے دنیا کی لائبریری میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے گا۔

ایڈیٹر دلگداز۔

کتب خانہ مہذب بک ایجنسی لکھنؤ

حکیم محمد علیخان صاحب ایڈیٹر مرقع عالم کی تصانیف — قیمت

عبرت - جان و بہنوریا کا دلچسپ تاریخی قصہ عقد پر محققانہ بحث تین حصون مین مجموعی قیمت ۱۲ر

جعفر عباسہ - اس مین عورتون کی پردہ نہ کرنیکے نقصانات بہت کامیابی کے ساتھ دکھائے گئی ہین۔ ۱۲ر

اختر حسینہ - عورتون کو تعلیم کہان تک دینا چاہیے اور نابالغہ سندہی کی شادی کے کیسے برے نتائج ہوتے ہین دو حصون مین عار

نیل کا سانپ - کلیوپٹرا اور انطونی کی حسرت بھری داستان بالکل تاریخی واقعہ - عہ ر

گورا - رنڈاپے کے ہاتھون شریف خاندانون کی بربادی و عقد بیوگان پر دلائل مذہب و شرع شریف کی طرف سے عقد بیوگان پر دلائل عار

حسن سرور - دلچسپ اور بخیل دل تڑپا دینے والا سچا اور نیا ناول تین حصون مین ۱۲ر

دیول دیوی - علاء الدین خلجی کے عہد کا ایک دلچسپ واقعہ قابل دید - عہ ر

اہرام مصری کب اور کس نے اسکو تعمیر کیا ۲ر

تقدیر - تقدیر اور تدبیر پر ایک محققانہ بحث ۲ر

مسیحائے عالم حفظ صحت کی ایک بہت کارآمد مفید کتاب ۸ر

مضامین مرقع عالم سنہ ۱۹۰۶ء لغایۃ سنہ ۱۹۱۰ء فی جلد ۱ر

دوسری دلچسپ کتابین — قیمت

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
جنگ روس و جاپان	عکر	نشہ جوانی	۸ر
مرقع طرابلس	۱۰ر	بہشت برین	۱۲ر
عروج و زوال	۶ر	حیات شیخ چلی	۸ر
شہنشاہ عیاران	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر
نشتر	عہ ر	ترچھی نظر	۱۲ر
ارمان	عہ	مالن کی بیٹی	۸ر
محبوبہ لندن	عار	ایران کی شہزادی	۸ر
اندرا	۱۲ر	حاجی بغلول	عہ ر
پُر ارمان لڑکی	عار	محبت کی تیلی	عہ
میٹھی چھری	عہ ر	کرشمہ اُلفت	۸ر
احمق الذین	۱۲ر	خون تمنا	عار
پرستان کی پری	عہ ر	کرشمہ محبت	۱۲ر
رزم و بزم	للعہ	دبدبہ امیری	عار
امراؤ جان	۱۲ر	کہکشان	۱۰ر
کشتہ ناز کامل	عار	ثمرہ دیانت	۶ر
بروگ	عہ ر	حسرت دید	۱۰ر
پیاری دنیا	۱۲ر	سرود رائن	۱۲ر
سبد الخیری شہنشاہ بابر	۱۲ر	نرالا عاشق	۱ر

ان مذکورہ بالا کتابون کے علاوہ دوسری کتابین بھی بکفایت روانہ ہوسکتی ہین۔

تمام تصانیف مولانا شرر اور مطبع دلگداز کی دوسری کتابین

تصنیفات مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

تاریخ و سیر وغیرہ

(۱) ابوبکر شبلی حضرت شیخ شبلی کے حالات ۔ عہ
(۲) تاریخ سندھ سندھ کی مکمل تاریخ دو جلد
قیمت جلد اول عہ ۔ جلد دوم ۔۔۔۔۔۔ عہ
(۳) حروب صلیبیہ مصنفہ سطر کاکس کا ترجمہ و نوٹس عگ
(۴) ملکہ زنوبیہ ایک عربی نژاد ملکہ ۔۔ ۱۲
(۵) خواجہ معین الدین چشتی ۔۔۔ ۱۶
(۶) الحکم الرفاعیہ مصنفہ شیخ احمد رفاعی کا ترجمہ ۔۔
(۷) آغائی او صاحب رئیس لکھنؤ مرحوم کے حالات عہ
(۸) سکینہ بنت حسین جناب سکینہ کے حالات ۶
(۹) سرسید کی دینی برکتین ۔۔۔۔۔۔ ۲

ناول

(۱۰) حسن کا ڈاکو سب سے نیا اخلاقی ناول حصہ اول ۱۲
حصہ دوم ۔۔۔۔۔۔ ۱۲
(۱۱) زوال بغداد شیعہ اور سنیون کا جھگڑا اور نسل عباسیہ کا استیصال ۔۔۔۔۔۔ عہ
(۱۲) عجیب دلہن پاکدامنی اور عفیفہ اور قابل ملکہ پرکتین اسکی حیرت انگیز غیب دانی ۔ عہ
(۱۳) ماہ ملک ۔ مولانا کا نیا اور اچھوتا ناول ۔ عگ
(۱۴) یوسف نجم کامل ۔ جگ بیتی نہین آپ بیتی عہ
(۱۵) شوقین ملکہ پہلی اور دوسری صلیبی لڑائیان ۔ عہ
(۱۶) فتح اندلس ۔ اسپین پر عربون کا حملہ ۔ عگ
(۱۷) مقدس نازنین ایک لڑکی کا پوپ بن جانا ۔ عہ
(۱۸) ملک العزیز ورجنا تیسری صلیبی لڑائی ۔ عہ
(۱۹) فردوس برین ۔ جیتے جی جنت کی سیر ۔ عہ
(۲۰) حسن انجلینا روم و روس کی لڑائی ۔ عہ
(۲۱) منصور موہنا ۔ ایک عربی خاندان سندھ مین ۔۔۔۔۔۔ عہ
(۲۲) شہید وفا ۔ اسپین مین مسلمانون کی پامالی ۔ عہ

جلد ہاے دلگداز

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۳ء عہ جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۷ء عہ
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۴ء عہ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۰ء عہ
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۵ء عہ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۱ء عہ
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۶ء عہ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۲ء عہ

دیگر اعلی مطبوعات دلگداز پریس

معاشرت ایک اعلی درجے کی اخلاقی کتاب انگریزی کی گلستان سرجان لبک کی یوزآف لائف کا ترجمہ عگ
اتالیق بی بی ۔ میان بی بی کے افعال پر بی بی کی مزیدار نکتہ چینیان ۔۔۔۔۔۔ ۱۲
رفع النقاب مروجہ پردے کے خلاف ایک مدلل رسالہ ۔۔۔۔۔۔ ۴

المشتہر حکیم محمد سراج الحق منیجر دلگداز کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

نمبر ۲ — جلد ۱۶

فروری سنہ ۱۹۱۴ عیسوی - مطابق حوت سنہ ۱۳۴۲ محمدی

ایڈیٹر

مولنا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹڑہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

(لکھنؤ)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی ؟ اس کا بانی کون تھا ؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے ؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کے جو کچھ بتایا جا سکتا ہے یہ ہے۔

کہتے ہیں راجہ رام چندر جی لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب سریر جہان پناہی پر جلوہ افروز ہوئے تو یہ سرزمین اُنھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہم سفر و ہمدرد بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ اُنھیں کے قیام یا ورود سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہو گئی جس کا نام اُسی وقت سے "لچھمن پور" قرار پایا۔ اور وہ ٹیکرا "لچھمن ٹیلا" مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت ہی گہرا غار یا کنواں تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی۔ اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ[عہ] تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی۔ اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جا کے اُس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ جودھشٹر کے پوتے راجہ جنم جے نے یہ علاقہ مرتاض

عہ ہندو دیومالا میں سیس ناگ اُس ہزار سروں والے سانپ کا نام ہے جو دھرتی (زمین) کو اپنے پھن پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمت الٰہی کا ایک واجب الاحترام ظہور ہے۔

بزرگون - رشیون اور منیون کو جاگیر مین دے دیا تھا جنھون نے یہان جابجا
اپنے آشرم بنائے اور ہر کے دھیان مین مصروف ہو گئے - ایک مدت کے بعد
اُن کو کمزور دیکھ کے دو نئی قومین ہمالیہ کی ترائی سے آ کے اِس ملک پر قابض ہوئین
جو باہم ملتی جلتی اور ایک ہی نسل کی دو شاخین معلوم ہوتی تھین - ایک "بھر"
اور دوسری "پاسی"

انھین لوگون سے سید سالار مسعود غازی سے ۴۵۹ھ محمدی (۱۰۳۰ء) مین
مقابلہ ہوا - اور غالباً انھین پہ بختیار خلجی نے ۶۱۳ھ محمدی (۱۲۰۱ء) مین چڑھائی کی تھی
لہٰذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آ کے آباد ہوئے وہ انھین دونون حملہ
آورون خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والون مین سے تھے -

بھر اور پاسیون کے علاوہ برہمن اور کائستھ بھی یہان پہلے سے موجود تھے
ان سب لوگون نے مل کے یہان ایک چھوٹا سا شہر بنا لیا - اور اُن دامان سے رہنے
لگے - لیکن یہ نہین کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام "لچھمن پور" سے بدل کے "لکھنؤ" کب
ہو گیا - اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہین چلتا - لیکن اس سے
انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانون کی کافی آبادی بہت پہلے سے موجود تھی -
جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتون مین
موجود ہے کہ ۹۴۹ھ محمدی (۱۵۴۰ء) مین جب ہمایون بادشاہ کو شیرشاہ کے
مقابل جونپور مین شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور لکھنؤ ہی کی سمت
ہوتا ہوا بھاگا تھا - لکھنؤ مین اُس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا - اور گو کہ شکست
کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگون نے محض
ہمدردی انسانی اور مہمان نوازی کے خیال سے اُن چند گھنٹون ہی مین دس ہزار روپیہ
اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے - اتنے تھوڑے زمانے مین اس سامان کے
فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن دنون یہان معتدبہ آبادی موجود تھی -
اور اُن دنون کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق و خوش حال تھا -
اُسی قدیم زمانے کے آنے والون مین شاہ مینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزار پُر انوار
آج تک مرجع انام ہے - اور غالباً اُسی عہد کے آنے والون مین شاہ پیر محمد بھی تھے

جنھون نے خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی - اور وہین پیوند زمین ہوئے -
اُن کے قیام کی وجہ سے وہ پرانا ٹیکرا لچھمن ٹیلے سے "شاہ پیر محمد کا ٹیلا" ہو گیا - اور مرور
ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا - اُس پر بعد کے زمانے مین شہنشاہ اورنگ زیب
عالمگیر نے جو بہ نفس نفیس یہان آیا تھا ایک عمدہ مضبوط خوبصورت اور شاندار
مسجد بنا کے کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے صدائے اللہ اکبر
بلند کر رہی ہے -

سنہ ۱۰ محمدی (سنہ ۹۹۱ ہجری) مین شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ
صوبون مین تقسیم کیا تو صوبۂ اودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر باری النظرین
لکھنؤ ہی قرار پایا تھا - اُن دنون اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک
خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ تلاش معاش مین دہلی پہونچے - وہان امرائے
دربار مین رسوخ پیدا کر کے بارگاہ شہنشاہی مین باریاب ہوئے آخر منصبداران
شاہی مین شامل ہو کے لکھنؤ مین جاگیر پائی - اور چند روز بعد بڑے تزک و
احتشام اور کر و فر سے اپنی جاگیر مین آ کے مقیم ہوئے - یہان خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ
پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے اُنھون نے پنج محلا بنوایا - شیخن دروازہ تعمیر کرایا - اور
لکھنؤ ہی مین پیوند زمین ہوئے - اُن کا مقبرہ "نادان محل" کے نام سے آج تک
مشہور ہے جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر کے
اپنی زیر حمایت لے لیا ہے -

اسی زمانے مین یہان شیخ عبدالرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر
ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیون سے زیادہ مضبوط تھا -
اور گرد و نواح کے لوگون پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا - یا تو اس لیے کہ شیخ
عبدالرحیم کو دربار شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا یا اس لیے کہ اس
قلعہ کے ایک مکان مین چھبیس محرابین تھین اور ہر محراب پر معمار نے دو مچھلیان
بنا کے باون مچھلیان بنا دی تھین اس قلعہ کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا -
"بھون" کا لفظ یا تو قلعہ کے معنون مین ہے یا "باون" سے بگڑ کے بن گیا ہے -
جس معمار نے اس قلعہ کو تعمیر کیا وہ لکھنا نام ایک اہیر تھا - اور کہتے ہین کہ اُسی کے

نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہوگیا - اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا ہے - ان مین سے جو بات ہو مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبد الرحیم کے آنے کے بعد پایا چندروز بعد شیخ عبد الرحیم کے خاندان والون یعنی شیخزادون کے علاوہ یہان پٹھانون کا ایک گروہ آگیا - جو جنوب کی طرف بسے اور "رام نگر کے پٹھان" مشہور ہوئے اُنھون نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہان اب گول دروازہ واقع ہے - کیونکہ وہان سے دریا کی طرف بڑھیے تو شیخزادون کی زمین شروع ہوجاتی تھی - اِن پٹھانون کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آکے مشرق کی طرف بس گیا جو "شیوخ بنہرہ" کہلاتے ہین - اُن لوگون کی زمین وہان پر تھی جہان اب رزیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہین -

یہ تینون گروہ اپنے اپنے علاقون پر متصرف اور اپنے حلقون کے حاکم تھے - لیکن شیخزادون کا اثر سب پر غالب تھا - اور قرب وجوار پر اُن کا دباؤ پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی مین رسوخ رکھتے تھے - اُن مین سے کئی شخص پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے - اور اُن کے قلعہ مچھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا جس کا مچھی بھون اُس کا لکھنؤ

اکبر ہی کے زمانے مین لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا - اور اُس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی - یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ اُنھین شیخزادون مین سے منتخب ہوئے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے - جو سالون سال اپنے گھر بیٹھے رہتے - فقط تحصیل وصول کے زمانے مین ایک دورہ سا کرتے اور اُن کے نائب یہان رہا کرتے - لہذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نکی جاسکتی تھی - ہان یہان کے دو ایک شیخزادے جو صوبہ دار مقرر ہوگئے تو اُن کے تقرر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہونچا -

لیکن اکبر کو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی - چنانچہ اُس نے یہان کے برہمنون کو باجپئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمائے تھے - اور اُسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوئے - اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت مین موجود تھے

باجپئی ٹولہ، کمارتی ٹولہ، سوندھی ٹولہ، بنجاری ٹولہ، اور اہیری ٹولہ ہیں اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نور الدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے باپ کی زندگی اور اپنے ایام ولی عہدی میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو مچھی بھون سے مغرب طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبہ دار جواہر خان تھے۔ وہ تو دہلی ہی میں رہے مگر اُن کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اُس سے ملی ہوے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے اور اُن کے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری میں جبکہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلّے آباد ہو رہے تھے لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہونچا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور دربار شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لیے سند مستامنی [عہ] حاصل کر کے یہاں اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اُس کا کام اس قدر چلا کہ چوک کے متصل چار عالیشان مکان تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اُس نے پروانۂ مستامنی کی تجدید چاہی تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اس پر بھی اُس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شہنشاہی حکام شہر نے اُس کے مکانات ضبط کر کے نزول سرکار کر لیے اور اُسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبہ کے فسادوں سے عاجز آ کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انھیں دے دیے گئے۔ اور انھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آ کے اُن

[عہ] مستامن کے معنی طالب امن۔ یورپ والوں کو چونکہ مسلمانوں اور ہندؤں میں اپنے لیے خطرہ نظر آیا کرتا تھا اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے وہاں کے لیے دربار دہلی سے مستامنی کی سند حاصل کر لیا کرتے۔ تاکہ عمال و حکام اور نیز رعایا اُنھیں نہ ستائے۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر ذمہ داریاں عائد ہو جاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

مکانون مین سکونت اختیار کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل" کہلاتے ہین۔ ملّا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع و ماوی بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو سلسلۂ نظامیہ کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہین سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے۔ اور علمی کمالات کے ساتھ اس مین ولیانہ برکتین بھی مضمر تصور کی جاتی ہین۔ اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس قدیم زمانے ہی مین کہان کہان اور کتنی کتنی دور کے طلبۂ علوم لکھنؤ مین جمع رہتے ہون گے۔

یوروپین سیاح لیکٹ جو ۱۰۵۳ھ محمدی (۱۶۴۳ء) یعنی شاہجہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل مین ہندوستان کی سیر کر رہا تھا لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے" محمد شاہجہانی مین یہان کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ اُنھین دونون کے نام سے اُنھون نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلّے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اس زمانے مین یہان اشرف علی خان نام ایک رسالدار تھے اُنھون نے اُسی سلسلہ مین اشرف آباد بسایا۔ اور اُن کے بھائی مشرف علی خان نے تارکی دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مرور ایام سے اب نوتبہ ہو گیا ہے۔ انھین دنون پیر خان نام ایک اور فوجی افسر تھے جنھون نے ان سب محلون سے مغرب کی طرف دور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک "پیر خان کی گڑھی" کہلاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے وقت لکھنؤ مین ٹھہرتا ہوا دہلی گیا۔ اس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص لچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ مین نہین ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اُس نے فرنگی محل کے مکانات علامۂ زمان ملا نظام الدین کی نذر کیے ہون گے۔

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے مین لکھنؤ کا صوبہ دار گردھاتا نگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھاتا نگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ چچا کی جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے اظہار اطاعت و فرمان برداری کیا۔ اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اُس نے یہان کی سکونت اختیار کی اور اُس کی بی بی نے جو رانی کہلاتی تھی رانی کٹرہ آباد کیا۔

مگر یہان کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی ہو شیخزادون کا زور اس قدر تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی لے کے آیا ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقہ مین قدم رکھے۔ مچھی بھون کو اگرچہ قصر امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخزادون نے اُسے اپنی موروثی جائداد بنا لیا تھا۔ اور دہلی سے جو والی آتا اُس کے پاس بھی نہ پھٹکنے پاتا۔ اُنھون نے مچھی بھون کے پاس دو اور عمارتین تعمیر کر لی تھین جن مین سے ایک کا نام "مبارک محلا" تھا اور دوسری کا "پنج محلا" تھا۔ پنج محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنج منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا محراب دار پھاٹک تھا جو "شیخن دروازہ" کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخزادون کی مذکورہ عمارتون مین جانا چاہتے اسی پھاٹک مین سے ہو کے گزرتے۔

اس پھاٹک کی محراب مین بانکے شیخزادون نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی آنا چاہے چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل مین عذر کرے؟ یہان تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخون سے ملنے کو جاتے تو اُنھین بھی جبراً و قہراً اس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ سنہ ۱۱۴۶ھ محمدی (۱۷۳۲ء) مین نواب سعادت خان برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آئے۔ جن سے

ہندوستان کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دے کے بیان کرنا چاہتے ہین۔ پہلے نمبر مین ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقش اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر مین اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آیندہ چند نمبرون مین اس نیشاپوری خاندان کی تاریخ حکومت بیان کرین گے۔ اور اُس کے بعد دکھائین گے کہ یہ تمدن کیا اور کیسا تھا۔

سقف فلک

انسان کی جب پہلے پہل دنیا مین آنکھ کھلی ہوگی اور اُس نے اس نیلگون سقف فلک کی طرف نظر اُٹھا کے دیکھا ہوگا تو اُس کی عجیب حالت ہوئی ہوگی۔ ہم اس بالائی طلسم کو دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے ہین۔ اور ہمارے دلون کو صبر آگیا ہے کہ "کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمارا"۔ لیکن اُس وقت انسان کی متجسس طبیعت کو اپنے اس عجز کی خبر نہ تھی۔ وہ بڑے بڑے دعوے رکھتا ہوگا۔ اور جانتا ہوگا کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہین۔

سچ یہ ہے کہ اُس وقت اس طلسم فلک کا راز معلوم کرنے کے شوق نے اُسے بہت ہی پریشان کیا۔ یہ تماشا دیکھتے دیکھتے وہ حیران ہو گیا کہ دن کو تو اس گنبد نما سقف مدور مین ایک ہی قندیل روشن ہوتی ہے جس کی تیز روشنی سے ہر طرف اُجالا ہو جاتا ہے۔ مگر رات کو جب وہ دن والی بڑی قندیل غائب ہو جاتی ہے تو جا بجا بے ترتیبی سے سیکڑون چراغ روشن ہو جاتے ہین۔ اور پتہ نہین چلتا کہ کیون روشن ہوتے ہین اور انھین کون روشن کرتا ہے؟ پہلا خیال یہ تھا کہ یہ قندیلین اس لاجوردی چھت مین قائم ہین۔ مگر مشاہدے سے معلوم ہوا کہ نہین یہ چلتی پھرتی رہتی ہین۔ اور ایک جگہ قائم نہین۔ یہ دیکھ کے اور حیرت ہوئی اور دل مین کہا "اُس سے تو یہ سمجھ مین آتا ہے کہ کچھ لوگ مقرر ہین جو آسمان پر ان چراغون کو لیے پھرتے ہین"۔

جب نظر اس راز قدرت کو کسی طرح نہ پا سکی اور یقین ہو گیا کہ اب یہ عالم بغیر پاس
جا کے دیکھے نہیں کھل سکتا تو انسانوں نے بڑی بے صبری کے ساتھ اس بات کی کوشش
شروع کی کہ جس طرح بنے اس چھت پر چڑھیں - جہاں تک رسائی ہو سکی ڈھونڈھا اور
تلاش کیا مگر کسی جگہ کوئی زینہ نہ ملا جس پر سے ہو کے اوپر جائیں - سیڑھی بنانے کی
کوشش کی مگر بہت سے بانس اٹھا اٹھا کے دیکھے کوئی آسمان تک نہ پہونچا آخر سب نے مل کے
ایک مینار بنانا شروع کیا - اور اس دھن میں لگ گئے کہ جب تک آسمان نہ ملے گا
ہم اس مینار کو اونچا کرتے ہی چلے جائیں گے - اس مینار کے بنانے میں انھوں نے
بڑی بڑی مستعدیاں دکھائیں - نہ دن کو دن سمجھے نہ رات کو رات - لیکن وہ اسے
جس قدر بلند کرتے جاتے تھے اسی قدر آسمان اور اونچا ہوتا جاتا تھا - آخر ہاتھ
پاؤں محنت سے رہ گئے - ساری کوشش بیکار گئی - ہمتیں پست ہو گئیں - اور نظر
آ گیا کہ کسی ایسے برج کے بنانے کا خیال کرنا جو آسمان سے جا لگے محض جنون ہے
لیکن انسان سعی کے لیے پیدا کیا گیا ہے - فلک دوز برج بنانے کی کوشش میں
ناکام ہوا تو اس راز کے حل کرنے کی دوسری تدبیریں سوچنے لگا - ظاہرین نظر
آ رہا تھا کہ چاروں طرف آسمان کے کونے سطح زمین کے کونوں سے لے ہوئے ہیں -
بنانے والے نے اس نیلگون گنبد کو دیواروں پر نہیں قائم کیا بلکہ ایک گول پیالا سے
جو فرش زمین پر اوندھا دیا ہے - اس کے ساتھ آسمان و زمین کے کنارے
ملانے کے مقام کچھ بہت دور نہ نظر آتا تھا - بہت سے اولوالعزموں نے
کہا اگر ہم آسمان پر سیڑھی نہیں لگا سکتے - کوئی ایسا برج و مینار نہیں بنا سکتے
جس کی چوٹی اس نیلی چھت کو چھو سکے تو ہم افق کی طرف جائیں گے جس طرح بنے گا
گرتے پڑتے پہونچیں گے - اور اس اوندھے پیالے کے کگروں کو چھو لیں گے - چنانچہ
ہر شخص اپنی مرضی کے موافق کسی نہ کسی طرف چل کھڑا ہوا - کسی نے پورب کی راہ لی
اور کسی نے پچھم کی - کوئی اُتر کی طرف چلا اور کوئی دکھن کی طرف - مگر سب حیرت
سے دیکھتے تھے کہ جس قدر آگے بڑھتے ہیں اسی قدر افق پیچھے ہٹتا جاتا ہے - تیزی
سے قدم اٹھایا - وہ بھی اسی تیزی سے دور ہونے لگا - دوڑے وہ گویا ان سے
بچنے کے لیے الٹا بھاگنے لگا -

اِسی دُھن میں یہ لوگ منزلوں چلے گئے۔ ہزاروں کوس آگے نکل گئے۔ مگر اُفق اُتنی ہی دُور تھا جتنی دُور کہ گھر سے چلتے وقت نظر آیا تھا۔ آخر بعض کو سمندر نے روکا اور اپنی لہروں سے چین بجبین ہو کے قدرت کی طرف سے ڈانٹا کہ "دست ادب!" بعض کو سر بفلک پہاڑوں نے روکا اور عظمت و جبروت کے لہجے میں کہا "زیادہ حد ادب!" لیکن اُفق کی جستجو میں اتنی دُور نکل آئے تھے کہ پاؤں نے جواب دے دیا تھا۔ گھر واپس جانا محال تھا۔ جہاں پہونچے وہیں کے ہو گئے۔ مگر اپنی متجسس طبیعت سے مجبور تھے۔ دُھن اب بھی یہی تھی کہ آسمان کو چھو لیں۔

ہوس آمیز امید نے اب ان کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ اگر گوشۂ فلک کو چھو لیں گے تو اِس کے اُوپر چڑھنے کی کوئی راہ بھی ضرور نکل آئے گی۔ کوئی دروازہ یا کوئی کھڑکی موجود ہی ہوگی۔ بس ہم اُس کے پار ہوئے اور آسمان پر چڑھ گئے۔ جن کے پاؤں سمندر نے پکڑ لیے تھے اُنھوں نے سوچتے سوچتے مدتوں میں دریا پر سفر کرنے کے مخدوش ذریعے پیدا کر لیے۔ کشتیاں بنائیں۔ اور اُن پر سوار ہو کے ڈگمگاتے اور موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے آگے بڑھے کہ اُفق فلک تک پہونچیں جو سامنے ہی ہے۔ اُفق تو اب بھی نہ ملا۔ اپنی وضع کے مطابق دُور ہی ہوتا گیا۔ مگر صد ہا جزیرے مل گئے۔ جن میں جا جا کے اُنھوں نے سکونت اختیار کی۔ اور کوئی مقام نہ باقی رہا جہاں نہ پہونچ گئے ہوں۔

جن لوگوں کو پہاڑوں نے روکا تھا وہ پہلے تو ہیبت کھا کے اور خوف زدہ ہو کے رُکے۔ ذرا ٹھہرے۔ پھر غور سے جو دیکھا تو پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی نظر آئیں۔ اور دل میں کہا "یہ تو آسمان پر پہونچنے کے اچھے خاصے زینے موجود ہیں۔ ہم نے وہ بُرج بنانے کی فضول ہی کوشش کی تھی۔" فوراً پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ اب اس سعی لاحاصل میں لگے ہوئے ہیں۔ ٹھوکریں کھا کھا کے گرتے ہیں ہانپ ہانپ کے قدم اُٹھاتے ہیں۔ مگر چڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آخر اکثر کو چوٹیوں تک جا کے نظر آیا کہ یہاں سے بھی آسمان اُتنی ہی دُور ہے جتنی دُور کہ زمین پر سے تھا مگر بعض جن کی نہایت بلند پہاڑوں کی برف آلود چوٹیوں تک رسائی نہ ہو سکی تھی اُنھیں یقین ہو گیا کہ اُوپر جا کے بھی سقف فلک کو نہ چھو سکیں گے لیکن پھر بھی

رہ رہ کے یہ خیال آتا تھا کہ اگر اس برف کے سمندر کو پھاند کے اوپر پہونچ جائین تو شاید آسمان کی حقیقت یہان سے کچھ زیادہ معلوم ہو سکے - اسی خیال سے اور اوپر چڑھنے کی ہوس مین بہتون نے جانین دیدین - مگر آسمان کو کوئی نہ چھو سکا -

اس جستجوے لاحاصل سے انسان کی آرزو تو نہ بر آئی مگر خدا کا جو منشاے تخلیق تھا وہ آپ ہی آپ بڑی خوبی کے ساتھ پورا ہوتا گیا - یعنی ساری زمین انسانون سے آباد ہو گئی - اور حضرت آدم کو خلافت و نیابت الٰہی کا جو عہدہ ملا تھا اُس کی البتہ بوجہ احسن تکمیل ہوئی -

لیکن اس تھکنے اور عاجز ہونے پر بھی انسان اپنی جستجو سے باز نہ آیا - اب اُس نے زمین ہی پر بیٹھے بیٹھے آسمان مین ٹھگلیان لگانا شروع کین - غور کرنا شروع کیا کہ آخر یہ طلسم کیا ہے - اس سقف زرنگار پر کون لوگ رہتے ہین - آخر غور اور سوچنے اُسے دھیان اور مراقبے کی برکتین دکھانا شروع کین - اور خیالات نے پرورش پا کے واقعیت اور حقیقت کے ایسے ایسے لباس پہنے کہ اُسے اپنی روحانی سیرون اور باطنی جستجوؤن کا یقین آگیا - اور سمجھا کہ ہم آسمان پر جا کے جو کچھ معلوم کر سکتے اُسے یہین گردن جھکا کے اور آنکھین بند کر کے چشم حقیقت بین سے دیکھ لیا کرتے ہین -

دنیا مین انسان کو جنگلون پہاڑون اور سمندرون مین بہت سی ایسی چیزین نظر آئی تھین جن کی عظمت سے مغلوب و خائف ہو کے اُس نے خیال کر لیا تھا کہ ان مین کوئی غیر مجسم قوی موجود ہین جو اپنی صورت تو نہین دکھاتین مگر ہم پر اپنا رعب بٹھا دیا کرتی ہین - جب ان قوتون کا اُسے بہت زیادہ یقین ہو تو کبھی کبھی اُس کے خیال کی آنکھون نے ان روحانی قوتون کی صورتین بھی دیکھ لی تھین - اب اُس کا خیال اس جانب مائل ہوا کہ یہ سقف فلک انھین باطنی اور مخفی قوتون کا نشیمن ہے - اس خیال کی طرف توجہ ہونے کے بعد جب انسان نے مراقبہ و مکاشفہ کے قاعدون سے اُس کو خوب پرورش کیا تو آسمان پر اُسے بڑے بڑے تماشے نظر آنے لگے - اُس کی باطنی جستجوؤن نے سقف فلک کے اوپر جب روحانی عالم کا پتہ

نکلا یا تھا وہ ایک بڑا وسیع عالم نظر آیا - جس مین دیوتا رہتے تھے - دیویان اپنے لازوال ابدی حسن کے کرشمے دکھا رہی تھین - اُن کے رہنے کے محل اُن کے سیر کرنے کے چمن اور اُن کے سارے ساز و سامان دنیوی تکلفات سے بدرجہا زیادہ بڑھے چڑھے نظر آئے

زیادہ غور و خوض اور مزید توجہ نے اس بات کو بھی محسوس کرا دیا کہ آسمانی تارون کی حرکتین نئی نئی اور جدا گانہ ہین - اور سب ایک ہی مسافت پر نہین بلکہ نسبتاً قریب و بعید ہین - کوئی بہت زیادہ دُور ہے اور کوئی بہ نسبت اُس کے نزدیک - ان نئی باتون کے معلوم ہوتے ہی انسان کی جستجوؤن نے رفتہ رفتہ اس سقف فلک کو ایک بڑا بھاری نو کھنڈا محل بنا کے کھڑا کر دیا - اور چونکہ اس نو منزلی عمارت مین سب درجون کے تارے اور اُن کی حرکتین نیچے سے بخوبی نظر آ سکتی تھین اس لیے یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ یہ ساری عمارت صاف اور شفاف شیشے کی بنی ہوئی ہے - یہ معلوم ہوتا تھا کہ سقف فلک کا یہ نو منزلا محل فرشتون اور دیوتاؤن کا عالیشان شیش محل بن گیا جس مین سے سرد شستان کی ابدی کنواریان اور دنیا پر تصرف کرنے والی دیویان جھانک جھانک کے دنیا والون کے ہر فعل اور اُن کی ہر حرکت کو دیکھتی رہتی تھین -

اب ان خیالات کے ساتھ عقیدت نے دنیا کا رنگ ہی بدل دیا - ساتون سیارون مین سے ہر ایک دیوتا یا دیوی بن گیا - مراقبون - روحانی سیرون - اور جستجوؤن نے ان دیوتاؤن کی صورتین شکلین - اُن کے لباس - اُن کے رنگ اور اُن کے بانے (شعار) بتائے - اُن ساتون تارون کے جیسے شیش محل سقف فلک پر نظر آئے تھے دنیا مین بننے اور تیار ہونے لگے - اور بڑے زور و شور سے اُن کی پرستش ہونے لگی - سب کو یقین آ گیا کہ دنیا والون کا روحانی کمال یہی ہے کہ یہ جسم جو بوجھل ہونے کی وجہ سے اُوپر اُڑنے نہین دیتا - اس سے الگ ہوکے اور نسوت روح بن کے انسان سقف فلک کے اس شیش محل مین پہونچ سکتا ہے - اور یہی اُس کی نجات ہے - اور یہین سے روحانیت کا عالم قائم ہوا جس نے محققین ما بعد کی جستجوؤن سے ہر عہد اور ہر زمانے مین نیا رنگ بدلا اور نئی شان دکھائی -

یہ نو کھنڈا شیش محل ہزارہا سال تک قائم رہا - اگرچہ اس بارے مین کہ اُس مین کیا ہے اور کون اور کیسے لوگ رہتے ہین بعد کی جستجوؤن نے اختلافات پیدا کر دیے -

ہر گروہ ایک نئے نتیجہ کو پہونچا۔ اور جس طرح بادشاہون کی دست برد سے دنیا کا جغرافیہ بدلا کرتا تھا اُسی طرح سقف فلک کا جغرافیہ بھی ہر گروہ اور ہر مذہب کے خیال کے مطابق بدلتا اور کچھ سے کچھ ہوتا رہا۔ لیکن پُرانے محققون کا بنایا ہوا شیشہ محل بدستور قائم تھا اور امید تھی کہ قیامت تک برقرار رہے گا۔ کیونکہ فنا ہونا اور کنار اُس کا خرق والتیام تک محال تھا۔

لیکن دور جدید کی تحقیقات اور دُوربینی کے نئے آلات نے اب ہزارہا سال کے بعد سقف فلک کے اُس شیشہ محل کو جس کے ٹوٹنے کو دنیا محال و خلاف عقل سمجھے ہوئے تھی اس طرح مٹا کے رکھدیا کہ گویا تھا ہی نہین۔ اب نہ وہ شیشے کے آسمان ہین۔ اور نہ اُن کی وہ گردش۔ بلکہ تارے خود ہی اپنے حیز پر چکر لگا رہے ہین۔ تارون کی بھی وہ شکلین اور رونقین خواب و خیال ہو گئین۔ نہ عطارد مرد مقدس ہے نہ مریخ بانکا سپاہی۔ نہ زہرہ اپنی چشم فتان سے دلبری کرتی ہے نہ مشتری بال کھولے بین بجا رہی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہ یہ سب دیوتا یا دیویان ہون ہماری زمین ہی کے سے کرے اور بڑے بڑے عالم نکلے۔ تاہم اُس شیشہ محل کے ڈھاجانے پر بھی وہ روحانیات کا عالم باقی ہے جو اُسی سے نکلا تھا۔ مگر گردون کے عالمون تک پہونچنا اور اُن مین زندہ متحرک مخلوق کا پتہ لگانا ابھی باقی ہے۔ ہوائی گھوڑے انسان نے پیدا کر لیے ہین۔ اور امید ہے کہ باقی ماندہ رموز بھی کسی مابعد زمانے مین حل ہو جائین گے۔

ہندوستان کا ایک دلچسپ مناظرہ

مسلمانون مین یا تو علم و فضل کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے زبردست بادشاہ اور خلفا بھی مخالف کی ہر بات کو سنجیدگی و متانت سے سُنتے اور اُس پر غور کرتے تھے اور علما کی صحبت روشن دلی کا آئینہ ہوتی تھی نہ مرعون اور ہیرون کی پالی۔ مگر جب مسلمانون مین وہ پُرانی علمی برکتین فنا ہو گئین تو اُن کی علمی محفلو نے اور تحقیق و تدقیق کی صحبتون نے جہالت کے دنگلون کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اسی کا ایک دلچسپ نمونہ یہ ہے۔

دلگداز کے گزشتہ نمبر مین ہم دکھا چکے ہین کہ شجاع الدولہ کے زمانے مین فیض آباد کیسا بارونق شہر ہو گیا تھا- اور ہندوستان کے تمام باکمال اُس کی ہوا مین کس کثرت سے جمع ہو گئے تھے- جہان اور لوگ تھے وہان پانچ حاذق اور پابند شرع طبیب بھی تھے جو دلی سے آ کے نواب شجاع الدولہ- اُن کی بی بی بہو بیگم صاحبہ اور اُن کی والدۂ محترمہ کی سرکارون مین بڑے بڑے بھاری درماہون پر مقرر ہوئے تھے- نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد بھی بیگمون کی سرکارین قائم رہین- اور وہ اطبا اُنھین سے وابستہ اور اسی شہر مین مقیم رہے- انھین مین ایک صاحب علم اور سن رسیدہ طبیب حکیم معالج خان تھے-

اُن دنون یہان ایک اعلیٰ درجے کے صاحب علم ملّا مولوی محمد منیر تھے جو فارسی اور عربی کتابون کا درس دیتے- اور اُن سے تعلیم پانے کے لیے شہر مین بہت سے طلبہ کا ہجوم رہتا- ان مولوی صاحب کو بہو بیگم صاحب کے خواجہ سرا اور اُن کے داروغہ جواہر علی خان کی سرکار سے محض علمی خدمت کے طور پر کچھ ماہوار ملتی تھی- جواہر علی خان اُن کے علم وفضل کا بڑا معترف تھا- یہ خواجہ سرا اُس زمانے مین فیض آباد کا سب سے بڑا صاحب اقتدار اور صاحب اثر شخص تھا- فوج اور توپخانے سب اُس کے زیر حکم تھے- اور گویا سارے شہر پر اُسی کی حکومت تھی- حکیم معالج خان کو چونکہ فن طب کے علاوہ اپنے علم پر بھی غرّہ تھا اس لیے اُن سے اور مولوی محمد منیر سے چشمک ہو گئی- اکثر صحبتون مین وہ مولوی صاحب پر کوئی نہ کوئی اعتراض جماد یا کرتے- اور ہمیشہ عیب چینی مین مصروف رہتے- یہ بات جواہر علی خان کو ناگوار ہوئی- اُس نے کئی بار حکیم صاحب کو سمجھایا- مگر اُنھون نے عیب گیری سے زبان نہ روکی- اسی اثنا مین ایک بڑے زبان آور ایرانی مغل جو ملّا عبد المجید کے نام سے مشہور تھے فیض آباد مین وارد ہوئے- اُن سے اور مولوی محمد منیر سے راہ ورسم بڑھی- تو حکیم معالج خان صاحب اُن دونون شخصون پر طعن وتشنیع کرنے لگے- آخر جواہر علی خان اس کے درپے ہوا کہ کسی موقع پر حکیم صاحب کو ملّا صاحب کے مقابلے مین زک دلوا کے ذلیل کرائے- اتفاقاً حکیم معالج خان نے کسی صحبت مین اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ امام

زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی[ع] شہیدون مین شامل نہین ہین۔ اس لیے کہ اُنھون نے امام زمانہ امام محمد باقر سے بغاوت کر کے خروج کیا تھا" یہ مسئلہ جواہر علی خان نے ملا سلیم الحمید سے دریافت کیا۔ اُنھون نے کہا" زید کی شہادت یقینی ہے اور اُس سے انکار کرنا ہرگز درست نہین ہے"۔ مجھی ملا صاحب کا یہ قول حکیم معالج خان نے سنا تو دعوے سے کہا "مین احادیث ائمہ سے ثابت کر دون گا کہ زید کو شہید نہ کہنا چاہیے"۔

آخر کار مناظرہ قرار پا گیا۔ اور یہ ٹھہری کہ ماہ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ کی گیارھوین تاریخ بہار علی خان خواجہ سرا کے مکان مین دونون حضرات جمع ہو کے ایک دوسرے کے مقابل اپنے دعوے کو ثابت کرین۔ روز مقررہ کو بہت سے آدمی مناظرہ سننے کے لیے جمع ہو گئے۔ اور بڑی بھاری محفل مرتب ہو گئی۔ سب سے پہلے جواہر علی خان محمد منیر کو مع اُن کے طلبا اور طرفدارون کو لے کے آیا اور باہر پھاٹک پر اُس کی فوج کے تقریباً دو سو سپاہی کھڑے ہو گئے۔ اندر بھی بہار علی خان اور جواہر علی خان کے دو تین سو ملازم موجود تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے شہر والے بھی بحث سننے اور تماشا دیکھنے کو آ گئے تھے۔ الغرض سب ملا کے کوئی پندرہ سولہ سو آدمیون کا مجمع تھا۔

اتنے مین حکیم معالج خان ایک کتاب ہاتھ مین لیے ہوئے اپنے مکان سے نکلے۔ جو بیگم صاحبہ کے مکان یعنی اسی عمارت کے پھاٹک کے اندر واقع تھا۔ اُن کے برابر اُن کے صاحبزادے تھے۔ اور شاگردون کا ایک بڑا غول اُن کے پیچھے تھا۔

ع حضرت زید نے امامت کا دعوی کیا تھا۔ اور کہتے تھے کہ کچھ ضرور نہین کہ ایک وقت اور ایک عصر مین ایک ہی امام ہو۔ جائز ہے کہ دنیا مین ایک ہی زمانے مین دو یا زیادہ امام ہون۔ حضرت علی کو خلفاے ثلثہ سے افضل مانتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جائز ہے کہ کوئی کم فضیلت والا اپنے سے افضل کو چھوڑ کے امام ہو جائے۔ اور اسی بنیاد پر وہ خلفاے ثلثہ کی خلافت کو جائز مانتے تھے۔ عبد الملک بن مروان کے زمانے مین اُنھون نے اپنے پیروون کے ساتھ علم امامت بلند کیا۔ مگر ساتھ والون نے دغا کی۔ چھوڑ کے چلے گئے۔ اور عبد الملک نے اُنھین گرفتار کر کے مصلوب کیا۔ پہلا شیعہ فرقہ زیدیہ ہین۔ اور آج تک سواحل یمن پر کثرت سے موجود ہین۔

سب صاحب آ کے ایک طرف بیٹھ گئے - اُن کے بعد ایرانی ملا آغا عبد المجید اور اُن کے رفقا کو لے کے متبوع علی خان خواجہ سرا آیا - یہ بھی ایک بڑا زبردست حاکم اور رئیس تھا اور اُس کے ہمراہ بھی اُس کے ملازموں اور مسلح سپاہیوں کا ایک بڑا بھاری غول تھا -

یہ سب لوگ آ کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے - اور وقت آیا کہ مناظرہ شروع ہو - مگر محفل کا رنگ خطرناک تھا - تینوں گروہ مسلح تھے - ان لوگوں کو اس کا خیال نہ تھا کہ یہ ایک علمی تحقیق کی صحبت اور اہل علم کا جلسہ ہے - کسی گڑھی یا قلعے کا فتح کرنا نہیں ہے - ہر گروہ کے سپاہیوں کو صرف اس بات کا خیال تھا کہ ہمارے آقا سے کسی سے تکرار ہو گئی ہے - اور آج ہمیں حق نمک ادا کرنا ہے - جتنے تھے سب ہتھیار لگا لگا کے اور اودچی بن کے پہونچے تھے - اور کٹنے مرنے کو تیار تھے - تینوں گروہوں کے سپاہی الگ الگ صفیں باندھے کھڑے تھے - بندوقیں بھری ہوئی تھیں - اور توڑے سُلگ رہے تھے - یہ عمارت وسیع تھی اور کافی گنجائش رکھتی تھی - تینوں طرف محرابیں نئی چلی گئی تھیں - اور بیچ میں کشادہ صحن تھا - مگر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اندر باہر کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی - اور سب اس طرح کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے کہ سانس لینا دشوار تھا -

اب مناظرہ کا تماشا دکھانے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ہم دونوں متقابل حریفوں کی تصویریں بھی اپنے ناظرین کے سامنے کر دیں - مولوی محمد منیر خاموش تھے اس لیے کہ بحث کرنے کا کام آغا عبد المجید نے اپنے ذمے لیا تھا - اُنھیں صرف خاموش بیٹھ کے دیکھنا تھا - آغا صاحب کی یہ شان تھی کہ اول تو وہ ایک زبان آور یاوہ گو مغل تھے - دوسرے ایرانی تھے جو ہندوستانیوں کی اپنے سامنے کچھ ہستی نہیں سمجھتے - تیسرے وہ بڑے طمطراق سے باتیں کرتے تھے - آواز بلند تھی - اور اُس کے ساتھ خوش لہجہ تھے - چوتھے ابھی اُن کا عنفوان شباب تھا - عمر لوئی تیس برس کی بھی نہ ہوگی - اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے صاحب اثر لوگ اُن کے طرفدار تھے - برخلاف اس کے اُن کے حریف معالج خان کی یہ قطع تھی کہ اول تو پستہ قد اور ضعیف تھے - اور پیٹھ جھکی ہوئی تھی - دوسرے بوڑھے

اور ناتوان تھے - تیسرے کئی سال ہوئے انھین لقوہ مار گیا تھا جس کی وجہ سے گردن ٹیڑھی ہو کے رہ گئی تھی - اور صرف دو اون کے زور پر جی رہتے تھے بات کرتے وقت گلے کی رگین پھول جاتین - اور بڑی دشواری کے ساتھ زبان سے لفظ نکلتا - چوتھے اُن کی حمایت پر کوئی نہ تھا - بلکہ شہر کے ادنی بازاری لوگ اُن کی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بگڑی ہوئی صورت کا مضحکہ اُڑاتے - اور سب سے بڑا نقصان اُن مین یہ تھا کہ کبھی اُنھین کسی مجمع عام مین بحث کرنے کا اتفاق نہین پیش آیا تھا -

مناظرہ کا شروع اور آغاز یون ہوا کہ آغا صاحب نے گلے پھلا - فضول طمطراق اور دم و خم کے ساتھ پوچھا "جناب حکیم صاحب امام کے فرزند کی شہادت کے بارے مین جناب کیا فرماتے ہین ؟" جواب دینے کی کوشش مین حکیم صاحب نے گلے کی رگین پھلائین - اینٹھی ہوئی زبان کو کئی بے نتیجہ حرکتین دین - چہرے نے کئی قطعین بدلین - پھر کچھ دیر تک ہکلائے - اور بہت زور لگا کے کہا " اُن پر لعن کرنا درست ہے " آغا صاحب " اُس کی دلیل ؟" حکیم صاحب نے اُنھین پہلی دشواریون اور چہرے کی مضحکانہ تبدیلیون کے ساتھ کہا " یہ معتبر حدیث ـــــ " مگر قبل اس کے کہ حدیث کے الفاظ زبان سے نکلین آغا صاحب نے بات کاٹ کے کہا " معتبر حدیث وہ کون سی حدیث ہے ؟" حکیم صاحب کو چونکہ بات کرنا دشوار تھا کاغذ کا ایک پُرزا ملاّ کے ہاتھ مین دے دیا - اب کسی کو اس کی خبر نہین کہ اُس پُرزے مین کوئی حدیث لکھی بھی تھی یا نہین - اور لکھی تھی تو وہ کون سی حدیث تھی - اور نہ کسی نے اُس کاغذ کے دیکھنے کی کوشش کی - مگر چالاک ایرانی ملاّ صاحب نے وہ پُرزا پیچھے پھینک دیا اور چلاّ کے کہا " مین یہ نہین جانتا - زبانی جواب دیجیے " اب حکیم صاحب خاموش تھے - بدشواری کچھ بولتے بھی مگر جھنجھلاہٹ نے رہی سہی زبان بند کر دی - اُن کے صاحبزادے جو برابر بیٹھے تھے باپ کی زبان بند دیکھ کے کچھ لب ہلائے تھے کہ آغا صاحب بولے " تم کون ہو جو بیچ مین بولتے ہو ؟" حکیم صاحب اس موقع پر جلدی سے بول اُٹھے " یہ میرا بیٹا ہے " آغا نے کہا " مین باپ بیٹا نہین جانتا - گفتگو تو مجھ سے آپ سے ہے آپ جواب دین " اب باپ بیٹے دونون

بے زبان تھے - اور چالاک آغا صاحب نے بہ آواز بلند کہا "حضرات! حکیم صاحب کی بخشش پر فاتحہ!" اور یہ کہتے ہی دونوں ہاتھ اُٹھا کے سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کر دی - فاتحہ سنتے ہی سب لوگ ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے - سب کے کھڑے ہوجانے سے اندھیرا ہو گیا - گھبراہٹ کے ساتھ لوگ ادھر اُدھر ٹاپنے لگے کسی کو خبر نہ تھی کہ کون کہاں ہے کون آگے ہے اور کون پیچھے - سب ایک دوسرے کو ڈھکیل کے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے - مگر زور کسی کا نہ چلتا تھا - تمام حاضرین پر ایسی بدحواسی طاری تھی کہ نہ آقا نوکر کو پہچانتا تھا نہ نوکر آقا کو -

اس پر دلگی یہ ہوئی کہ جو لوگ باہر صحن میں کھڑے تھے وہ سمجھے کہ کسی سے چل گئی - اور سب کے سب بے تحاشا اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے - مگر راستہ کسی کو نہ ملتا تھا - سب ٹھٹھ لگائے کھڑے تھے اور غل مچا رہے تھے - ان کا غل سُن کے فوج کے سپاہی جو پھاٹک کے باہر تھے سمجھے کہ اندر کوئی مار ڈالا گیا - اور سب کے سب ایکبارگی اندر کی طرف لپکے - پھاٹک کھُلا ہوا تھا - مگر ایک ہی پھاٹک تھا - اور ہر سپاہی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے پہونچے - نتیجہ یہ ہوا کہ سب پھنسے کھڑے تھے - اور لوگوں کی پیٹیں قبضیں تلواریں جو لوگوں کی کمر میں تھیں اور بندوقیں جو ہاتھوں میں تھیں اُن کے ایک دوسرے سے کھٹا کھٹ لڑنے اور اُلجھنے سے عجب شور بلند تھا - جتنے تھے پریشان و مضطر تھے اور کسی کا کچھ زور نہ چلتا تھا -

اُن کی یورش اور مضطربانہ شورش سُن کے سارے شہر میں غل مچ گیا کہ مناظرے میں چل گئی - اور دونوں حریفوں کے طرفدار شہر کے ہر کونے اور ہر محلے سے تلوار - چھری - کلہاڑی - لاٹھی یا جو جس کے ہاتھ میں آ گیا لے کے دوڑے - اور سب نے بہار علی خان کے مکان پر دھاوا کر دیا - شیخ احمد علی عنبر علی خان کے دیوانخانے میں تلوئی اور سلون کے راجاؤں اور کئی اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو بیٹھے معاملہ کی باتیں کر رہے تھے اور کاروبار ریاست میں مصروف تھے - ثابت خانی پٹھانوں کے کچھ مسلح سپاہی اُن کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک غل سنا اور خبر آئی کہ جواہر علی خان پر لوگوں کا نرغہ ہے - فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے - اور تین سو مسلح سپاہیوں کو لے کے وہ بھی آ پہونچے - مگر باہر ہی کھڑے تھے - اندر گھسنا غیر ممکن تھا

غرض ایک قیامت بپا تھی اور کسی کو خبر نہ تھی کہ واقعہ کیا ہے - بعض دلگی بازون نے مکان کے اندر اندھیرے اور لوگون کی بدحواسی سے موقع پا کے یہ دلگی کی کہ جس کے سر پہ ہاتھ پہونچا اُس کی پگڑی اُچھال کے ایک گہرے حوض مین پھینک دی جو پاس ہی تھا اور خشک پڑا تھا -

جب دیر تک یہ حالت رہی تو اکثر بگڑے دل سپاہیون نے تلوارین کھینچ لین - اور جب دو چار نے تلوارین کھینچین تو سب کے ہاتھ اپنے اپنے اسلحہ کے قبضون پہ جا پڑے - تلوار - خنجر - پیش قبض - قرابین غرض جو حربہ جس کے پاس تھا اُسے تان کے کھڑا ہو گیا - اور اکثر نے پھکیتی کی مشاقی دکھانے کے لیے پینترے بدل بدل کے چارون طرف خالی ہاتھ مارنا شروع کر دیے -

سب سے زیادہ کثرت جواہر علی خان کے طرفدارون کی تھی - اور سب کا خیال تھا کہ جواہر علی خان پر کسی نے حربہ کر دیا - اس بات کو جواہر علی خان سمجھ گیا - اور دل مین خیال کیا کہ جب تک لوگ میری صورت نہ دیکھ لین گے یہ ہنگامہ موقوف نہ ہو گا - یہ خیال آتے ہی وہ ایک اندرونی زینے پر سے ہو کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور بالاخانے کے دروازے کھول کے سب کو اپنی صورت دکھائی - اور اطمینان دلایا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہین - مین خیریت سے ہون" اُس کی صورت دیکھتے ہی سب نے خوشی کے نعرے بلند کیے - اور اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے گھرون کی طرف چلے - جب کہین خدا خدا کر کے امن و امان قائم ہوا - اور لوگون کو جانے کا راستہ ملا -

لیکن طلوع آفتاب سے دوپہر تک اس مناظرے نے فیض آباد مین عجب گرم جوشی اور قیامت خیز پریشانی قائم رکھی - ایسا دلگی کا ہنگامہ بپا تھا کہ لوگ مدتون تک یاد کرتے رہے - اور یہ ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ کا دن لوگون کو جب یاد آتا مارے ہنسی کے لوٹ جاتے - اس واقعے پر انشا پردازون نے زور قلم دکھائے - شعرا نے مثنویان تصنیف کین - اور بھاٹون نے گیت بنائے جو سالہا سال تک فیض آباد کی سڑکون پر گائے جاتے رہے - افسوس اُن مین سے کوئی نظم ہماری نظر سے نہین گزری ورنہ ضرور نذر ناظرین کرتے -

روحانی جاسوس

اگر انسان کا کانشنس درست ہو اور اُس مین سچی جستجوے حق ہو تو اُس کی روحانی قوت ہی سچی جاسوس بن جاتی ہے۔ یہی قوت ہے جو انبیا و اتقیا مین معجزات و کرامات کی شان دکھاتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ کوئی خلاف فطرت چیز نہین۔ بلکہ روحانی جاسوس ہے جو اکثر بہت سچی مخبری کیا کرتا ہے۔

چنانچہ اس روحانی جاسوسی کی مخبری کا ایک واقعہ یہ ہے کہ معتضد باللہ عباسی ایک دن دوپہر کو سوتے سوتے چونک پڑا۔ گھبرایا ہوا اُٹھا۔ اور خدام کو آواز دی۔ اور جیسے ہی لوگ حاضر ہوئے حکم دیا کہ اسی وقت دوڑتے ہوے دجلے کے کنارے جاؤ۔ سب کے پہلے جو کشتی ملے اُسے حراست مین کر لو۔ اور ملاح کو پکڑ کے میرے پاس لاؤ۔" لوگ گئے۔ اور ایک ملاح کو دیکھا کہ بدحواس اور گھبرایا ہوا سا اور کشتی کو ایک طرف بھگائے لیے جاتا ہے۔ فوراً اُس کی کشتی روک کے اُس پر پہرہ مقرر کر دیا۔ اور اُسے لے کے معتضد کی خدمت مین حاضر ہوئے۔

اُس کی صورت دیکھتے ہی معتضد نے بڑی ہی زور سے اُسے ڈانٹ بتائی اور کہا "بدمعاش جلدی بتا کہ جس عورت کو تو نے آج مار ڈالا ہے اُس کا کیا واقعہ ہے اور سچ سچ بتانا۔ نہین تو اسی وقت سر اُڑا دون گا۔" ملاح خلیفہ کی ڈانٹ سُن کے سہم گیا۔ اور بولا "امیرالمومنین قصور تو ہوا ہے آج صبح مین فلانے گھاٹ پر تھا کہ ایک نہایت ہی حسین و پری جمال عورت میری کشتی مین سوار ہوئی اور فلان مقام پر لیجانے کو کہا۔ حسن و جمال کے ساتھ وہ نہایت ہی معزز و دولت مند معلوم ہوتی تھی اس لیے کہ بہت ہی بھاری کپڑے پہنے تھی اور سر سے پاؤن تک مرصع زیور سے لدی ہوئی تھی۔ اُس کو تنہا دیکھ کے مجھے لالچ معلوم ہوا۔ کشتی کے اندر گرا کے فوراً چھاپ بیٹھا۔ وہ چیخنے نہین پائی تھی کہ منھ بند کر کے گلا گھونٹ دیا۔ پھر اُس کے کپڑے اور اُس کا سارا زیور اُتار لیا۔ اور لاش دریا مین بہا دی۔ اس کے بعد ارادہ کیا کہ اُن کپڑوں اور زیور کو گھر لے جاؤن مگر اندیشہ ہوا کہ اس وقت انھین لے کے کشتی سے نکلون گا تو ممکن ہے کہ کوئی راستے مین

پکڑے - اس لیے کشتی کو سیدھا شہر واسط کی طرف بھگا لے گیا - دوپہر کو جب دیکھا کہ دریا کشتیون سے خالی ہے تو پلٹ آیا - اور عنقریب کشتی چھوڑ کے گھر جانے کو تھا کہ اِن لوگون نے پکڑ لیا "معتضد نے کہا "اور وہ زیور اور کپڑے کہان ہین؟" کہا "کشتی کے بیچ مین تختون کے نیچے رکھے ہین"

معتضد نے خدام کو حکم دیا کہ "اسی وقت جا کے اُن کپڑون اور زیور کو لے آؤ - اور میرے سامنے حاضر کرو" دم بھر مین وہ سب چیزین آ گئین - اور ملاح نے دیکھ کے اور پہچان کے کہا کہ "ہان یہی ہین"

اب معتضد کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی - اُس ملاح نے جس طرح اُس خاتون کو ڈرا اور ڈبو دیا تھا اُسی طرح اُسے دجلہ مین ڈبوا دیا - اور بغداد مین ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ "جس گھر کی کوئی جوان عورت آج صبح کو بھاری کپڑے اور زیور پہنے ہوئے فلان گھاٹ پر جا کے غائب ہو گئی ہو اُس کے لوگ بارگاہ خلافت مین حاضر ہون" دوسرے دن اُس عورت کے گھر والون نے آ کے اطلاع کرائی فوراً دربار مین بُلا لیے گئے - خلیفہ نے اُن سے اُس عورت کی کیفیت و حالت دریافت کی - پھر وہ کپڑے اور زیور منگوا کے دکھائے جنھین اُنھون نے دیکھتے ہی پہچان لیا - تب معتضد نے وہ سب زیور اور کپڑے اُن کے حوالے کیے - اور بتایا کہ وہ خاتون شہید ہو ئی - اُس کی لاش دریا مین بہا دی گئی - اور قاتل کو بھی سزا دی جا چکی"

اُس وقت دربار مین ابو محمد حسین بن محمد صالحی موجود تھا جو اس کارروائی کو اول سے آخر تک دیکھتا رہا تھا اُس نے بہ ادب عرض کیا "یا امیر المومنین! حضور کو اس واقعہ کی کیونکر اطلاع ملی؟ کیا حضور پہ آسمان سے وحی اُترتی ہے؟" معتضد نے کہا "کل دوپہر کو میری ذرا یونہین سی آنکھ لگ گئی تو خواب مین کیا دیکھتا ہون کہ ایک مقدس و متبرک صورت کا پیر مرد جس کے سر کے بال برف کے سے ہین - سفید ڈاڑھی نہایت ہی نورانی ہے - اور سر سے پاؤن تک سفید براق کپڑون مین لپٹا ہوا ہے میرے سامنے آ کے کہہ رہا ہے "اے احمد (یہ معتضد باللہ کا اصلی نام ہے) اِس گھڑی سب سے پہلے جو ملاح دریا مین کشتی لے کے

آئے اُسے گرفتار کرلے - جس حسینہ کو اُس نے قتل کیا ہے اور اُس کے زیور اور کپڑے لیے ہیں اُس کے قتل کا اقرار کرا - اور اُس پر حد شرع جاری کرے یہ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی - پھر اُس کے بعد جو کچھ واقعات پیش آئے تم دیکھ ہی چکے ہو یہ پیر مرد جو معتضد کے خواب میں آیا کون تھا؟ یہی روحانی جاسوس تھا جو ایک مقدس بزرگ کے بھیس میں آیا - اور معتضد کو اُس کے فرائض حکمرانی سے مطلع کر گیا

ریویو

تاریخ اودھ - مولانا حکیم محمد نجم الغنی خان صاحب رام پوری نے یہ تاریخ بڑی محنت جستجو اور قابلیت سے تصنیف فرمائی ہے اور ہمارے قدیم کرم فرما مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد نے اسے شایع کیا ہے - یہ بیش بہا کتاب چار جلدون مین پوری ہوئی ہے - پہلی جلد ۱۹۰ صفحون پر ہے جس مین آغاز سے آخر عہد نواب صفدر جنگ تک کے حالات ہین - دوسری جلد ۲۹۶ صفحون پر ختم ہوئی ہے جس مین نواب شجاع الدولہ بہادر کی مسند نشینی سے نواب وزیر علی خان کے معزول اور خارج کیے جانے تک کے حالات ہین - تیسری جلد ۲۴۲ صفحون مین تکمیل کو پہونچی ہے - اور اُس مین نواب سعادت علی خان کی مسند نشینی سے مُنا جان ابن نصیر الدین حیدر کے معزول اور چنار گڑھ بھیجے جانے تک کے واقعات ہین - اور چوتھی جلد جو ۳۴۴ صفحون مین پوری ہوگئی ہے محمد علی شاہ کی تخت نشینی سے آخر انتزاع سلطنت تک کے واقعات ہین

قابل مصنف کا مذاق تاریخ سچا اور اچھا ہے - طرز بیان عمدہ پیچیدہ واقعات کے سلجھانے اور صاف کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تصنیف کے لیے اُنھون نے پوری وسیع النظری پیدا کی ہے - قریب قریب اودھ کی تمام تاریخون پر نظر ڈالی ہے - اور جو کام کیا ہے اچھی طرح تیار ہو کے کیا ہے - حکومت اودھ اور خوانین روہیلکھنڈ کے درمیان مین جو افسوس ناک واقعات پیش آئے اُن مین مصنف حکومت اودھ ہی کو ملزم ٹھہراتے ہین - اور اس مین ذرا شک نہین کہ اُس عہد کے دیکھتے حکمرانان اودھ کی یہ اتنی بڑی

پولیٹیکل غلطی تھی جو قابل معافی نہین۔ لیکن ہم پوچھتے ہین کہ مسلمانون نے اپنے زوال کے زمانے مین معافی کے قابل کون سا کام کیا تھا جو اس کو کہا جائے؟ اس داستان حسرت کے ہر ہر ٹکڑے کو ہم سوا اس کے کہ "شدنی" کہہ کہہ کے اپنے آپ کو سمجھائین اور کس طرح اپنے دل کو تسلی دے سکتے ہین۔

اس تاریخ مین حکمرانان اودھ کی بُری تصویر دکھائی گئی ہے۔ جس مین اُن رپورٹون نے بڑی مدد دی ہے جو لکھنؤ کے رزیڈنٹ تیار اور مرتب کر کرکے بھیجا کرتے تھے۔ مگر ہم مصنف صاحب سے عرض کرتے ہین کہ عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ اِنھین بدنام فرمان رواؤن کے ہاتھون نے بہت سے اچھے کام بھی کیے ہین۔ حکومت اودھ کی قلمرو مین اُن دنون اگر چند مظلوم تھے جن کے حالات دنیا کے سامنے پیش کردیے گئے ہین تو اُسی کی حدود مین اُن دنون مرفہ الحالی بھی ایسی تھی کہ پھر کبھی نہ نصیب ہوگی۔ انگریز رپورٹرون اور مورخون کا یہ عام مقولہ ہے کہ شہر والے گچھے اڑا رہے تھے مگر گاؤن ویران اور تباہ تھے۔ مگر ہمین اتفاقاً جتنے گاؤن ملے سب ایسے ہی ملے کہ اُن دنون نہایت آباد اور بارونق تھے اور اب حد سے زیادہ ویران و خراب ہین۔ لکھنؤ مین بے شک وہ تمام عیوب پیدا ہوگئے تھے جو عیش پرستی کی وجہ سے دنیا کے ہر مشہور شہر مین پیدا ہو جایا کیے ہین لیکن لکھنؤ ہی نے ایک ایسا شائستہ تمدن پیدا کر دیا تھا اور ایسی نکھری سوسائٹی نمایان کر دی تھی جس نے لکھنؤ کو ہندوستان کا پیرس مشہور کیا تھا اور جس کی یاد مدتون مین بھولے گی۔ اِس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ایشیائی تہذیب کا آخری گہوارہ لکھنؤ کا گم شدہ دربار تھا۔ اور اس گہوارے مین پڑ کے ہماری اصلی تہذیب ایسی موت کی نیند سوئی ہے کہ قیامت تک نہ جاگے گی۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ اپنی ذاتی تہذیب کو کھو کے ہم کسی دوسری تہذیب کے چاہے نقال بن جائین مگر مالک قیامت تک نہ بن سکین گے۔

تاہم ہمین اعتراف ہے کہ مصنف صاحب نے یہ تاریخ بڑی قابلیت اور تکمیل کے ساتھ لکھی ہے۔ جس کے لیے ہم اُن کے نہایت شکرگزار ہین لیکن آخر مین معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف لکھتے لکھتے اکتا گئے تھے۔ اور اس کے درپے تھے کہ اس بلا کو

کسی طرح ٹالین - چنانچہ پچھلی جلد جس مین بہت زیادہ واقعات ہونا چاہیے تھے صرف ۱۳۴ صفحون مین ختم ہو گئی ہے - محمد علی شاہ - امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے حالات کے تشنہ رہنے کے علاوہ مرزا برجیس قدر اور غدر کے حالات ناگوار اختصار کے ساتھ ٹال دیے گئے ہین۔

پہلی جلد کے اول مین مصنف صاحب کی تصویر ہے - اور چوتھی جلد کے آخری گیارہ صفحے جناب مصنف کے سوانح عمری کی نذر ہوئے ہین جن مین اُن کے حالات کے علاوہ اُن کی غزلین اُن کی نظمین اور اُن کا واسوخت بھی درج کر دیا گیا ہے۔

کتاب ۲۰ x ۲۶ پیمانے کے معمولی کاغذ پر چھپی ہے - چھپائی بھی معمولی ہے - اور قیمت ہر جلد کی عہ یعنی پوری کتاب کی قیمت چھ روپیہ (ے) ہے - مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد سے وی - پی منگوائی جاے -

رومتہ الکبریٰ

اب کی جو ناول قدردانان دلگداز کی نذر کیا جاے گا اُس کا نام "رومتہ الکبریٰ" ہے - اُس مین گوتھ لوگون کے ہاتھ سے رومتہ الکبریٰ کی تباہی اُس عہد کے رومہ کی آبادی و معاشرت کی سچی تصویر دکھا کے اوڈولفوس شاہ گوتھ کے ایک ناز پروردہ شاہزادی پر عاشق ہونے - اور لڑائی سے تھک کے محبت و خلوص کے ذریعے سے اپنے عشق مین کامیاب ہونے کے سچے تاریخی واقعات دکھاے گئے ہین - اور آخر مین اسپین کی اُس گوتھ سلطنت و دولت کا پتہ دے دیا گیا ہے جسے تین صدیون بعد عربون نے تباہ کیا تھا۔ بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول اور تاریخ روم کے عمیق مطالعہ کا جوہر اور ست ہے - یہ ناول ۱۸۸ صفحون پر ختم ہوا ہے - اور جو خریدار نہین ہین اُن سے اس کی قیمت سوا روپیہ عہ ہے - مگر سنہ ۱۹۱۳ء کے خریدارون کی خدمت مین مفت نذر کیا جاے گا۔ تیاری مین کسی قدر دیر ہو گئی - نصف سے زیادہ چھپ چکا ہے - تیار ہوتے ہی خریدارون کے نام عہ ۱۱ر پر وی پی روانہ کیا جاے گا -

اُردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

نمبر ۳ جلد ۱۶

مارچ سنہ ۱۹۱۴ عیسوی - مطابق حمل سنہ ۱۳۴۳ محمدی

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس میں چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

ہندوستان مین مشرقی تمدن

کا

آخری نمونہ

نواب سعادت خان برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم تک ملتا ہے سنہ ۱۱۱۳ھ محمدی (سنہ ۱۷۰۶ء) عہد بہادر شاہ مین وارد ہندوستان ہوئے۔ اُن کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے جنھون نے یہان شادی کر لی۔ اور رہا بیٹون نے ناظم بنگالہ کے زیر حمایت عظیم آباد پٹنہ مین سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستانی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد اُن کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان مین آگئے۔ عظیم آباد پہونچے تو سُنا کہ والد نے سفر آخرت کیا۔ اور اب دونون بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوئے۔ جہان پہونچ کے میر محمد امین کو شاہزادون کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس مین انھون نے ایسی لیاقت مستعدی اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگون مین شہرت ہو گئی۔ اقبال بر سر یاری تھا۔ چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیرون اور منصبدارون مین شامل ہوئے۔ پھر صوبہ دار اکبرآباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا۔ اور اُس اعلیٰ طبقۂ اُمرا مین شمار کیے جانے لگے جن پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتون کے لیے انتخاب کی نظرین پڑتی تھین۔

اُن دنون دہلی مین سادات بارہہ کا زور تھا۔ جن سے رعیت تو رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے اُن کو قتل کرا کے سیّدون کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ اور لڑائی مین ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سوارون کی سرداری کے ساتھ بُرہان الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور اُسی وقت اکبرآباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہی خواصون کی وارونگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا۔ اس کے تھوڑے دنون بعد وہ صوبۂ اودھ کے صوبہ دار اور اس کے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ آدمی ہوشیار اور نہایت ہی بیدار مغز اور اس کے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپخانے کو اپنے ہاتھ مین لے کے اُنھون نے ایسی زبردست قوت پیدا کر لی جیسی اُن دنون سارے ہندوستان مین کسی کو نصیب نہ تھی۔ اس زمانے مین کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کر کے بڑا زور باندھ رکھا تھا اور کئی افسر جو اُس کی سرکوبی کو گئے اُس کے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوئے۔ اور یلغار کرتے ہوئے پہونچے بلونت سنگھ نے چالاکی سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادرون کے ہاتھ پاؤن پھول گئے۔ مگر برہان الملک نے ایسی جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمنون کے نرغے مین اُن کی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی۔ تھوڑی دیر مین بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا۔ اور دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی۔ اُن دنون مرہٹون کا ہندوستان مین بڑا زور تھا۔ اُنھون نے تاجدار دہلی سے چوتھ مقرر کرا لی تھی۔ اور بڑے بڑے سورما اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹون کو زبردست فوج کے ساتھ جا کے ایسی سخت شکست دی کہ اُن کے حواس جاتے رہے۔ لوگ دُم بھاگے۔ اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا۔ واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی روک نہ دیے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹون کا استیصال کر دیتے۔ اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ و سفید کی مالک ہو جاتی۔ مگر اُس کے نصیب

زوال پذیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا۔ درباریون کی سازش اور مقربین دربار کے حسد نے برہان الملک کی رفتار کو ڈگوادیا۔

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلادیا کہ بادشاہ مین اپنے نیک و بد کے سمجھنے کی صلاحیت نہین اور اہل دربار بددیانت و خودغرض ہین فوراً مرہٹون سے صلح کرلی۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے مین جا کے قیام کرین۔ اور سب سے الگ ہوکے اپنے علاقہ کو مضبوط اور منتظم بنادین۔ غرض برہان الملک نے دل مین سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ سنبھلنے والی نہین ہے۔ اپنا صوبہ لیکے الگ ہوجانا ہی مناسب ہے۔ اور دہلی کے دربار کو اُس کی قسمت پہ چھوڑ دینا چاہیے۔

لکھنؤ مین جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہین شیخزادون کا زور تھا۔ اُنھون نے اپنی عادت کے موافق اُنھین بھی روکا۔ مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہوگئے اور نکسیر بھی پھوٹنے نہ پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ مین داخل ہونے کے متعلق دو روایتین مشہور ہین ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے۔ یہان تک کہ اکبری دروازہ پر روک گئے۔ چونکہ وہ سابق کے تمام صوبہ دارون کے خلاف تجربہ کار اور متین و سنجیدہ شخص تھے۔ ٹھہر گئے۔ اور محمود نگر مین پڑاؤ ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخزادون کی دعوت کی۔ اُن سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا مزہ لوٹنے مین مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک مین داخل ہو رہی تھی۔ جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہان تک کہ مچھی بھون کے پاس جا پہونچی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بنگش نے برہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخزادے بڑے شدزور پشت ہین۔ اُن سے پیش پانا آسان نہین۔ مگر قرب و جوار کے دوسرے شیوخ اُن کے خلاف ہین۔ آپ اُن لوگون سے مدد لیجیے۔ اور انھین کی مدد سے لکھنؤ والون کو زیر کیجیے چنانچہ برہان الملک نے کاکوری مین قیام کرکے شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنالیا۔ اُنھین کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے۔ اور یہ سن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے مین مقابلہ کا سامان کیا گیا ہے اصلی راستہ سے کتراکے مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گئو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اُترے۔ اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آگے آ کے اچانک مچھی بھون پر آپڑے۔ غرض جو صورت ہو

اُنھوں نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

جب مچھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا؟ شیخزادون کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر جھکا دیا۔ برہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے شیخن دروازے مین داخل ہوئے اور اُس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادرون کا سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخزادون سے کہا "ہمارے قیام کے لیے مچھی بھون خالی کر دو۔" اس مین اُنھون نے لیت و لعل کرنا چاہی مگر نہ چلی۔ آخر ایک ہفتہ کی مہلت دی گئی۔ اور اس مدت کے اندر شیوخ جو کچھ اسباب لے جا سکے اُٹھا لے گئے۔ اور جو رہ گیا اُس پر برہان الملک کے سپاہیون نے قبضہ کیا۔ قلعہ مین جا کے رہنے سے پہلے اُس کے پاس ہی جہان خیمہ ڈال کے وہ رہے تھے وہاں ایک نوبت خانہ تعمیر کرا دیا جس مین دربار اودھ کے آخر عہد تک روزانہ چھ وقت نوبت بجتی رہی۔

اس کے بعد برہان الملک اجودھیا مین گئے۔ اور دریا کنارے وہ بنگلہ بنوایا جس کا حال ہم بیان کر چکے ہین۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ مین آتے اور قیام کرتے تھے۔ کیونکہ صوبہ کا مستقر یہی شہر تھا۔ اُن کے زمانے مین یہان کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ مگر یہ سب محلے اُن کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے۔ جہان مستقل سکونت کے لیے ان لوگون نے مکان بنانا شروع کر دیے۔ سید حسین خان کا کٹرہ۔ ابوتراب خان کا کٹرہ۔ خدایار خان کا کٹرہ۔ بزن بیگ خان کا کٹرہ۔ [illegible] فا بیگ خان کا کٹرہ۔ محمد علی خان کا کٹرہ۔ باغ مہانرائن۔ سرائے معالی خان اور اسمعیل گنج (جو مچھی بھون کے مشرق طرف تھا اب لکھنؤ [illegible]) سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کے لشکر گاہ ہین۔

نواب برہان الملک چھہی برس اودھ اور لکھنؤ مین رہنے پائے تھے کہ سنہ ۱۱۵۱ ہجری (سنہ ۱۷۳۸ء) مین نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت ہی تاکید کے ساتھ دہلی مین بلا لیے گئے۔ اُس پُرفتن زمانے مین جو کچھ واقعات گزرے اُن کو لکھنؤ سے تعلق نہین۔ لکھنؤ مین اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد نواب صفدر جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا مگر ابھی وہین تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی مین وفات پائی۔ اُن کے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اُٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبہ داری انھین دی جائے۔ لیکن راجہ لکھمی [illegible]

نے جو برہان الملک کے معتمد عہدہ داروں مین تھا نادر کی خدمت مین اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ "نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے - اور اسی لیے اُنھوں نے اپنی بیٹی اُن کو چھوڑ کے صفدر جنگ کو دی جو اُن کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی اُن کی طرف سے لکھنؤ مین موجود ہین - برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک اُن کا رہے - جسے چاہے عطا کرے - اس لیے کہ یہ کوئی ورثہ نہین ہے - یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بُردبار - خدا ترس - لائق اور وعدے کے سچے ہین - اور سپاہ اُن سے خوش ہے - قطع نظر اس کے حضور کے لیے برہان الملک نے دو ... دینے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اُس کے ادا کرنے کا انتظام نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے جس وقت حکم ہو حاضر کر دیے جائین - ان وجوہ سے امید ہے کہ حضور انھین کی سفارش فرمائین گے "

یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ نے صفدر جنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبہ داری لے لیا - اور اپنے ایک مصاحب اور دو سو سواروں کے ساتھ اودھ مین صفدر جنگ کے پاس بھیجا - یون خلعت صوبہ داری پہن کے صفدر جنگ نے دو دو کروڑ کا خزانہ نادر کے پاس بھجوا دیا - اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے -

صفدر جنگ کا پورا نام مرزا مقیم ابو المنصور خان صفدر جنگ تھا - گو اُن مین برہان الملک کی سی سچی بہادری - سادگی - راست بازی - اور جفاکشی نہ تھی مگر نہایت فیاض - بلند حوصلہ - رحم دل - رعایا پرور - اور منتظم تھے - شہر سے تین میل کی مسافت پر اُنھوں نے قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا - اور مچھی بھون کے اندر پنچ محلے کی جو قدیم عمارت تھی اُسے بھی شیخ زادون سے لے لیا - اور اُس کے عوض مین دو گانوان مین ۷۰۰ ایکڑ زمین شیخ زادون کو رہنے اور بسنے کے لیے عطا کی - جس سے اگرچہ شیخ زادون پر ظلم ہوا مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی - مچھی بھون کو صفدر جنگ نے از سر نو تعمیر کرایا - اور اُسے بہت درست کیا -

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبہ مین رہنے پائے تھے کہ دہلی مین اُن کی طلبی ہوئی - اور راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ مین چھوڑ کے وہ دہلی چلے گئے نول رائے علم دوست - وقت کا پابند - جفاکش - بہادر - اور بہت بڑا منتظم تھا - اور اس کے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی اُلو العزمی و فیاضی بھی دی تھی -

اُس نے ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پل تعمیر کرے۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے کے لیے گہرے کنوین کھدوائے۔ لیکن پائے بننا شروع نہین ہوئے تھے کہ اپنے آقا کی طلب پر اُسے فوج لے کے احمد خان بنگش کے مقابلہ کے لیے جانا پڑا۔ اس مہم میں وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا۔ مگر مارا گیا۔ اور پل کا کام جو چھیڑا تھا ناتمام پڑا رہ گیا۔

احمد خان بنگش اُس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اُس کے مقابلہ کے لیے برہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اُس کے حریف مقابل نہ ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور اُن کے ساتھ افاغنہ کی قوت ترقی کر گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤن مارے۔ خود شہنشاہ دہلی تک کو اُس کے مقابلے پہ لا کے کھڑا کر دیا۔ مگر اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور اُس کے اشارے سے حافظ رحمت خان نے اودھ کے شہرون اور قصبون مین لوٹ مار شروع کر دی۔ خیرآباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خان بنگش کا بیٹا محمود خان فوج لے کے چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کرے۔ سنہ ۱۱۶۵ ہجری (سنہ ۱۷۵۱ء) مین پٹھانون نے ملیح آباد مین اپنا تھانہ قائم کیا۔ اور سنہ ۱۱۶۵ ہجری (سنہ ۱۷۵۲ء) مین محمود خان کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر مین بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیون سے شہر خالی تھا جو چند تھے بھی پٹھانون کے آنے کی خبر سُن کے بھاگ کھڑے ہوئے اور پٹھانون کے کوتوال نے شہر مین آ کے بے اعتدالیان شروع کر دین۔

ان دنون شیخزادگان لکھنؤ مین سب سے زیادہ سربرآوردہ شیخ معز الدین تھے۔ وہ افاغنہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کے ملے۔ اُسی وقت کسی نے اُن سے جا کے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر و توہین کرتے ہین۔ اور کوئی اُس کا حکم نہین مانتا۔ شیخ معز الدین بولے "کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے مین جاتا ہون مفسدون کو سزا دون گا" یہ کہہ کے واپس آئے اور تمام بھائی بندون کو بلا کے کہا "پٹھانون کے قول و فعل کا اعتبار نہین۔ بہتر یہ ہے کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دین۔ اور مقابلہ کر کے پٹھانون کو یہان سے نکال دین" اس کے بعد شیخ معز الدین نے اپنے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی۔ اور سارے شیخزادون کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو [illegible]

پاس بٹھا کر اپنے مکان میں بٹھا دیا۔ اور منادی کرادی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے ان مقامات کو نوابی بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ ہی علی کے نام کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کیا اور لوگ اس کے نیچے آ آ کے جمع ہونے لگے۔

یہ حالات سن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شہزادوں نے جان توڑ کے مقابلہ کیا۔ اور اپنی جرأت مشہور شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔ پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بھاگے اور موقع پا کے شہزادوں نے پٹھانوں کو سارے ملک اودھ سے نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خان بنگش سے صلح ہو گئی تو سنہ ۱۱۶۲ ہجری ([illegible] ع) میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے۔ اور مہدی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک عالی مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور سجا۔ اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوئے لیکن اس کی مہلت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاؤ تھا کہ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیاں دہلی میں لے جا کے دفن کی گئیں جن پر نہایت ہی عالی شان مقبرہ موجود ہے۔ اور سیاحان ارض اسے آج تک عبرت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک قاضی صاحب کا فتویٰ

اس سے پہلے نمبر میں ہم فیض آباد کا ایک مذہبی اور علمی مناظرہ دکھا چکے ہیں اب کی یہ دکھاتے ہیں کہ انہیں دنوں وہاں ایک قاضی صاحب کے فتوے نے کیسا مزے کا جھما رنگ دکھایا۔

شجاع الدولہ کی وفات اور نواب آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے آنے کے بعد فیض آباد میں صرف معزز بیگموں کی بڑی بڑی سرکاریں رہ گئی تھیں۔ جن کی ذات سے شہر کی رونق ایک حد تک برقرار تھی۔ ان میں سب سے اول شجاع الدولہ کی والدہ نواب صدر النسا بیگم صاحبہ کی سرکار تھی۔ دوسری سرکار اُن کی بیوی جناب عالیہ متعالیہ نواب بہو بیگم صاحبہ کی سب سے بڑی سرکار تھی۔ تیسری بنی خانم صاحبہ تھیں یہ بھی شجاع الدولہ کی بیوی تھیں۔ دربار لکھنؤ سے پانچ ہزار ماہوار پاتی تھیں۔ اور اس کے علاوہ بہت سے

جواہرات اور لاکھوں روپیہ کا اندوختہ تھا - ان تینوں خاتونوں کے علاوہ برہان الملک کے خاندان کی تمام معزز و محترم بیگمیں فیض آباد ہی میں تھیں - جن میں سے ہر ایک کی بجائے خود ایک مستقل سرکار تھی -

بی خانم صاحبہ نے اپنی کسی پیش خدمت کی بیٹی نور جہان کو بڑی محبت اور لاڈ پیار سے پالا تھا - وہ بڑی خوبصورت تھی اور اُس کے ساتھ نہایت ہی شوخ و چالاک - جب بڑی ہوئی تو بی خانم کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی - دروازے پر ایک سید صاحب بچوں کی تعلیم پر نوکر تھے - اُنھوں نے اپنے بیٹے میر محمد صالح کے لیے پیام دیا - بی خانم نے اس نسبت کو اس خیال سے پسند کر لیا کہ لڑکی کہیں باہر نہ جائے گی - میرے ہی پاس بنی رہے گی - اور شادی ہو گئی -

یہ میر محمد صالح جاہل - بدصورت - بے عقل - متلوّن مزاج اور اللہ میاں کی گائے تھے - اور بی بی تھی آفت کی پرکالہ - جو بڑی ہی ہوشیار - عقل کی پتلی - شوخ و شریر - بامذاق و سخن فہم - اور اس کے ساتھ بلا کی خودرائے اور خدان تھی - میاں کو خطر ہی میں نہ لاتی تھی - اُس نے میاں کی کبھی نوکر سے زیادہ وقعت نہ سمجھی - یہاں تک کہ محمد صالح کی جورو ہونے پر شرماتی - اور کوئی منھ پر کہہ دیتا تو برا مانتی تھی - میاں نے ڈیوڑھی کی خاک اُڑا دی اور وہ کبھی پاس نہ پھٹکتی -

چند روز بعد بی خانم نے نور جہان کو اپنے گھر کا داروغہ کر دیا - اب سارا لینا دینا اُسی کے ہاتھ تھا - اندر باہر کی مالک تھی - روپیہ پیسہ خزانہ اور جواہرات جو کچھ سامان دولت تھا سب اُسی کے قبضے میں تھا - اِس سے اُس کا دماغ اور آسمان پر چڑھ گیا اور میاں سے کسی قسم کا تعلق ہی نہ باقی رہا - صورت دیکھنے تک کی روادار نہ تھی - بی خانم کے سگے بھائی آغا علی خان بیرونی کاروبار کے مختار تھے - اور محل میں اُن کی اکثر آمدورفت رہتی تھی - وہ شوخ ادا نور جہان پر ایک جان چھوڑ سو جان سے عاشق ہو گئے - دونوں کا تعلق نوکر چاکروں کے ذریعے سے باہر مشہور ہوا - اور ہر صحبت میں ان دونوں کے ناجائز عشق کا تذکرہ ہونے لگا -

بی خانم کی سرکار میں ایک اور عورت نوکر تھی جس کا نام ساجدہ [illegible] اُسے نور جہان نے کسی الزام پر برطرف کر دیا - وہ محل سے

مرزا شیخا کے گھر میں آئی جنھیں بہو بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا جواہر علی خان کی سرکار میں رسوخ حاصل تھا۔ اُس نے داماد کے سامنے اپنا دُکھڑا رو کے نور جہان کی آوارگیوں کا ذکر کیا۔ اور کہا "سارا فساد اُسی مُردار کا ہے۔" مرزا شیخا نے یہ سُنا تو انتقام لینے کے درپے ہو گئے۔

چند روز پہلے اتفاقاً ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس سے جواہر علی خان اور آغا علی خان کے دلون مین کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ آغا علی خان کا ایک حمام جواہر علیخان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اور وہین پر آغا علی خان کا مکان بھی تھا۔ جواہر علیخان نے اپنے آرام کے خیال سے کئی بار اُسی حمام کی مرمت کرا دی تھی۔ اُن کے اس تصرف سے آغا علی خان کو دل مین اندیشہ ہوا کہ یونھین مرمت کراتے کراتے جواہر علی خان اُس پر قبضہ نہ کر لین۔ اس اندیشہ کے مٹا دینے کے لیے اُنھون نے ایک رات اپنے آدمی بھیج کے اُس حمام کے روشندانون کے شیشے اور کھڑکیان تُڑوا ڈالین۔ اور جابجا توڑ پھوڑ کے اس قابل ہی نہ رکھا کہ اُس مین کوئی نہا سکے۔ جواہر علی خان کو یہ دیکھ کے بڑا ملال ہوا۔ ظاہر مین تو خاموش ہو رہا۔ مگر دل مین سوچنے لگا کہ آغا علی سے کیونکر اس کا بدلہ لے۔

اسی سوچ مین تھا کہ مرزا شیخا نے اپنی ساس کا دُکھڑا رونے کے ساتھ نور جہان اور آغا علی خان کی عشق بازیون کا حال بیان کیا۔ اور اسی وقت سے نور جہان اور آغا علی خان کے عشق کے خلاف سازش شروع ہو گئی۔ مرزا شیخا نے نور جہان کے شوہر میر محمد صالح کو اکیلے مین بُلوا کے کہا "تم بڑے بے غیرت ہو! اپنی جورو کی آوارگیان اور آغا علی خان کے ساتھ اُس کے ناجائز تعلقات سُنتے ہو اور دم نہین مارتے!" محمد صالح نے کہا "مین کیا کرون؟ میرا کچھ زور ہے؟ نہ مجھ مین طاقت ہے اور نہ میرے پاس دولت ہے۔ غریب کی کون سُنتا ہے؟ آغا علی خان قوت اثر روپیہ پیسہ سب ہی کچھ رکھتے ہین۔ اور میرے پاس کیا ہے؟ پہاڑ کے سامنے تنکے کی کوئی اصل وحقیقت ہے؟" مرزا شیخا نے کہا "اچھا ایک کام کرو۔ ایک عرضی جواہر علی خان کی معرفت بہو بیگم صاحبہ کے ملاحظہ مین پیش کراؤ جس مین یہ سب حال لکھا ہو۔ جواہر علی خان تمھاری چارہ جوئی بھی کرین گے اور تمھارا کچھ وظیفہ

بھی مقرر کرا دین گے۔ دوسری طرف تم یہ کرو کہ قاضی صاحب کے محکمہ مین کلی
درخواست پیش کر دو۔"

محمد صالح نے فوراً بہو بیگم صاحبہ کی خدمت مین عرضی دی۔ اور اُسی وقت
قاضی صاحب کے محکمہ مین رجوع کیا۔ قاضی ایک معمولی درجے کے مفتی تھے۔
اور اُن کی سماعت ہی کون کرتا تھا؟ درخواست دیکھتے ہی اُن کا دم نکل گیا
بولے "مین آغا علیخان کے خلاف کیا کر سکتا ہون؟ مجھے رہنے دو گے یا فیض آباد سے
نکلوا دو گے؟ مگر جواہر علی خان کی طرف سے اُنھین تسکین دی گئی۔ اور یقین دلایا گیا کہ
آپ فتوی تو دین ہم آپ کی پوری پوری مدد کرین گے"

اب ایک مناسب موقع پر جواہر علی خان نے وہ عرضی لے جا کے بہو بیگم صاحبہ
کو سنائی۔ اور پورا واقعہ سمجھایا۔ بہو بیگم سے اگرچہ بنی خانم سے بڑی ملاقات اور
رسم و راہ تھی۔ مگر آغا علی خان کی اس حرکت پر بہت بگڑین۔ اور کہا "مین شرع کے معاملے
مین کسی کی مروت نہ کرون گی۔ اس معاملے کو قاضی صاحب کے دربار مین پیش کرو۔ اور
سارے شہر والون کو بھی خبر کر دی جائے۔ جو خدا اور رسول کا حکم ہو گا وہی ہو گا"
یہ سب کچھ ہوا مگر بنی خانم کو ابھی تک کانون کان خبر نہ تھی۔ آغا علی خان نے
کچھ سُن گُن پائی مگر یقین نہ آیا کہ میرے مقابلے مین کوئی کارروائی کی جا سکے گی۔

آخر وہ دن آیا جو کارروائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ میر محمد صالح صبح ہی درخواست
لیے ہوئے قاضی صاحب کے پاس پہونچے۔ اور داد خواہ ہوئے۔ جواہر علی خان کی
شہ تو تھی ہی۔ قاضی صاحب نے فوراً زور و شور سے آ کے خود آغا علی خان
کی مسجد مین اپنا شرعی اجلاس جمایا۔ اور "بشارت" و "سعادت" نام بہو بیگم کی سرکار
کے دو خواجہ سرا بجا آوری احکام کے لیے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ اب
قاضی صاحب نے شرع کے مطابق فتوی دیا۔ اور اُس فتوے کی بنا پر ایک
قطعی حکم نامہ لکھ کے اُن دونون خواجہ سراؤن کے ہاتھ بنی خانم کے پاس بھیجا کہ
"نور جہان اسی وقت اپنے شوہر میر محمد صالح کے حوالے کر دی جائے جو
ہماری عدالت مین داد خواہ ہوا ہے۔ تعمیل حکم مین اگر تاخیر ہوئی تو مسلمان محل
مین گھس کے زبردستی حکم شرع کی تعمیل کرائین گے"

بی خانم اس وقت تک واقعات سے بے خبر تھیں یہ حکم نامہ پہونچا تو ششدر رہ گئیں - اور برافروختہ ہوکے بولیں "آئیں! محمد صالح کی بھی اتنی مجال ہوئی کہ معاذ میری مرضی کے خلاف کہیں درخواست دے! اور یہ قاضی موا دیوانہ تو نہیں ہوگیا ہے؟ نورجہان اور محمد صالح دونوں میرے نوکر ہیں اور میں ان کی مالک ہوں - جو چاہوں گی کروں گی - مونڈی کاٹا قاضی بیچ میں دخل دینے والا کون؟" یہ کہہ کے وہ حکمنامہ ہاتھ سے پھینک دیا - اور پروانہ کی خواجہ سرا دوں نے جیسے ہی واپس آکے یہ حال بیان کیا قاضی صاحب نے بے تحاشا غل مچایا "دین محمد! مسلمانو دین اسلام کی مدد کو دوڑو! اور میرا ساتھ دو!" اب کیا تھا جس نے سنا مرنے اور جان دینے پر تیار ہو گیا - اُس وقت گردوپیش جواہر علی خاں کی فوج کے لوگ تھے جو کالی وردیاں پہنے تھے - انھوں نے وردیاں اُتار اُتار کے پھینک دیں - اور سفید کپڑے پہن کے موجود ہو گئے - قاضی صاحب نے دین محمدی کا جھنڈا بلند کیا - اور بہت سے بے فکرے کندھوں پر جھنڈے رکھ رکھ کے آ گئے - غرض ہزاروں کا غول جمع ہو گیا - جو "دین! دین!" کے نعرے لگاتے ہوئے بی خانم کے مکان کی طرف چلے - آخوند احمد علی اپنا دربار جمائے بیٹھے تھے اور کچھ پیدل فوج اُن کے ساتھ تھی - دین دین کے نعرے سنتے ہی وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے - اُن کے بہت سے بھائی بند اور شہر کے خوش باش اُن کے غول میں آ ملے اور وہ کوئی تین سو آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کے لشکر مجاہدین میں آکے شریک ہو گئے - آگے بڑھے تو بہت سے تماشائی ہندو مسلمان بھی آ ملے -

الغرض یہ ہزارہا مجاہدین کا پُر شور گروہ بی خانم کی محلسرا کے قریب پہونچا - سڑک تنگ تھی - اور مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ لوگ گھُٹے اور بھچے ہوئے جا رہے تھے ہتھیاروں کے لے چلنے کی گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے سب لوگ ڈھالوں اور تلواروں کو ہاتھوں سے اوپر اُٹھائے اور سروں کے اوپر بلند کیے ہوئے تھے بی خانم کی ڈیوڑھی پر اس وقت ڈیڑھ سو سپاہی تھے جو اُن کے ملازم تھے انھوں نے جو ساری خدائی کو اپنے اوپر نرغہ کرکے آتے دیکھا تو جانیں

لے لے کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان صاف دیکھ کے ان لوگون نے محلسرا گھیر
لی۔ خواجہ سرا محل کے اندر گھس گئے۔ اور نورجہان جس جگہ بیٹھی تھی وہان پہونچ
کے اُسے گود مین اُٹھا لیا۔ اور باہر لا کے ایک ڈولی مین بٹھا کے پردہ باندھدیا۔ اور
بڑی شان و شوکت سے لے کے واپس چلے۔ بی خانم یہ تماشا دیکھتی رہ گئین۔
اُن کے بنائے کچھ نہ بنی۔ آغا علی خان اپنے گھر مین جا کے چھپ رہے جو بی خانم کی
محلسرا کے پچھواڑے تھا۔ اور نورجہان کو مجاہد بلوائیون نے لا کے خرم
خواجہ سرا کے مکان مین بند کر دیا۔

اب مجمع منتشر ہوگیا۔ لوگ اپنی دینی کامیابی اور اپنے زبردست غزا پر فخر
کرتے ہوئے گھرون کو گئے۔ قاضی صاحب نے اجرائے حکم شرع کے صلے مین جواہر علی
خان کی سرکار سے بھاری دوشالہ پایا۔ اور شوہر امیدوار محمد صالح کو پچاس
روپیہ دیے گئے کہ گھر گرہستی کا سامان درست کرے۔ اور اپنی جورو کو رکھے۔
گو نورجہان میان کی منھ سے صورت وقطع دیکھ کے کچھ ایسی جھلائی اور
صدیائی ہوئی تھی کہ اتنی آفت مچنے پر بھی محمد صالح کو چلا چلا کے کوستی اور
گالیان دیتی تھی۔ اور کسی کی کچھ پروا نہ کرتی تھی۔

تین چار روز کے بعد وہ جواہر علی خان کے حکم کے مطابق خُرم کے مکان سے
نکال کے ایک دوسرے مکان مین پہونچا دی گئی جو عنبر علی خان کے اصطبل سے
ملا ہوا تھا۔ اس اصطبل مین جواہر علی خان کے گھوڑے اور سائیس رہتے تھے۔
اس وقت تک تو نورجہان میان کو اُٹھتے بیٹھتے گالیان دیتی تھی مگر اب سوچ سمجھ کے
اُس نے وضع بدلی۔ اور میان کو شیشے مین اُتارنا شروع کیا۔ یکایک ایسی
محبت کرنے اور اس طرح جان فدا کرنے لگی کہ عقل کے پورے میان اُس کا دم
بھرنے لگے۔ یقین آگیا کہ یہ سچ مچ مجھ پر مرتی ہے۔ وہ جو کہتی منظور کر لیتے۔ اور جو
کام کہتی کرنے کو تیار ہو جاتے۔

نورجہان کی خوش نصیبی سے جس مکان مین وہ رکھی گئی تھی اُس کے کوٹھے کی
مغرب طرف ایک کھڑکی تھی۔ اور اُس کے مقابل حمام کے کوٹھے پر لکڑی کا
ایک اوٹ کھڑا تھا جس کے اُدھر آغا علی خان کی نشست رہا کرتی تھی۔ آغا علی خان

اوٹ کا ایک تختہ نکال ڈالا ۔ اور معمول ہوگیا کہ اُدھر اپنے کوٹھے پر نورجہان آ کے بیٹھتی ۔ اِدھر اوٹ کی آڑ میں یہ بیٹھتے ۔ اور دونوں میں دور ہی دور سے اشاروں میں باتیں ہوا کرتیں ۔ اب روز کا یہی مشغلہ تھا ۔ دونوں کو گھنٹوں بیٹھے رہتے ۔ اور جب دیکھیے اشارے بازیاں ہو رہی ہیں ۔

ان عاشقانہ دلچسپیوں کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ ملتان کے فوجدار میر غلام امام فیض آباد میں آئے ۔ اور عنبر علی خان کے مکان کے پھاٹک کے اوپر جو چھپر پڑا تھا اُس میں اُترے ۔ اس بالاخانے کے چھپر سے ان دونوں مکانوں کا سامنا تھا ۔ اُنھوں نے ان عاشقانہ اشارہ بازیوں کا سین دیکھا ۔ اور منشی فیض بخش مصنف تاریخ فیض آباد سے تذکرہ کیا ۔ اُنھوں نے چھوٹتے ہی جواہر علی خان کو خبر کی ۔ اور اُس نے اپنے سائیسوں کو بُلا کے حکم دیا کہ ”نورجہان جس مکان میں رہتی ہے اُس کے کوٹھے کی کھڑکی بند کروا دو ۔ اور دیکھتے رہو کہ پھر کبھی نہ کھلنے پائے ۔“

اب وہ دور کی نظر بازیاں بھی موقوف ہوئیں جن سے دونوں ہجران زدہ دلوں کی تھوڑی بہت تسلی ہو جایا کرتی تھی ۔ جب روزن در بھی بند ہو گئے اور دیدار یار کی کوئی صورت نہ نظر آئی تو نورجہان نے احمق میاں ہی سے کام لے کے دوسرا راستہ نکالا ۔ ایک دن جواہر علی خان کے پاس اُس کا شوہر محمد صالح آیا ۔ اور بیوی کی طرف سے پیام دیا کہ ”اُنھوں نے حضور میں عرض کیا ہے کہ میں اس مکان میں اکیلی گھٹ گھٹ کے مری جاتی ہوں ۔ نہ کوئی یہاں آنے والا ہے نہ کوئی جانے والا ۔ کوئی اتنا بھی نہیں جس سے دو گھڑی باتیں کر کے دل بہلاؤں ۔ لے دے کے جو کچھ ہیں میاں ہیں وہ بھی اکثر حضور میں حاضر رہتے ہیں ۔ پھر کہیے میں کیا کروں ؟ اور کیونکر دل بہلاؤں ؟ اور نہیں تو اتنی ہی اجازت دیجیے کہ یہاں شہر میں میری ایک جان پہچان والی ہیں وہ بھی کبھی کبھی ڈولی میں بیٹھ کے میرے پاس چلی آیا کریں ۔“ اس درخواست کے ساتھ نورجہان نے اس قدر خوشامد کروی تھی کہ جواہر علی کا دل نرم ہو گیا ۔ اور اُس نے اجازت دے دی کہ ڈولی پر بیٹھ کے جو عورت آئے نہ روکی جائے ۔ اور اُسے آنے جانے اور رہنے کی

اجازت ہے - اس اجازت کے مطابق اکثر ایک ڈولی کی آمد و رفت رہتی - اور جو نیکبخت آتیں دو دو تین تین دن رہ کے چلی جاتیں اور کوئی تعرض نہ کرتا -

اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد نور جہان نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ مرزا اشیخا کو اپنا دوست اور طرفدار بنالے - اُن کے پاس چپکے سے کہلا بھیجا کہ اگر مین پھر بنی خانم کے محل مین پہونچ گئی تو وعدہ کرتی ہون کہ تمھاری ساس کو دوبارہ نوکر رکھوا دون گی - اور اسی قدر نہین بلکہ ان کی تنخواہ بھی کچھ بڑھوا دون گی - مرزا اشیخا لالچ مین آ گئے - اور ایک دن رات کو سب کی آنکھ بچا کے نور جہان سے ملے - باہمی دوستی و اتحاد کا اقرار کیا - اور دونون مین پکے دل مضبوط عہد و پیمان ہوا - اور مرزا اشیخا نے کہا "مجھ سے جہان تک بنے گا آپ کو آزادی دلانے کی کوشش کرون گا" اس عہد و پیمان کے بعد نور جہان نے آغا علی خان کے پاس کہلا بھیجا کہ مین نے اپنے میان اور مرزا اشیخا دونون کو ہموار کر لیا ہے - اب تم خانم صاحبہ سے کہو کہ میرے بلانے کی کوشش کرین -

کامیابی کا یہ پہلو نکلتے ہی آغا علی خان نے بھی محمد صالح کو بلا کے اس پر پچارا پھیرا - ایسی باتین بنائین کہ وہ اُن کا دم بھرنے لگا - اور اُنھون نے زیادہ دلدہی کے لیے بیس روپیہ مہینہ اُس کی تنخواہ بھی مقرر کر دی - اور اُس کے بعد جا کے بنی خانم کو نور جہان کا پیام دیا -

بنی خانم کے بھی دل سے لگی ہوئی تھی فوراً تیار ہو گئین - اول تو اُنھین اپنے گھر کے کاروبار مین جتنا بھروسا نور جہان پر تھا کسی پر نہ تھا - اُن کے کام جیسے نور جہان سے نکلتے تھے کسی سے نہ نکلتے تھے - اُس کی جگہ پر جو عورت اب کام کرتی تھی اُس سے وہ خوش نہ تھین - اور بات بات پر نور جہان یاد آتی تھی علاوہ اس کے جن زبردستیون کے ساتھ نور جہان اُن سے چھینی گئی تھی اُس مین اُنھین اپنی سبکی اور بے وقعتی نظر آتی تھی - اس کا خار دل مین تھا - اور کہتی تھین کہ کسی طرح ہو جو آغا علی خان سے اس کا بدلہ ضرور لون گی - بہر تقدیر نور جہان کا پیام سنتے ہی تیار ہو گئین اور اُسی وقت سوار ہو کے بہو بیگم صاحبہ کے پاس پہونچین - دو تین دن وہان رہین - چوتھے دن بہو بیگم کے سامنے یہ معاملہ چھیڑا

اور کہا آپ جانتی ہیں کہ محمد صالح میرا خانہ زاد اور میرے غلام کا لڑکا ہے۔ اور
اُسے اس میں کچھ عذر نہیں کہ نورجہان میرے پاس رہے جس کے بغیر مجھے بڑی
تکلیف ہے۔ جو کچھ فساد ہے اور پرواؤں کا ہے" بہو بیگم نے پوچھا محمد صالح اس پر
راضی ہے کہ اُس کی جورو تمھارے یہاں رہے؟" بی خانم بولیں "میرے
کہنے کا یقین نہ ہو تو حضور خود اُس سے بُلا کے دریافت فرما لیں۔ بلکہ ڈیوڑھی پر
حاضر ہے پوچھوا لیجیے"

محمد صالح اس سازش میں پڑ کے دس بارہ دن سے جواہر علی خان کے پاس
نہیں گیا تھا۔ اور بی خانم کا طرفدار تھا۔ اس وقت جو بیگم صاحب نے دریافت
کرایا تو اُس نے بی خانم کے بیان کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ اُس کا
بیان سُن کے بہو بیگم صاحبہ بولیں "جب اُسے نورجہان کے تمھارے یہاں
رہنے میں اطمینان ہے تو پھر کون روک سکتا ہے؟ اُسے اختیار ہے جہاں چاہے
لے جا کے رکھے" اس حکم پر بی خانم کو اطمینان ہو گیا اور نورجہان کو اپنے ساتھ
لے کے سوار ہونے کو تھیں۔ دروازے پر گاڑی کھڑی تھی۔ جلوس کے سوار بھی
وردیاں پہنے ہوئے تیار تھے کہ پانی برسنے لگا۔ اور انھیں ٹھہرنا پڑا کہ مینھ
تھمے تو سوار ہوں۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اور جواہر علی خان مغرب کی نماز پڑھ کے بیٹھا ہی تھا
کہ ایک سائیس نے کہا "نورجہان بھاگ گئی! ہم سب سمجھے کہ جو بی بی اکثر آیا کرتی
تھیں وہی ڈولی میں سوار ہو کے جا رہی ہیں۔ لیکن جب دیر تک مکان میں سناٹا
رہا تو ہمیں شک ہوا۔ جا کے پکارا اور کوئی نہ بولا۔ تب اندر جا کے دیکھا۔ اور
معلوم ہوا کہ وہ ہمیں جُل دے کے نکل گئی" جواہر علی خان نے حکم دیا کہ "جاؤ
ڈھونڈھو۔ اور جہاں ہو لے آؤ" اتنے میں مرزا شیخا آ گئے۔ اور جواہر علی خان
نے اُن کی طرف دیکھ کے جوش کی آواز میں کہا "حضور عالیہ بیگم صاحبہ نے خدا ترسی
کی راہ سے آل نبی کی خبر لی تھی اور اس کا انھیں اجر خدا دے گا۔ اب اُسے
اختیار ہے جو چاہے کرے مگر ہم نے اُس کے حق میں اچھا ہی کیا تھا" یہ کہہ کے
اُس نے سپاہیوں اور جاسوسوں کو بلا کے حکم دیا کہ سارے شہر میں چیر کے

پتہ لگاؤ کہ یہ عورت کہاں گئی ہے"۔ صدہا آدمی ہر طرف پھیل گئے۔ اور گلی کوچوں میں ہر جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ ہونے لگی۔

یہ ہو ہی رہا تھا کہ بہو بیگم کی ڈیوڑھی کے پہرے کے سپاہیوں میں سے ایک نے ان کو خبر دی کہ کوئی آدھا گھنٹہ ہوا نورجہاں محل کے اندر داخل ہوئی ہے اور عنقریب بنی خانم اُسے گاڑی میں ساتھ بٹھا کے اپنے گھر لے جانے والی ہیں" یہ سنتے ہی جواہر علی خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حکم دیا کہ "خبردار جانے نہ پائے جو کچھ ہو گا میں سمجھ لوں گا۔ بنی خانم اپنے گھر میں پہونچ بھی جائیں تو بھی تم بلا تامل گاڑی میں ہاتھ ڈال دینا۔ نورجہاں بیگم کو گاڑی سے نکال لینا۔ اور چاہے پانی برسے۔ بجلی گرجے۔ بادل کڑکے جو ہو تم اُسے اسی وقت پکڑ کے میرے پاس حاضر کر دینا"

جواہر علی خان کا حکم کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ بے قاعدہ فوج کے ہزاروں سپاہی سڑکوں پر پھیل گئے۔ اور منتظر تھے کہ بنی خانم کی گاڑی آئے اور دھاوا کر دیں۔ لیکن بنی خانم کے لوگوں نے اس ناکہ بندی کی خبر انھیں پہونچائی۔ سنتے ہی انھیں بھی ضد ہو گئی۔ دل میں کہا "اب تو میں لے ہی کے جاؤں گی" چلتے چلتے رک گئیں اور سارے واقعات جا کے بہو بیگم سے کہہ دیے۔ انھوں نے برہم ہو کے ایک خواجہ سرا کی زبانی جواہر علی خان کے پاس کہلا بھیجا "تمھیں کیا ہو گیا ہے جو راستہ روکتے ہو؟ اپنی اس بیہودہ ضد کو چھوڑ دو"

جواہر علی خان اس وقت اس قدر غصہ میں بھرا ہوا تھا کہ آپے سے باہر تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بہو بیگم میری آقا اور مالک ہیں۔ اور میں اُن کا غلام ہوں۔ بیگم صاحبہ کے پیام کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ جب محل کا خواجہ سرا واپس جا چکا تو اپنے سرداران فوج کو دوبارہ تاکید کی کہ "خبردار بنی خانم جانے نہ پائیں۔ تم لوگ اُسی طرح مستعد رہو۔ میں منع بھی کر دوں تو تم نہ ماننا۔ بے تکلف گاڑی پکڑ لینا۔ اور کہنا ہم نہ جواہر علی خان کو جانتے ہیں نہ کسی اور کو۔ ہم تو مسلمان ہیں۔ اور ہمارا دین اسلام ہے۔ زیادہ روک کی گئی تو ہم غدر مچا دیں گے اور سید کی جائز منکوحہ کو اُس کے آشنا سے چھین کے شوہر کے حوالے کر دیں گے۔

پھر وہ جانے اور اس کا کام جانے - دین کا حکم ہے کہ ہم چاہے مر جائیں مگر میدانی سید ہی کے پاس رہے گی"

ہو بیگم صاحبہ کو جب معلوم ہوا کہ جواہر علی خان نے کچھ جواب نہیں دیا تو حیرت میں ہو گئیں - کیا کرین کسی اور خواجہ سرا کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ جواہر علی خان کا وہ مقابلہ کر سکے - بار بار جواہر علی خان ہی کے پاس آدمی بھیجتی تھیں اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا - غصہ میں بھرا بیٹھا تھا - منھ میں کف تھا - اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے - آخر دیر تک کے نامہ و پیام کے بعد جواہر علی خان نے قبول کیا کہ "اگر خود محمد صالح آ کے کہہ دے کہ میں نے اپنی جوڑو کو پایا - اور اسے جہاں چاہوں گا لے جا کے رکھوں گا تو میں نہ روکوں گا بیشک نورجہان کو لے جائیں - لیکن بغیر اس کے نورجہان کو کوئی نہیں لے جا سکتا"

اس قرارداد کے مطابق محمد صالح کی تلاش شروع ہوئی - اُس سے لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ "جواہر علی خان کے سامنے نہ جانا وہ تمھیں مار ہی ڈالیں گے" یہ سنتے ہی ایسا بدحواس بھاگا کہ ایک ذلیل جھانجھ بجانے والے کے تنگ و تاریک مکان میں جہاں اندھیرا گھپ تھا - دبک کے بیٹھ رہا - اور ڈر کے مارے زور سے سانس بھی نہ لیتا تھا - چاروں طرف لوگ اُسے ڈھونڈھتے پھرتے تھے اور اُس نے ایسی چپ سادھی تھی کہ کسی طرح سراغ نہ لگتا - بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے ملا - اور لوگ کھینچتے ہوے پھاٹک پر لاے - یہاں پہونچتے ہی اُس نے دوہائیاں دینا شروع کیں کہ "لِلّٰہ مجھے جواہر علی خان کے سامنے نہ لیجاؤ!"

آخر جواہر علی خان کی نظر قہر سے بچنے کے لیے وہ ایک ڈولی میں بٹھایا گیا جس میں پردہ باندھ دیا گیا - اور پردہ کی بو بو بنا کے ڈیوڑھی میں لایا گیا - جواہر علی خان بھی اب معمول کے موافق محل کے اندر آ چکا تھا اُس کے سامنے محمد صالح نے پردے کے اندر سے چلّا کے کہا "خدا حضور کو سلامت رکھے! حضور کی مہربانی سے مجھے اپنی جوڑو مل گئی - اور اب چاہتا ہوں کہ وہ بنی بیگم صاحبہ ہی کے پاس رہے وہ میری آقا اور میرے جان و مال کی مالک ہیں"

خوش عقیدہ مصنف تاریخ فرح بخش کا بیان ہے کہ جیسے ہی یہ کلمات محمد صالح

کی زبان سے نکلے بادل زور سے گرجا- بجلی کڑک کے زمین پر گری- جواہر علی خان کی زبان سے بے تحاشا آہ نکل گئی- اور جتنے لوگ کھڑے تھے بہوت ہشند رہ گئے-

اب کیا تھا بہو بی خانم نورجہان کو لیے کے اپنے گھر پہونچین- اپنی کامیابی پر خوشیان منانے لگین- نورجہان کے یہان گھی کے چراغ جلائے گئے- اور آغا علی خان کی آرزو بر آئی- اب نہ کہین قاضی صاحب کے نوحے اور شرعی فیصلے کا پتہ تھا نہ وہ دین محمدی کا جھنڈا بلند تھا- اور نہ فیض آباد مین وہ "دین دین" کے نعرے بلند ہورہے تھے- لیکن ہان اس واقعے کے طفیل مین بارھوین صدی ہجری کے آخر کی ایک شرعی عدالت کی وضع- حالت- شان اور حکومت نظر آگئی-

چیچک کا ٹیکا اور لیڈی مانٹگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیچک کا ٹیکا جو آج دنیا مین خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے دراصل ایک مشرقی علاج ہے- اور غالباً مسلمانون ہی سے لیا گیا ہے

ہم ہندوستان مین دیکھتے ہین کہ کامیابی کے اتنے تجربون کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکا لگائے جانے کے خوف سے مائین بچون کو چھپاتی پھرتی ہین- پرانے مذاق کے باپ بھائی نہنے بچون کے لیے ٹیکا لگانے والون سے کشتیان لڑنے یا انھین رشوتین دینے کو تیار ہوجاتے ہین- بڑے بڑے مہذب لوگون تک کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہین اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کرکے ٹیکے کے رواج دینے پر مختلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہین- اور یہ نہین پسند کرتے کہ اس لاکھون دفعہ کے آزمائے ہوئے علاج سے فائدہ اُٹھایا جائے-

اُن کی اس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہین کہ یہ طریقہ علاج انھین کے یہان سے سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے- اور تعجب آتا ہے کہ اپنی ہی چیز اگر غیرون کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر اجنبی

اور تہذیب پر حیا ہی ہے ؟

ٹیکا کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور مہذب دانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی مانٹگو میری ورٹلی تھا - وہ سنہ ۱۱۹۱ہجری (۱۶۹۰ء) میں انگلستان کے علاقہ نوٹنگھم شائر میں پیدا ہوئی تھی - اعلیٰ درجہ کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی اس لیے اچھی صحبت میں نشو ونما ہوا - اُس کا باپ ڈیوک آف کنگسٹن روشن خیال اُمرائے انگلستان میں تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی - اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان میں بہت اچھا درجہ حاصل کر لیا اور بڑی نمایان ترقی کی -

بائیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالمند نوجوان ایڈورڈ ورٹلی مانٹگو کے ساتھ شادی ہو گئی جو پہلے ارل آف سینڈ وچ کا فرزند تھا - مسٹر مانٹگو نے پارلیمنٹ میں چمکنا اور نمود حاصل کرنا شروع کیا - چند ہی روز میں وہ بڑا قابل آزاد اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا - مشہور شاعر ایڈیسن سے اُس سے بڑی دوستی تھی - اور انگلستان کے اعلیٰ درجہ کے مدبران سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا -

سنہ ۱۱۲۵ ہجری (سنہ ۱۷۱۶ء) میں مسٹر مانٹگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہو کے دولت عثمانیہ کے دار السلطنت کو روانہ ہوئے اور لیڈی میری مانٹگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی - جہان دونون میان بیوی کو دو سال تک رہنا پڑا -

قسطنطنیہ میں انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے ہون گے مگر مسٹر مانٹگو نے محض اپنی بی بی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہین نصیب ہوئی تھی - لیڈی میری یہان ترکی اُمرا کے خاندانون سے ملین اُن کے حالات دریافت کیے - اور جو کچھ واقعات معلوم ہوتے اُنھین لکھ کے لنڈن میں اپنے دوستون کو بھیجا کرتین - یہ خطوط اس قدر عجیب تھے کہ لوگون نے شوق اور قدر سے جمع کیے - اور ہر طرف لوگون میں اُن کے

پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

قیامِ قسطنطنیہ کے زمانے ہی مین لیڈی میری مانٹگو کو پتہ لگا کہ یہان کے بعض گاؤن مین چیچک کے روکنے کے لیے بعض مائین اپنے بچون کے ٹیکا لگایا کرتی ہین۔ اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھون نے اُن گاؤن مین جا کے دریافت کیا جو عورتین اس کا طریقہ جانتی تھین اُن سے مل کے کیفیت معلوم کی۔ اُن لڑکون کو دیکھا جن کے ٹیکا لگایا گیا تھا۔ خوب اچھی طرح آزما لینے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکا لگایا۔ اور دیکھا کہ وہ چیچک سے بالکل محفوظ رہا۔ تب اُنھون نے آزمایش کے لیے اور بہت سے لڑکون کے ٹیکا لگایا۔ اور پھر اُسے عام لوگون مین پھیلانے لگین۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ مین اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہوگیا۔ اور لوگ اس خلقی علاج کی قدر کرنے لگے۔

سنہ ۱۱۴۶ ہجری (سنہ ۱۷۱۸ء) مین لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئین۔ اور مقام ٹوئی کنہم مین بود و باش اختیار کی۔ اب یہان اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہوگیا تھا۔ اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت مین بسر کرتی تھین مگر یہان کبھی اُنھین شب و روز ٹیکے کے رواج دینے ہی کی فکر رہا کرتی تھی۔

اس کے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی۔ اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور عالی دماغ شاعر ہونے کے جذبے مین آ کے لیڈی میری کی ہجو مین چند شعر کہہ ڈالے جن مین اُن کے اخلاق پر حملہ کیا۔ اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسلمہ ناموری۔ قابلیت۔ پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک مین ملا دین۔ مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل مین خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشعار کو گمنام طور پر شایع کیا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے شعر ہین تو انکار کر دیا۔ لیکن ایسی باتین کہین چھپائے چھپتی ہین ہر جگہ شہرت ہوگئی کہ یہ شعر اصل مین پوپ ہی کے ہین۔ مگر چونکہ بے اصل و حقیقت ہین اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہین۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی

ہوئی - عام لوگون نے اُن کی اس حرکت کو ناپسند کیا - اور اُلٹے اُنھیں کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے -

اب ۱۱۶۹ہجری (۱۷۳۹ء) شروع ہوا - اور لیڈی میری کا سن ۴۹ سال کا تھا - طبیعت ناساز رہنے لگی - اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہین ہے - تبدیل آب و ہوا کے لیے اٹلی کا سفر کیا - وہان شہر وینس میں جا کے اقامت گزین ہوئین - اور صحت برقرار رکھنے کے لیے اس طرح پاؤن توڑ کے بیٹھین کہ ۲۲ سال وہین گزر گئے - ۱۱۸۳ ہجری مین گئی تھین اور ۱۱۹۰ ہجری (۱۷۶۱ء) مین ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التعظیم خاتون بن کے پھر انگلستان مین آئین - اس لیے کہ اُن کی صاحبزادی لیڈی بیوٹ نے تاکید سے بلایا تھا - مگر عمر پوری ہو چکی تھی - تندرستی نے جواب دے دیا - اور وطن مین آ کے شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہون گی کہ ۱۱۹۱ ہجری (۱۷۶۲ء) مین دنیا سے رخصت ہو گئین - اور ناموری و نیکوکاری کے رجسٹر مین اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی مین جا پہونچین -

مگر دنیا مین اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگارین ہمیشہ باقی رہین گی - جن مین سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ رکھنے کو کافی ہے - ایک تو چیچک کا ٹیکہ جس سے اب ساری دنیا نفع اُٹھا رہی ہے - اور ہندوستان ہی نہین دنیا کے ہر ملک کے گاؤن گاؤن مین لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتون سے نوع انسان کو نفع پہونچا رہی ہے -

علاوہ دوسری یادگار اُن کے وہ خطوط ہین جو اُنھون نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے - انگلستان کے لوگون مین اُن کے مطالعہ کا شوق اس قدر بڑھا کہ اُن کی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۱۹۲ ہجری مین وہ خطوط تین جلدون مین مرتب و مدون ہو کے چھپے اور شایع ہوئے - چند روز بعد لوگون کو کچھ اور خطوط ملے - اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شایع ہو گئی - ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیرین تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے - خصوصاً اس لیے کہ ترکون کے قومی خصائل معلوم ہونے کا یورپ مین

جس قدر شوق تھا اُسی قدر حالات سے لاعلمی تھی - لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل و تحقیق سے آل عثمان کے حالات نہین بتائے تھے - بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکون کے حالات مین جو پہلی کتاب انگلستان مین شایع ہوئی یہی تھی - لوگون نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلا دیے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز مین ختم ہو گیا - دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے مین فروخت ہو گئی - غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے یہان تک کہ سنہ ۱۸۰۳ء (سنہ ۱۲۳۲ ہجری) مین یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۴۱ برس بعد اُن کے صاحبزادے نے از سرنو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چارون جلدون اور اپنی مان کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلی درجے کا ایڈیشن شایع کیا -

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورٹلی مانٹگو کی نسبت کہتے ہین کہ دماغ بگڑا ہوا تھا - امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی - جب دل مین آتی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے - اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوتا - دوسرا کمال اُن مین یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی - غلط اور بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکت الفاظ سے بیان کرتے اور ایسے تعلقے باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آجاتا - اس مین اس قدر ملکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بنا کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے - مگر بھاگنا قیامت تھا - پہلی بار بھاگے تو گھر والون کو ملنے سے یاس ہو گئی چند روز بعد پتہ لگا کہ آپ ایک چمنی سوئی پر کے نوکر ہین - انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے مین آتش خانہ بنا ہوتا ہے - اُس مین سے دھوان نکلنے کے لیے جو نل دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چمنی کہتے ہین - اس چمنی مین دو چار مہینے مین اتنا کاجل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے - اس لیے وہان بہت سے لوگ چمنی سوئیپری یعنی چمنیون مین سے کاجل جھاڑنے کا کام کرتے ہین - ان لوگون کے کپڑون مین چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا رہتا ہے اس لیے

حد سے زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں - اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ میلا ہو اُسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے - غرض حمی سے دُہروان سے زیادہ ذلیل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا - مگر آپ کو جو شِ خاکساری میں یہی پیشہ سب سے زیادہ پسند آیا -

لوگون کو معلوم ہوا تو سمجھا بجھا کے گھر میں لے آئے - لیکن چند روز بعد پھر رفوچکر ہو گئے - اب کی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں - اور اُس کے ساتھ کشتی میں بیٹھے مچھلیان پکڑتے ہیں - لوگ گھیر گھار کے پھر لائے مگر تھوڑے زمانے کے بعد پھر چمپت ہو گئے - اب کی شاید ان کے مطبوعہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے ترکون کی طرح رہنے لگے - اُنھیں کی وضع اختیار کر لی - اُنھیں کے سے کپڑے علانیہ پہننا شروع کیے - اُنھیں کی سی ٹوپی اور دستار سر پر تھی - اور چونکہ اُن کی پوری پوری معاشرت اختیار کر لی تھی اس لیے ہمیں امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہون گے - لہذا ہم اُن کے حق میں دعاے مغفرت کر کے سلسلۂ بیان کو ختم کرتے ہیں -

---

ریویو

مقالات سرسید - شیخ ضیاء الحق صاحب جن سے پبلک خوب واقف ہے اور چند سال ہوئے اخبار پیشوا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پبلک کے اسٹیج پر نمایان ہوئے تھے فی الحال اُنھون نے ایک نہایت اہم اور مفید کام شروع کیا ہے - جس سے امید ہے کہ قوم کے اخلاق و تمدن ہی نہیں قومی لٹریچر کے حق میں بھی نہایت سودمند ثابت ہوگا - اُنھون نے سرسید مرحوم کے تصانیف اور ملفوظات سے وہ تمام اقوال جو ملکی و قومی اتحاد و اتفاق - اخلاقی تمدنی معاشرتی قربانی - علمی و ادبی و مذہبی اصول تعلیم و تربیت وغیرہ کے متعلق ہیں جن کے جدا جدا مرتب کیے ہیں - تاکہ وہ ایک نئی ترتیب سے ابناے وطن کے سامنے پیش ہون اور اُن سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے - ان میں سے وہ حصہ جس میں ہندو مسلمانون کے اتحاد پر سرسید مرحوم کے اقوال یکجا

کردیے گئے ہیں بطور ایک حصۂ کتاب اور اشتہار کے جداگانہ شایع کردیا گیا ہے جس کی قیمت صرف ۲ ؍ رکھی گئی ہے۔ پوری کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) ہوگی جو زیر طبع ہے - درخواستین مصنف صاحب کے پاس پہنچ جانی چاہئیے تاکہ انھین کے اندازے سے پہلا ایڈیشن تیار کیا جائے۔ مصنف صاحب کا پتہ "لاہور اندرون موری دروازہ - مقابل خالصہ ہائی اسکول" ہے۔

رومۃ الکبریٰ

ہمارا یہ نیا ناول بفضلہ تعالیٰ مکمل اور تیار ہوگیا - اس کی قیمت بجائے خود سوا روپیہ عہ؍ ہے - مگر سنہ ۱۹۱۳ء کے خریداران دلگداز کی خدمت مین بلا قیمت نذر کیا جائے گا - اس پرچہ کے شایع ہونے کے بعد ہی اُس کے وی - پی روانہ ہونا شروع ہوجائین گے سنہ ۱۹۱۴ء کا چندۂ دلگداز ڈیڑھ روپیہ ہے اور محصول ملا کے ۳ہر لہذا ہر وی - پی ایک روپیہ گیارہ آنے (عہ ۱۱؍) کا ہوگا - جن صاحبون کو لینے مین کوئی عذر ہو فوراً تحریر فرما دین تاکہ نقصان نہ اُٹھایا جائے - اور جو جب تک وی پی کے لینے کے لیے تیار رہین اگر کسیں باہر جانے والے ہون یا جنھین گھر پر موجود نہ رہنے کا خیال ہو اپنے عزیزون اور نوکرون کو بتا دین کہ وہ دلگداز کے وی - پی کو آتے ہی قبول کرلین - ڈاکخانے کا طرز عمل ایسا ہے کہ اُن کی ذرا سی بھی غفلت ہمین اور اُن کو بہت پریشان کرتی ہے - اور دونون مین سے کسی نہ کسی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

خاکسار مہتم دلگداز

اطلاع

جملہ خریداران دلگداز کی خدمت مین التماس ہے کہ خط و کتابت مین اپنا نمبر خریداری لازمی طور پر بتا دیا کرین جو اُن کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے رجسٹرڈ نمبر ۱۳۱۲ ڈاکخانہ کا نمبر ہے اس کے حوالہ کی ضرورت نہین - اگر نمبر کا حوالہ نہ ہوگا تو ممکن ہے جواب مین تاخیر ہو یا جواب ہی نہ دیا جاسکے۔

منیجر دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

نمبر ۴ — جلد ۱۶

اپریل سنہ ۱۹۱۴ عیسوی - مطابق ثور سنہ ۱۳۳۲ قمری

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس میں چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

محمد علی پاشا

موجودہ وارثانِ دولت فراعنۂ قدیم اور خدیوانِ مصر کے خاندان کا پہلا بانی یہی محمد علی پاشا تھا۔ یہ نامور شخص دنیا کے اُن ممتاز لوگون مین سے ہے جنھون نے ادنیٰ درجۂ ذلت سے ترقی کرنا شروع کی۔ اور بڑھتے بڑھتے اپنے آپ کو انتہائی درجۂ کمال پر پہونچا دیا۔ انھین لوگون کے حالات دیکھ کے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر انسان مین طلب صادق اور سچی مستعدی ہو تو اپنے لیے ترقی کی راہین خود ہی پیدا کر لیا کرتا ہے۔ اور کوئی دشواری اور مزاحمت اُس کو آگے بڑھنے سے نہین روک سکتی۔

یہ محمد علی صوبۂ البانیا کے لوگون مین سے تھا جنھین ترک لوگ ارناؤط کہتے ہین۔ البانیا جزیرہ نمائے بلقان کے جنوب و مغرب مین ہے۔ سارا ملک کوہستانی ہے۔ گویا پیچیدہ سلسلہ ہائے کوہ کی ایک نہ سلجھنے والی گتھی ہے۔ اور ویسی ہی پولیٹیکل گتھی اُس کی موجودہ حالت بھی ہو رہی ہے۔ اس سنگستانی سرزمین مین درشت مزاج جفاکش اور ایسے خیرہ سر لوگ رہتے ہین جو بات بات پہ بگڑتے اور دل مین ٹھان لین تو ہر مشکل کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتے ہین۔ ابھی تک تو اس سرزمین مین مسلمانون کی تعداد عیسائیون سے

زیادہ تھی۔ مگر آیندہ کی نسبت خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعصب نصاریٰ اسے بلقان مسلمانوں کو طرح طرح سے فنا کر کے اپنا کثرت بڑھانا چاہتے ہیں۔ دولت عثمانیہ میں حمایت دین کی قوت نہیں۔ اور دول یورپ کا نازک دل گو کہ ہر حصہ ارض کی ادنیٰ بے اعتدالی پر دُکھ جاتا ہے مگر مسلمانوں کی مظلومی پر نہیں پسیجتا۔

الغرض محمد علی اسی ملک کا ایک بہت ادنیٰ اور معمولی درجہ کا کسان تھا۔ اُس کسانی میں بھی اتنی حیثیت نہ تھی کہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پال سکتا۔ اس لیے ترک وطن کر کے رومیلیا یعنی اُس صوبہ میں چلا آیا جس میں خاص قسطنطنیہ واقع ہے۔ اور شہر قبالہ میں ایک چھوٹی سی ادنیٰ درجے کی دُکان کھول دی۔ لیکن جس طرح کسانی اس کے لیے کسب معیشت کا کافی ذریعہ نہ تھی دُکانداری بھی نفع بخش نہ ہوئی۔ مجبوراً تجارت کو بھی خیرباد کہی۔ اور ہنوز سترہ اٹھارہ سال ہی کی عمر تھی کہ دُکان بند کر کے فوج میں نوکری کر لی۔ اب وہ اُس ڈھرے پر پڑا جسے تقدیر نے اُس کی ترقی کا راستہ مقرر کر رکھا تھا۔ بس اسی وقت سے وہ یوماً فیوماً عروج پانے لگا۔

اتفاقاً اُن دنوں کاندیا یعنی کریٹ کے دریائی ڈاکوؤں نے سر اُٹھایا تھا۔ دولت عثمانیہ نے ان جری لٹیروں کی سرکوبی کے لیے جو فوج بھیجی اُس میں محمد علی بھی تھا۔ وہاں بغاوت کے فرو کرنے اور سرکشوں کے ہموار کرنے میں اس سے ایسی بہادری اور جانبازی ظاہر ہوئی اور اُس نے ایسی شجاعت کے ساتھ ہوشیاری و دانائی سے کام لیا کہ اُس کے افسر بے انتہا خوش ہوئے۔ باب عالی میں اُس کے نمایاں خدمات کی رپورٹ کی۔ اور سلطنت اُس کی قدردانی و قدرافزائی پر آمادہ ہو گئی۔

چنانچہ ۱۲۱۹ھ ہجری (۱۸۰۴ء) میں وہ ایک البانی لشکر کا سردار بنا کے مصر میں بھیجا گیا تاکہ فرانسیسیوں سے جو مصر پر قبضہ کیے لیتے تھے لڑے۔ اور انگریزوں کا ساتھ دے جو مصر کو فرانس کے تصرف سے بچانا چاہتے تھے۔ گو کہ اس زمانے میں اُس کی عمر ۲۱ ہی سال کی تھی مگر اُسے بڑی نمایاں کامیابی ہوئی۔ فرانسیسیوں سے لڑا۔ انھیں

قلعہ مصر سے مار کے نکال دیا۔ اور خود مصر میں ٹھہر گیا۔

اس معرکے میں محمد علی کو سب سے زیادہ قیمتی نفع یہ ہوا کہ انگریز اُس کے دوست ہو گئے۔ جن کی حالت دیکھ کے اُس نے اپنی ذات اور اپنی فوج میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ مصر میں اُس نے اہل مصر کے ساتھ بڑی ہمدردی کی۔ رعایا کو اپنا دوست بنا لیا۔ اور [illegible] کو والی مصر اور شرفائے ملک کے درمیان بیچ میں پڑ کے اہل وطن کی مرضی کے موافق طے کرا دیا کرتا۔

جب سے مملوک جن کے ہاتھ سے کئی صدی پیشتر دولت عثمانیہ نے ملک مصر کو لیا تھا اب تک موجود تھے۔ سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث وہ بگڑے بیٹھے تھے مگر فنا نہیں ہوئے تھے۔ مصر کی پولیٹکل حالت دیکھ کے محمد علی نے اپنی ترقی و کامیابی کا ذریعہ اُنھیں لوگوں کو قرار دیا۔ اور اپنی قسمت بنانے کے لیے جو منصوبہ دل میں ٹھہرایا تھا اُس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔

چنانچہ اب اُس نے یہ پالسی اختیار کی کہ ابنائے وطن اور خاصۃً مملوکوں کا طرفدار اور سرگروہ بن گیا۔ اور ہر امر میں اُن کی طرفداری کر کے اُنھیں اپنا ایسا گرویدہ کر لیا کہ وہ اُس کے حکم پر جان دینے کو تیار ہو جاتے۔ ان دنوں سلطان کی طرف سے مصر کا گورنر جنرل خسرو پاشا تھا۔ محمد علی مملوکوں کو اُس کے خلاف اُبھارتا۔ اور روز نئے نئے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے۔ یہاں تک کہ اہل مصر نے پوری قوت پکڑ لی۔ اور محمد علی ہی کو اپنا حاکم و فرمانروا منتخب کر لیا۔ اور جب اس کا ہنگامہ کسی طرح موقوف نہ ہوا تو مجبوراً سلطان نے سنہ ۱۲۲۰ھ محمدی (سنہ [illegible]ء) میں محمد علی کو محمد علی پاشا بنا کے گورنر جنرل قاہرہ مقرر کر دیا۔ پھر اُس کی خوش انتظامی و اطاعت دیکھ کے دوسرے سال اُسے اسکندریہ کی گورنری بھی دے دی گئی۔ اور اب سارا ملک مصر اُسی چند سال پیشتر کے ادنی دکاندار قوالہ کے تابع فرمان تھا۔ باب عالی سے بظاہر تو یہ ترقیان اس لیے دی گئیں کہ وہ اُن کا اہل تھا اور سلطنت کی اُس نے بڑی قابل قدر خدمتیں کی تھیں۔ لیکن دراصل اُس نے باب عالی کے تمام وزیروں اور سلطنت کے گرد و پیش والوں کو انتہا شبہ

دے دے کے اپنے موافق بنا لیا تھا۔

اس انقلاب نے مملوکوں اور امرائے مصر کا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حاکم کو ہٹانا ہمارے اختیار میں ہے۔ جب چاہیں سرکشی کر کے اُسے نکال دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب محمد علی پاشا بلا شرکت غیرے حاکم ہو گیا تو اُس کی اطاعت میں بھی وہ چون و چرا کرنے لگے۔ اور ہر وقت بغاوت کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ سلطان کے دربار کو تو محمد علی رشوت دے دے کے موافق بنا سکتا تھا مگر ان لوگوں کا سیدھا کرنا بہت ہی دشوار بلکہ غیر ممکن نظر آیا۔

لیکن محمد علی پاشا نہ کمزور طبیعت کا حاکم تھا کہ دب جاتا اور نہ ایسا نرم دل اور سیدھا سادھا تھا کہ رعایا کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن جاتا۔ آمادہ ہو گیا کہ امرائے مصر اور مملوکوں کی قوت کا بالکل خاتمہ کر دے۔ پہلے اُس نے سمجھا بجھا کے اور حکمت عملی سے کام لے کے اُن کے مطیع و منقاد بنانے کی بہت کوشش کی مگر مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ آخر سنہ ۱۲۲۶ محمدی (سنہ ۱۸۱۱ء) میں اُس نے قاہرہ کی شہر پناہ کے اندر ۴۷۰ مملوکوں اور سرکش امیروں کی دعوت کی۔ اور جبکہ وہ غافل اور مست بادۂ عیش تھے یک بیک اُن پر شمشیر بکف سپاہی ٹوٹ پڑے اور ایک آن کی آن میں سب کو کاٹ کے ڈال دیا۔ ساتھ ہی اُس نے حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی مملوک یا اُن لوگوں کا طرفدار ملے بے پوچھے قتل کر ڈالا جائے۔ چنانچہ ۴۷۰ چوٹی کے لوگوں کے علاوہ شہر اور قصبات میں ۱۲۰۰ معزز مملوک اور قتل ہوئے۔ اور چار پانچ روز میں مملکت مصر کا میدان صاف ہو گیا۔ اور ہر جگہ محمد علی پاشا کا ایسا رعب بیٹھ گیا کہ سارے ملک میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے سامنے چون بھی کر سکے۔ لوگ اُس کے نام سے کانپتے اور اُس کی صورت سے ڈرتے تھے۔ ملک کی ساری مخالفانہ قوتیں فنا ہو گئیں اور ساحل بحر روم سے بلندی مصر تک ہر جگہ اُس کے نام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

اسی اثنا میں ارض حجاز میں وہابیوں کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سعود

عرب کے علاقہ نجد کے لوگ مدت سے حنبلی یا اہل حدیث تھے - توحید کے زبردست حامی - سنت نبی کے دلدادہ - رسوم شرک و بدعات کے سخت مخالف اور قبر پرستی کے جانی دشمن تھے - ان مین عبدالوہاب نام ایک شخص پیدا ہوا جس نے اُن کا مقتدا بن کے سارے ملک کو اپنے زیر فرمان کر لیا - عبدالوہاب کے بعد جب اُس کا بیٹا محمد بن عبدالوہاب باپ کی گدی پر بیٹھا اور قوم کا مقتدا اور سرگروہ بنا تو اُس نے اُن لوگون مین حد سے زیادہ دینی جوش پیدا کر دیا اور فتوی دے دیا کہ "جو لوگ شرک مین مبتلا ہون اور قبر پرستی کرین گو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہون اُن پر جہاد کرنا فرض ہے"

یہ حکم سنتے ہی سارا نجد جہاد کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور سب نے یکا یک نرغہ کر کے مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر قبضہ کر لیا - گو اس مین شک نہین کہ ان لوگون مین اعلی درجے کی بدوی شجاعت تھی - مگر تمدن سے کوسون دور تھے جس کے باعث اُن کے ہاتھ سے حرمین کے لوگون پر نہایت ظلم ہوا - اور سنتے ہین کہ سوا روضۂ اقدس کے اُنھون نے تمام قبرین کھود کے پھینک دین - اس لیے کہ حدیث صحیح مین ہے کہ حضرت علی کو جناب رسول مقبول صلعم نے حکم دیا تھا کہ "جو قبر ملے اُسے کھود کے زمین کے برابر کر دین"

دولت عثمانیہ کو جب نظر آیا کہ وہابیون نے حرمین پر سے آل عثمان کی حکومت ہی اُٹھا دی تو محمد علی پاشا کے نام فرمان سلطانی صادر ہوا کہ فوراً جا کے وہابیون کی سرکوبی کرے اور حرمین شریفین مین پھر ہلالی علم بلند کرے - محمد علی پاشا زبردست فوج لے کے ارض حجاز مین گیا - چھ سال خونریزیون کے بعد وہابیون کو حرمین سے نکال کے ارض نجد کی طرف پھر ہنکا دیا - اور حرمین کا بخوبی انتظام کر کے مصر مین واپس آیا -

محمد علی پاشا کی زندگی اُلو العزمیون سے بھری ہوئی تھی - ارض حجاز کی مہم سے فرصت ہوئی تو اپنے ایک بیٹے اسمعیل پاشا کو ایک زبردست لشکر کا سالار بنا کے مملکت نوبیہ کی طرف بھیجا کہ اُسے فتح کر کے قلمرو مصر مین شامل کرے - اسمعیل نے اس مہم مین بڑی کامیابی حاصل کی - اور

علاقہ جات ڈنگولا۔ سنعار۔ اور کردفان وغیرہ کو فتح کر کے اپنے زیر علم کر لیا

محمد علی نے اِدھر نوبیہ کو فتح کیا اور اُدھر یورپ کے اُبھار دینے اور بڑھاوا دینے سے یونانیون نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ سلطان نے باغیون کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی۔ اور محمد علی پاشا نے بھی ۱۶۳ جہازون کا ایک زبردست بیڑا سواحل یونان پر بھیجا جس کا امیر البحر اُس کا بیٹا ابراہیم پاشا تھا۔ اس مصری بیڑے نے یونانیون کے ہوش پران کر دیے۔ جس شہر پر پہونچ گئے تہ و بالا کر دیا۔ اور اُس کے سپاہیون نے جہان خشکی پر قدم رکھا یونانیون کو پامال ہی کرتے رہے۔ مسلسل تین سال تک ان مصری جہازون نے یونان کو نہایت ہی پریشان رکھا تھا کہ دول یورپ سے دیکھا یونان کے بنائے کچھ نہین بنتی لہذا متفقہ آواز بلند کی کہ "یونان کو آزادی دی جائے"۔ باب عالی نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور انگلستان فرانس اور روس کے متحدہ بیڑے یونانیون کی مدد کو آپہونچے۔ بندرگاہ نوبری نو پر سنہ ۱۲۵۶ محمدی (سنہ ۲۷ء) مین دنیا کی وہ یادگار بحری لڑائی ہوئی جس مین یورپ کے متحدہ بیڑون نے عثمانی اور مصری بیڑون کو بالکل تباہ کر دیا۔ اور یہی وہ بدنصیبی کا دن تھا جس روز دولت عثمانیہ کی بحری قوت کا خاتمہ ہوا۔ اب یورپ کی خواہش کے مطابق صلح ہوئی جس کی رُو سے یونان کو آزادی ملی اور ڈنمارک کا ایک شاہزادہ وہان کا از نیا تاجدار بنایا گیا۔

گو کہ ترکون کا اس لڑائی مین بڑا بھاری نقصان ہوا تھا مگر باب عالی نے اس امر کو تسلیم کر لیا کہ محمد علی پاشا کی فوج اور اُس کے بیڑے سے سلطان کو بڑی مدد ملی۔ اور اُس کے صلے مین سنہ ۱۲۵۹ محمدی مین کانڈیا یعنی کریٹ کی گورنری بھی اُسی کو دی گئی۔ مگر یہ انعام و معاوضہ محمد علی پاشا کی امید سے کم تھا۔ اُس نے درخواست کی کہ ان خدمات کے صلے مین ملک شام بھی میرے حوالے کیا جائے۔ اس درخواست کو باب عالی نے قطعاً نامنظور کیا۔ اور محمد علی پاشا نے برافروختہ ہو کے خود ہی ملک شام پر فوج کشی کر دی۔ سلطان کا لشکر ملک شام سے دُور اور غیر منتظم حالت مین تھا۔ بخلاف اس کے مصر کی

سرحد شام سے ملی ہوئی تھی اور محمد علی پاشا کا لشکر خوب آراستہ اور تیار تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مصری فوج شہروں پر شہر فتح کرتی چلی جاتی تھی اور سلطان سے کے بنائے کچھ نہ بنتی تھی آخر چند ہی روز مین محمد علی پاشا سارے ملک شام کا مالک ہو گیا۔ اور فتحمندی کے پھریرے اُڑاتا ہوا ایشیائے کوچک مین داخل ہوا ۱۲۶۱ھ محمدی مین شہر قونیہ کے نزدیک ترکون اور مصریون مین ایک خونریز لڑائی ہوئی جس مین عساکر سلطانی پسپا ہوئے۔ اور محمد علی پاشا جوش اور ولولے کے ساتھ خاص قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

مگر یہ امر دول یورپ کی پالسی کے خلاف تھا کہ حاکم مصر سلطان پر غالب آ جائے۔ اور مشرق مین ایک نئی زبردست دولت و قوت قائم ہو۔ چنانچہ سب نے درمیان مین دخل دیا۔ اور محمد علی سے کہا کہ اب خبردار آگے قدم نہ بڑھانا۔ محمد علی پاشا نے اپنے مربی و آقا کے کہنے کی تو کچھ پروا نہ کی تھی مگر یورپ والون سے ڈرا اور صلح قبول کی۔ شہر کطاہیہ مین دونون جانب کے سفیرون نے معاہدۂ صلح کی تکمیل کی جس کی رُو سے محمد علی پاشا کو ملک شام اور علاقۂ عدنہ دے دیے گئے۔

اب ۱۲۶۹ء محمدی (۱۸۳۹ء) آیا جبکہ محمد علی پاشا ستر برس کا بڈھا تھا۔ اور بڑی شجاعت اور کمال ہوشیاری کے ساتھ مصر۔ سوڈان۔ شام عرب۔ اور جزیرۂ کرِٹ پر حکومت کر رہا تھا۔ یکایک سلطان روم یعنی سلطان محمود خان ثانی نے ارادہ کیا کہ ملک شام کو محمد علی پاشا کے قبضے سے نکال لین۔ مگر پہلی ہی لڑائی مین سلطانی لشکر کو شکست ہوئی۔ اور سلطان نے مجبوراً انگلستان اور دول یورپ سے مدد مانگی۔ یہ اجنبی دول جو غیرون کے معاملات مین دخل دینے ہی کو اپنا ذریعۂ ترقی سمجھتی تھین فوراً مدد دینے کو تیار ہو گئین۔ محمد علی پاشا اُن کی بحری قوت سے زک اُٹھا چکا تھا مگر پھر بھی پروانہ کی اور سب سے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ ساحل شام پر بیروت کے قریب لڑائی ہوئی۔ جس مین محمد علی پاشا کو شکست ہوئی۔ اور اسی قدر نہین بلکہ اُسے یہ بھی نظر آیا کہ دول کے جہازون نے اسکندریہ کا راستہ

بند کر دیا ہے - اپنی بے دست و پائی دیکھ کے حریف کی شرطین قبول کرنے پر راضی ہوا - اور ملک شام سے دست بردار ہو کے صرف مصر وغیرہ کا حاکم رہ گیا -

لیکن اسی معاہدے مین اُس کی اتنی اشک شوئی بھی کی گئی کہ وہ ملک مصر کا مستقل والی تسلیم کیا گیا - اور قرار پایا کہ گو وہ سلطان ہی کی جانب سے مصر کا گورنر جنرل ہو گا مگر اس ملک سے کبھی بدلا نہ جائے گا - اور ولایت مصر ہمیشہ اُسی کی نسل مین رہے گی - یون ملک مصر اُس کی اولاد کا حق بن گیا -

اب اُس کی عمر زیادہ ہو چلی تھی - حوصلے اگرچہ بڑے بڑے تھے مگر جسمانی طاقت نے جواب دے دیا - یہان تک کہ ۱۲۶۴ھ محمدی (۱۸۴۸ء) مین اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو اپنا وارث بنا کے حکومت سے علٰحدہ ہو گیا - اور دوسرے ہی برس ۱۲۶۵ھ محمدی مین جبکہ اُس کی عمر پورے اسی برس کی ہو چکی تھی دنیا سے رخصت ہو گیا - اُس کے جانشین ابراہیم پاشا کی عمر نے زمانہ کی چند ہی روز مین سفر آخرت کیا - اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا عباس پاشا والی مصر مقرر ہو کے باپ دادا کی مسند حکومت پر بیٹھا -

زندگی کے آخری دو برس مین محمد علی پاشا کے حواس بجا نہ تھے - بڑھاپے نے دماغ ماؤف کر دیا تھا - لیکن اس مین ذرا شک نہین کہ وہ بہت ہی غیر معمولی آدمی تھا - اُس نے یورپ کے نظام سلطنت کو اپنی قلمرو مین جاری کیا - اور مغربی اصول و آئین جنگ اختیار کر لیے تھے - اپنے ملک مین زراعت تجارت - اور صنعت و حرفت کو ترقی دی - جنگی اور طبی مدرسے کھولے - اور اہل فرانس کی قابلیت کا اسی قدر معترف تھا کہ غالباً مسلمان حکمرانون مین پہلا وہی شخص ہے جس نے ضرورت اور مصلحت دیکھ کے اپنے دو بیٹون کو تعلیم و تربیت کے لیے پیرس مین بھیجا -

اُس نے اپنی زندگی خود ہی بنا لی - اور بغیر کسی دوسرے کی مدد کے صرف اپنی کوششون سے ہر امر مین ترقی کرتا گیا - البانیا کا ایک ادنیٰ اور ناچیز کسان سے زبردست فرمان روا اور تاجدار ہو گیا - تعلیم سے وہ پہلے بالکل بے بہرہ تھا -

پنتالیس برس کی عمر مین اپنے شوق سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور تحصیل علم مین ایسی محنت کی کہ جاہل ڈُکاندار سے ایک تعلیم یافتہ مدبر سلطنت ہو گیا۔

یہ امر البتہ افسوس کے قابل ہے کہ عروج حاصل کرنے کے شوق مین اُس کے ہاتھ سے بڑے بڑے مظالم ہوئے۔ سازشون کا بازار گرم ہوا۔ اُس نے بدعہدیان کین۔ دغابازیون سے کام لیا۔ اور بیگناہون کے خون سے ہاتھ رنگے مگر طالبان سلطنت کے لیے یہ باتین ہمیشہ ایک معمولی چیز ہوتی آئی ہین۔

حُسن کی کرشمہ سازیان

اس سلسلے کو ہم نے چند روز کے لیے روک دیا تھا۔ اس لیے کہ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے احباب ایک ہی عنوان کو بار بار پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے ہون گے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ مین فقط عنوان ہی عنوان کی یکسانی تھی۔ ورنہ اصل مین ہر مرتبہ کسی نئی مشہور خاتون یا ملک کے حالات ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھین تازگیون اور دلچسپیون کو یاد کرکے اکثر قابل احباب نے اُس سلسلے کے جاری کرنے کا تقاضا کیا۔ اور ہم اُن کی خواہش پوری کرنے کے لیے پھر دنیا کی اُن تاریخی عورتون کے حالات شروع کرتے ہین جنھون نے اپنے حسن وجمال کی کشش اور اپنے بانکپن کے اسلحہ سے کام لے کے دنیا پر کوئی خاص اثر ڈالا۔

بوادیقیا اور قارطس ماندوا

انگلستان کی تاریخ کا آغاز اِن دو ملکاؤن کے کارنامون سے ہوتا ہے۔ جنھون نے اپنی رعایا کو اپنے حُسن کے دام گلوگیر مین اسیر کرکے اُن سے جو اور جیسا کام چاہا لے لیا۔ ان مین سے اول الذکر یعنی ملکہ بُوادیقیا (جس کے نام کا تلفظ انگریزی مین فی الحال بوڈیشیا کیا جاتا ہے) نہایت ہی شریفانہ طرز عمل رکھنے کے باعث دنیا مین سچی شجاعت وحمیت اور اعلی درجہ کی قومی وملکی محبت کا جوش دکھا گئی۔ اور دوسری یعنی قارطس ماندوا (جس کے نام کا تلفظ فی الحال کارٹسمانڈوا کیا جاتا ہے) اپنی مذکورہ ہمرتبہ بہن کے خلاف نہایت بےحمیت و بےغیرت

اور بے عصمت و بے عفت تھی - جو بے وفائی و بے عصمتی کا شرمناک ترین نمونہ دکھا کے اور ابدی بدنامی حاصل کر کے دنیا سے رخصت ہوئی - لیکن ہمین یہ خیال کر کے افسوس آتا ہے کہ پہلی جو اچھی تھی وہ تو دنیا سے ناکام و نامراد گئی - اور دوسری اپنے ناپاک جرم کی سزا سے بچ جانا درکنار اپنے مقاصد مین کامیاب و بامراد ہوئی -

ملکہ بوادیقیا کی سرگذشت یہ ہے کہ اُس کا شوہر پراسوطاغوس (پراسوطاغس) انگلستان کے علاقہ ایسینی کا بادشاہ تھا جو علاقہ کہ اب نارفوک کے نام سے مشہور ہے - اُن دنون انگلستان مین چونکہ رومیون کا اثر بڑھ رہا تھا - اور وہان کی قومی قوتین رومی اسلحہ سے مرعوب ہو ہو کے فنا ہوتی جاتی تھین اس لیے پراسوطاغوس نے وصیت کر دی کہ میرے مرنے کے بعد میری حکومت و سلطنت کے وارث شہنشاہ روم اور میری بیٹیان ہون - اس وصیت مین اُس کی یہ مصلحت تھی کہ شہنشاہ روم تو انگلستان مین آ کے میری قلمرو پر قبضہ کرنے سے رہا - میری بیٹیان ہی مالک ہون گی - اور شہنشاہ کے تعلقات کی وجہ سے وہ ہر طرح کی دشواریون سے محفوظ اور تمام بیرونی حملون سے مامون ہو جائین گی - اور کسی پاس پڑوس والے فرمان روا یا کسی رومی سپہ سالار کی اتنی جرات نہ ہو سکے گی کہ میری قلمرو کو نگاہ اُٹھا کے بھی دیکھ سکے -

لیکن اُس کی امید کے خلاف یہ اُلٹا نتیجہ ظاہر ہوا کہ اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی رومی سپہ سالار نے اُس کے شہر اور محل پر قبضہ کر لیا - رومی سپاہیون نے سارے شہر اور محل مین لُٹس مچا دی - جو ہاتھ آیا اپنا مال سمجھ کے لوٹ لے گئے - اور اسی قدر نہین بوادیقیا کی نازپروردہ شاہزادیون کو بھی جو شریک وراثت قرار دی گئی تھین نہایت بے رحمی کے ساتھ بے آبرو کیا - ملکہ بوادیقیا نے اس پر اظہار ناراضی کیا تو اُس غریب کو پکڑ کے سربازار خاص اُس کی رعایا کے سامنے کوڑون سے مارا اور تحقیر و تذلیل کی کوئی بات اُٹھا نہ رکھی -

رومی جب لوٹ مار کے اور ہر طرح کی بے حُرمتیان کر کے واپس گئے تو بوادیقیا نے اپنی رعایا کو رومیون کی مخالفت پر اُبھارا - رومیون نے اس موقع پہ کچھ ایسی بے رحمی اور دغا بازی سے کام لیا تھا کہ ساری رعایا طیش مین بھری ہوئی

تھی - اور جتنے آدمی تھے اگرچہ جانتے تھے کہ رومیون سے مقابلہ کرنا جنون اور اُن کے مقابل ہتھیار اُٹھانا خودکشی ہے اپنی ملکہ کی صدائے فریاد سنتے ہی لڑنے مرنے اور جان دینے کو اُٹھ کھڑے ہوئے - بوادیقیا اُن سب کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرکے اور قومی اسلحہ سے مسلح کرکے بڑے جوش وخروش کے ساتھ مردانہ وار چلی - اور رومیون کے قلعۂ کمالوڈونم پر جو اب کال چسٹر کے نام سے مشہور ہے دھاوا کر دیا - رومیون نے پوری قوت سے مقابلہ کیا - اپنے سیکھے ہوئے اصول جنگ کے مطابق صفین باندھ کے بڑھے - مگر برطانیہ والون کے پُرجوش سیلاب کا روکنا دشوار تھا - ہزار کوششین کین کسی طرح کامیاب نہ ہوئے - آخر شکست کھا کے بھاگے - اپنی دغابازی و بے حمیتی کے پاداش مین نہایت ہی بودے پن کے ساتھ مارے گئے - اور بوادیقیا نے مذکورہ رومی قلعہ پر قبضہ کر لیا -

اس فتح نے اس برطانی ملکہ کا حوصلہ بڑھا دیا - فوج درست کرنا شروع کی - ملک کا انتظام اپنے ہاتھ مین لیا - رومیون کی شائستگی و تہذیب کو تو اُن کے ظالمانہ و وحشیانہ حرکات سے پہلے ہی دھبہ لگ گیا تھا اب اُن کی سپہگری وشجاعت بھی خاک مین مل گئی - اور اُن کے نام کو ایسا داغ لگا جو کسی طرح مٹائے نہ مٹتا تھا - آخر زبردست رومی سپہ سالار سویٹونیوس جو شمالی انگلستان کی قوتون کی پامالی مین مصروف تھا اپنا جرار لشکر لے کے آیا - اور بوادیقیا کو اُس کے مقابلے مین صف آرا ہونا پڑا - اس زبردست لشکر سے مقابلہ کرنا برطانیون کی قوت سے باہر تھا - اگرچہ جان پر کھیل کے لڑے - اور دیر تک ملکہ کے اشارون پہ جو جو قلب فوج مین موجود تھی اور تلوار کو حرکت دے دے کے اُنھین حوصلہ دلا رہی تھی وہ بڑھ بڑھ کے اپنے سر کٹواتے رہے مگر آخر کار شکست ہوئی بدحواس و بددل ہو کے بھاگے - بہادر ملکہ بوادیقیا کو بھی مجبوراً میدان چھوڑنا پڑا - اور اسی میدان پر اُس باحمیت ملکہ کے کارنامون کا خاتمہ ہو گیا -

اُس کے انجام کی نسبت مورخین مین اختلاف ہے - بعض کہتے ہین کہ عین معرکہ کارزار مین بہادری کے ساتھ لڑتی ہوئی ماری گئی - اور بعض کا بیان ہے کہ اپنی جان

لے کے میدان سے تو نکل آئی تھی مگر ناکامی کی زندگی کو اُس کا شریف نفس نہ گوارا کر سکا۔ گھر آتے ہی زہر کھا کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جو اُن دلون رومیون کے نزدیک نہایت ہی شریفانہ اور مبارک موت تھی۔ بوادیقیا کی زندگی کا خاتمہ سنہ ۵۱ قبل محمد (سنہ ۶۱ ع) مین ہوا۔

قارطس مانڈوا دوسری بدکار انگلش ملکہ بھی قریب اسی زمانے یعنی جناب سرور کائنات علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً پانسو برس پیشتر یا پہلے صدی عیسوی مین تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلی وارث سلطنت اور مالک تاج و سریر وہی تھی۔ اور اُس کا شوہر دینوطیوس اُس کی طرف سے نیابتہً حکومت کر رہا تھا۔ لیکن اپنی نیک نفسی و شجاعت سے سارے ملک مین ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ کل فوج والے اُس کا دم بھرتے تھے۔ اور ہر سپاہی اُس کے نام پر شیدا تھا۔

مگر خرابی یہ تھی کہ میان کو رعایا کے خوش رکھنے اور ملک مین عدل و انصاف کرنے کا شوق تھا تو بادشاہ بیگم بی کارٹسمانڈوا کو نفس پرستی اور اپنے دل کی ہوسین نکالنے کا۔ اُنھین اپنے عیش و آرام اور شہوت پرستی کے سوا اور کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ انھین بے باکانہ شہوت رانیون کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے اسلحہ بردار دیلو قاطوس سے آنکھ لڑ گئی۔ اور دونون ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ دینوطیوس (بادشاہ) کو یہ بات ناگوار گزرنے لگی اور اس بات کی تدبیرین سوچنے لگا کہ کیونکر اپنے رقیب کو زک دے جو بستر عیش کا مالک بن کے اس کی زندگی کو روز بروز زیادہ بدمزہ کرتا جاتا تھا۔

وہ ان منصوبون کو دل مین سوچتا ہی رہا اور بی بی نے اپنے حقوق واقتدارات شاہی کو عمل مین لا کے اُسے بالکل چھوڑ دیا۔ اور علانیہ دیلو قاطوس کا آغوش گرم کرنے لگی۔ اُس وقت تک برطانیہ والون نے دین مسیحی نہین اختیار کیا تھا۔ اپنے قدیم بت پرستی کے مذہب پر تھے۔ اور اُس وقت کے آئین و رسوم کے مطابق شاید عورتون کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ شوہر کو جب چاہین چھوڑ دین اور جس کسی کو پسند کرین اُس سے آشکارا طور پر تعلقات پیدا کر لین۔ لیکن جو ہو برطانی لوگون نے اپنی ملکہ کے اس فعل کو پسند نہین کیا۔ پہلے اُسے سمجھایا

اور روکا اور جب اُس نے کسی طرح نہ مانا تو بغاوت کردی اور ارادہ کیا کہ کارطس مانڈوا کو تخت سے اُتار کے کسی اور کو اپنا فرمان روا بنا لین۔ رعایا کو برہم و افروختہ دیکھ کے ملکہ نے رومیون سے مدد مانگی جو طرح طرح کے بہانے اور حیلے پیدا کر کے سارے جزیرے مین اپنی حکومت قائم کرتے جاتے تھے۔ اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا۔ فوراً زبردست رومی لشکر ملکہ کی کمک کے لیے آ پہونچا۔ جس نے آتے ہی تمام مشرقی برطانیون کو مار کے سیدھا کر دیا۔ اور رعایا کے بعد خود ہی سلطنت کے بھی مالک ہو گئے رومیون کی مدد سے کارطس مانڈوا کو شاید اپنے محبوب آشنا سے ملنے کی آزادی مل گئی ہو۔ مگر سلطنت پھر نہ نصیب ہوئی۔ اور رومیون کی گرفت ایسی قوی تھی کہ اسی وقت سے اس پرانے خاندان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

صفدر جنگ منصور علی خان کے انتقال کے بعد ۱۱۶۷ھ محمدی (۱۷۵۳ء) مین اُن کے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوئے۔ جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے مین بیان ہو چکے ہین۔ وہ ایک مضطرب و بیقرار طبیعت کے اولوالعزم فرمان روا تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنون اور یادگار زمانہ انقلابون سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قومون اور قوتون کی قسمت کا فیصلہ اُنھین کی آنکھون کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی۔ جس مین احمد شاہ درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانین روہیلکھنڈ کی تمام زبردست فوجین ایک طرف تھین اور مرہٹون کا ٹڈی دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے ۱۱۷۴ھ محمدی (۱۷۶۱ء) مین ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانون کا رہے یا نہ رہے مگر مرہٹون کا نہین ہو سکتا۔ اُس کے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس مین انگریزون کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکر کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۱۷۸ھ محمدی (۱۷۶۴ء) مین چوبیس گھنٹہ کے اندر اس بات کا

تصفیہ کر دیا۔ کہ ہندوستان اب مسلمانون کا نہین انگریزون کا ہے۔

ان لڑائیون سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی مین رہے مگر بڑی بڑی مہمون پولیٹیکل مشغولیتون اور فوجی اصلاحون نے اُنھین اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آرایش کی طرف توجہ کرین۔ اُنھون نے قلعے بنوائے۔ گڑھیان قائم کین۔ فوجی سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا۔ اس کی فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور اپنے شہر کو آراستہ کرین۔ بکسر کی لڑائی کے بعد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہین وہ فیض آباد مین جا کے اقامت گزین ہو گئے اس لیے لکھنؤ اُن کی تمدنی برکتون سے محروم رہ گیا۔ سنہ ۱۱۸۸ ہجری (سنہ ۱۷۷۵ء) مین اُنھون نے سفر آخرت کیا اور نواب آصف الدولہ اُن کے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے مسند حکومت پر قدم رکھتے ہی مان سے ناراض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت زبان روانی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزون نے دربار اودھ مین دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے۔ جن کی بنا پر یہان فوجی ترقیون کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اُس کی فوجین دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکین۔ تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد مین زندہ رہے فوجی اصلاح ہی مین مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائین۔ چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش مین اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہین کہ "جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقون کے مقابلے مین انگریزی فوج کی بندوقین کوئی وقعت نہ رکھتی تھین"

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتین تشریف لے گئین۔ انگریزون نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا۔ اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح کی طرف سے بے پروا ہو کے دوسرے مشاغل مین دل بہلائین

آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اُنھین لُٹانے اور مزے اُڑانے کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی۔ جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی اس لیے اُنھون نے تھوڑی سی فوج رکھ لی۔ باقی سب کو معزول کر دیا۔ اور عیش و عشرت مین مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستون کے اطاعت کیش دوست تھے۔ جو اُن کے اشارون پر چلتے۔ اور اُن کے مشورے کے آگے کسی کی نہ سنتے۔

اس خلوص عقیدت کے صلے مین انگریزون نے روہیلکھنڈ پر اُن کا قبضہ کرا دیا اپنی مان بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لوٹنے کے لیے جب اُنھون نے انگریزون سے مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ اُنھین اخلاقی مدد دی گئی اور اُن کی طرفداری کی گئی۔ لیکن اس پر بھی اُن کے زمانے تک اُنھین یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق مین کسی بیرونی قوت کو دخل ہے۔ جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت مین اُن دنون لکھنؤ کے دربار مین ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہین اور کسی دربار مین نہ تھی۔ اور ایسا سامان عیش جمع ہو گیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنون شہر لکھنؤ ایسی رونق پہ تھا کہ ہندوستان ہی نہین شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریون مین صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنے عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرایش و خوش حالی مین صرف کرنا شروع کر دیا۔ اور چند ہی روز کے اندر ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہان جمع کر لی۔ اُن کا حوصلہ بس یہی تھا کہ نظام حیدر آباد ہون یا ٹیپو سلطان کسی دربار کا کروفر اور کسی کی شوکت و حشمت میرے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خان کی شادی مین اُنھون نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس مین بارہ سو ہاتھی تھے۔ دولھا جو شاہی خلعت پہنے تھا اُس مین بیس لاکھ کے جواہرات

ٹنکے ہوئے تھے - محفل حرب کے لیے دو عظیم الشان اور پُر تکلف خیمے بنوائے گئے جن مین ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا - ۱۲۰ فٹ لمبا اور ۴۰ فٹ بلند تھا - اور ایسا عمدہ نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونون کی تیاری مین سلطنت کے دس لاکھ روپیہ صرف ہوگئے -

اُنھون نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ - رومی دروازہ اور اپنا یکتاے روزگار امام باڑہ تعمیر کرایا - سنہ ۱۲۱۳ محمدی (سنہ ۱۷۸۴ء) مین اودھ مین قحط پڑ گیا تھا - اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی مین مبتلا تھے - اس نازک موقع پر رعایا کی دستگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی - چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے مین اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا - اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے مین آکے مزدورون مین شریک ہوجاتے - اور مشعلون کی روشنی مین کام کرتے - اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگون نے تعمیر بھی کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہوگئی جو اپنی نوعیت مین بے مثل اور نادر روزگار ہے - اُس کا نقشہ بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بُلائے گئے - اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ دوسرون کے مجوزہ نقشون سے بڑھ جائے - مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثل زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا - اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہوگئی جو ۱۶۷ فٹ لمبی اور ۵۲ فٹ چوڑی ہے - اینٹ اور نہایت اعلی درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی جس مین فرش سے چھت تک لکڑی کا کہین نام نہین ہے - اس عمارت کو شاہان مغلیہ کی سنگین عمارتون سے کسی قسم کا تعلق نہین ہے - لکھنؤ مین اُس کثرت سے سنگ مرمر دستیاب نہین ہو سکتا تھا - لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتون کو دیکھیے تو ایک نئی خوشنمائی اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہین - امام باڑے کی لداؤ کی چھت جو کڑا دے کے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری دنیا مین کہین نہین ہے - اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبۂ روزگار کاریگریون مین شمار کی جاتی

آصف الدولہ کی عمارتون پر یورپ کی عمارتون کا ذرا بھی اثر نہ تھا - وہ
بہی نوعیت مین خالص ایشیائی ہین جن مین نمایشی نہین اصلی وحقیقی شان وشوکت
پائی جاتی ہے - نواب آصف الدولہ کے بعد اُن کی یہ عمارتین کس مپرسی مین پڑی
رہین - غدر کے بعد انگریزون نے اُن پر قبضہ کرکے گرد وپیش کے مکانون کو منہدم
کر دیا - اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے باقی تینون طرف میدان کر کے
امام باڑہ کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا - اُس زمانے مین اُس
امام باڑے کے اندر گورے رہتے تھے - اس کے بڑے ہال مین سلاح خانہ تھا - اور اُس
کی چھت پر بڑی بڑی توپین دوڑتی پھرتی تھین - مگر کبھی نہ زمین کھدی نہ در و دیوار کی
کوئی چیپ اُکھڑی - اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانون کے
حوالے کر دیا ہے - اس کی مسجد مین ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہین - اور امام باڑے
مین تعزیہ داری ہوتی ہے -

نواب آصف الدولہ کی عمارتون کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ
اُنھین تعمیر ہوئے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ مدت گزر گئی مگر آج تک اُسی
عظمت وشکوہ اور اُسی مضبوطی وپائداری سے اپنی جگہ پر قائم ہین - نہ کوئی
اینٹ اپنے مقام سے ہٹی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹون کو چھوڑا ہے - برخلاف
اُن کے دیگر شاہان اودھ نے کروڑون روپیہ صرف کرکے جو عمارتین بعد کو
بنوائین وہ قومی وملکی وضعداری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور
ہین - اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتین۔

آصف الدولہ امام باڑے اور مچھی بھون کے متصل اپنے محل دولت خانے مین
رہتے تھے شہر کے باہر اور دریا پار ہجوم خلائق سے دور اور دنیوی جھگڑون سے
الگ رہ کے مصروف عیش ہونے کے لئے بیباپور کا محل بنوایا - اکثر جب وہ سیر و
شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان مین قیام کرتے - اسی طرح جھنجھٹ مین ایک پُرفضا
ونزہت بخش مکان - اور چارباغ اور عیش باغ مین کوٹھیں بنوائین - اور
اسی زمانے مین یحیی گنج بین اور اُس کے متصل اصطبل بنے - پھر محلۂ وزیر گنج قائم ہوا
جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کی قیام گاہ ہونے کے باعث اُنھین کی طرف

منسوب اور انھین کی یادگار رہے -

اب لکھنؤ مین حاکم اور فرمان روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلقت کا رُخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا - جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے مین فیض آباد مین بس گئے تھے اُنھون نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ مین آ آ کے بسنا شروع کیا - دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے سیدھے لکھنؤ مین آتے تھے اور پھر واپس جانا نہ نصیب ہوتا تھا - خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلہ آباد کرنا شروع کر دیے - اس لیے کہ باہر کے آنے والون مین سے جسے جہان جگہ مل جاتی آباد ہو جاتا - اور سیکڑون نئے محلے آباد ہوتے چلے جاتے -

چنانچہ امانی گنج - فتح گنج - رکاب گنج - نخاس - دولت گنج - بیگم گنج - نواب گنج خانساماں کا احاطہ (جسے نواب آصف الدولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا اور افتتاح کی تقریب مین خود اُنھین بلایا) ٹکیت گنج - ٹکیٹ راے کا بازار (جو وزیر اعظم مہاراجہ ٹکیت راے کی جانب منسوب ہین) ترنبی گنج - ٹکری یا ٹکلی - حسین الدین خان کی چھاؤنی - حسن گنج باؤلی - بھوانی گنج - بالک گنج - کشمیری محلہ - صورت سنگھ کا احاطہ - نواز گنج - تحسین گنج - خدا گنج - نگریا (جس کی نواب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم صاحبہ نے اُسی دن بنیاد ڈالی جس دن دریا پار اُنھون نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) عنبر گنج - محبوب گنج - توپ دروازہ - خیالی گنج - جھاؤلال کا بازار - جھاؤ لال کا پل (ان دونون محلون کے بانی راجہ جھاؤ لال سلطنت اودھ کے وزیر خزانہ تھے) یہ سب وہ محلہ ہین جو عہد آصفی مین بسے اور تعمیر ہوئے - اور انھین دنون دریا کے پار حسن رضا خان نے حسن گنج بسایا -

نواب آصف الدولہ کی فیاضیون کی عام و خاص مین شہرت تھی - اور دُور دُور کے شہرون مین اُن کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا - لوگ اُٹھتے بیٹھتے محبت و عزت کے ساتھ اُن کا نام لیتے - اور اُن کے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن مین چھپ کے نظرون سے غائب ہو گئے تھے - اور عوام کو نواب کی صورت مین ایک عیش پرست فرمان روا نہین بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا - ہندوؤن کا ندار تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے

"یا آصف الدولہ ولی !"

اُسی زمانے مین جنرل کلاوڈ مارٹن نام ایک بہت بڑا دولت مند فرانسیسی تاجر لکھنؤ مین آکے رہ پڑا تھا - اُس نے ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی کا نقشہ بنا کے نواب آصف الدولہ کے ملاحظہ مین پیش کیا - نواب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اُس کی قیمت مین دس لاکھ اشرفیان دینے کو تیار ہو گئے - بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہین پہونچنے پایا تھا کہ نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا - اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہین پہونچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہو گئے - اُنھون نے چونکہ دولت بے پایان چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا اس لیے مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اُسے حکمرانان اودھ ضبط نہ کر سکین - اس عمارت کا نام اُنھون نے کانسٹین شیا (قسطنطینیہ) قرار دیا تھا - مگر عوام مین وہ آج کل "مارکین صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے - اور دیکھنے کے قابل ہے - مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی مین دفن ہوئے - اور وہ مدرسہ آج تک جاری ہے جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے - مگر سنتے ہین کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اُس کے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہین کیا تھا - بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی ہندو مسلمان سب ہی یکسان طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہین لیکن اب یہ مدرسہ صرف یورپین بچون کے لیے مخصوص ہے - کسی ہندوستانی کو وظیفہ نہ ملنا درکنار اُس کی تعلیم مین بھی شریک نہین کیا جاتا - شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے مین جاہل و پرجوش بلوائیون نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیان نکال لین - اور اُنھین ادھر اُدھر پھینک دیا - انگریزون کے بعد تسلط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی تھی جو پھر اسی جگہ خاک مین دبا دی گئی - لیکن اُن بلوائیون کے فعل کے ذمہ دار عام ہندوستانی نہین ہو سکتے -

سنہ ۱۲۱۲ محمدی (سنہ ۱۷۹۸ء) مین نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا - اور اُن کی جگہ نواب وزیر علیخان مسند نشین ہوئے - جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہین - مگر چار ہی مہینے مین اُن سے ایسے بیہودہ اور قابل نفرت

حرکات ظاہر ہوئے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود بہو بیگم صاحب اُن کے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے یمین الدولہ نواب سعادت علی خان کو زیادہ پسند کرتی تھین ادھر اس چیز کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خان آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہین ہین کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتون کا خیال تھا کہ پیدائیشی عنین تھے۔

نواب سعادت علی خان آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث اُن کے زمانے مین مدتون قلمرو سے باہر اور دُور رہے تھے۔ مدتون کلکتہ مین رہے اور ایک زمانۂ دراز تک بنارس مین قیام رہا۔ وزیر علی خان کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد قرعۂ انتخاب نواب سعادت علیخان پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بیبیاپور کی کوٹھی مین خود گورنر جنرل بہادر نے دربار فرماکے وزیر علی خان کی معزولی اور نواب سعادت علیخان کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خان فوراً گرفتار کر کے بنارس بھیج دیے گئے۔ جہان اُنھون نے طیش مین آکے مسٹر چیری کو مار ڈالا۔ اور اس کی سزا مین گرفتار کر کے چنار گڑھ بھیجے گئے۔ اور وہین مرے۔ اُن کی مصیبتون اور سرگردانیون کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہین ہو سکتا

خیالات و واقعات

ان دنون مسلمانون مین جو آزادانہ پولٹیکل تحریک پیدا ہوئی ہے وہ ہر جگہ کسی نہ کسی عنوان سے اپنا جلال دکھادیا کرتی ہے۔ چنانچہ ندوۃ العلما کے دارالعلوم مین طلبا نے اسٹرائک کر دی۔ اور جو گتھی پڑی تھی کئی مہینے گذر جانے پہ بھی سلجھنے کو نہ آئی جس کی وجہ زیادہ تر جلسۂ انتظامی ندوہ کی بے پروائی کی کارروائی اور ارکان ندوہ کی باہمی رنجش تھی۔ طلبہ بظاہر چاہے کچھ کہین لیکن اصل مین اُس مذاق تعلیم کو پسند کرتے ہین جس کے موجد مولانا شبلی نعمانی ہین۔ بعض کا عام خیال یہ ہے کہ جب تک مولانا شبلی زندہ ہین بغیر اُن کے ندوہ زندہ نہین رہ سکتا۔ ارکان ندوہ مین سے جو حضرات برسرکار ہین اُن مین سے بعض کا خیال ہے کہ چاہے ندوہ مٹ جائے مگر مولوی شبلی کو ہم نہ آنے دین گے۔

بڑے غور اور بہت سے رد و قدح کے بعد ندوہ کے مقاصد یہ قرار دیے گئے تھے کہ

اُس کا دار العلوم دیگر عربی مدارس کی طرح عام قسم کی پرانی تعلیم نہ دے گا بلکہ وہ ایسے زمانہ شناس اور جدید مذاق میں سموئے ہوئے علما پیدا کرے گا جو جدید تعلیم یافتہ یعنی انگریزی دان گروہ کی پیشوائی کر سکیں۔ یہ خطرناک حالت دس بارہ سال سے نمایاں طور پر نظر آنے لگی ہے کہ انگریزی مدارس کے پڑھے ہوئے اپنے پیشواؤں کی گرفت سے باہر ہوتے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے موجودہ علما کو چھوڑ کے شعرا کی طرح اُن کے ہر فعل پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ بات بات پر انھیں بناتے ہیں۔ اور علما نے بھی خیال کر لیا کہ ہمارے ماننے والے صرف ادنیٰ طبقوں کے مسلمان ہیں۔ اس لیے ہمیں انھیں سے سروکار رکھنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنی مسلمانوں کا سربرآوردہ گروہ بے سر ہو کے ایسا خودسر ہو گیا ہے کہ اُن میں کا ہر جاہل آپ اپنا مجتہد بنا جاتا ہے۔ اسی آفت کے دور کرنے کے لیے ندوہ نے اپنے دار العلوم کے لیے ایسا نصاب قائم کیا کہ اس دار العلوم کے تعلیم پائے ہوئے انگریزی دان گروہ پر اپنا اثر ڈال کے انھیں اپنا پیرو بنا سکیں۔

مولانا شبلی نے اس میں شک نہیں کہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کے نصاب میں مناسب ترمیمیں کیں۔ انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ تاریخ و ادب اور کلام و فلسفہ اسلام کے سبجکٹوں کو بڑھایا۔ ایک جماعت ایسے مبلّغوں اور مشنریوں کی قائم کی جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد دعوت اسلام کر سکیں۔ اچھے واعظ ہوں اور اچھے مناظر۔ اور غیر مذہبوں کے اُن حملوں کو رد کریں جو اسلام پر ہو رہے ہیں۔ بہت سے طلبہ ان فنون کو اختیار کر کے اپنی زندگی کے کئی سال صرف کر چکے ہیں اور اُن کی موجودہ حالت دیکھی جائے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ بیشک ندوہ کے مقاصد پورے کر سکیں گے۔ اور اسلام کی اچھی خدمت کریں گے۔

لیکن مولانا شبلی کی علحدگی کے بعد اب عجیب مختلف المذاق ارکان کے ہاتھ میں ندوہ کی قسمت چلی گئی ہے۔ جن میں سے کوئی صاحب تو چاہتے ہیں کہ تصوف سے

روحانی اصول کی تعلیم کے لیے ندوہ افلاطون کا مدرسۂ الٰہیات یا موجودہ زمانہ کا گروکل بنا دیا جائے۔ بعض حضرات خالص علم حدیث کی تعلیم چاہتے ہیں۔ بعض بزرگوں کے ذہن میں ہے کہ ندوہ کے دار العلوم میں سے اچھے اور مستند فقیہ نکلا کریں۔ اس کشمکش نے پرانے نصاب میں خلل انداز ہو کے ندوہ کو اُس کے پڑانے چلے شدہ مذاق سے الگ کر دیا۔ اور طلبہ میں بے قراری اور پریشانی پڑھنا شروع ہوئی۔ اور اُن سے سرکشی کے آثار ظاہر ہونے لگے

طلبہ کی سرکشیاں دیکھ کے جدید منتظمین نے ندوہ میں سخت قسم کی شخصی سلطنت قائم کی۔ طلبہ کے حرکات کی نگرانی اور اُن کے افعال کی جاسوسی ہونے لگے۔ اُن کے خطوط ہاتھ میں جانے سے پہلے ناظم کے ہاتھ میں جانے لگے۔ ڈاک والوں کو ہدایت کی گئی کہ طلبہ کے پرائیوٹ خطوط منتظمین کے ہاتھ میں دیا کریں۔ اُن کی مذہبی محفلوں کی روک تھام۔ اور اُنھیں کسی اور سے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی جانے لگی اور اُنھیں نظر آیا کہ ہم گویا حراست میں ہیں۔ اور ہمارے ہر کام پر ناظم صاحب کا پہرہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اسٹرائک ہو گئی۔

اسٹرائک کے دور کرنے کے لیے جو انتظامی جلسہ ہوا اُس نے باوجودیکہ مسلّم عقلا کا مجموعہ تھا قبل اس کے کہ طلبہ کو بُلا کے اُن کے خیالات و شکایات سنے محض ناظم صاحب کی رپورٹ پر یک طرفہ فیصلہ کر دیا کہ جو طلبہ ناظم صاحب کے بیان کے مطابق اسٹرائک کے اصلی محرک اور بانی ہیں قطعاً خارج کر دیے جائیں۔ اور سب کو چند روز کی مہلت دی جائے۔ اُس مدت میں اگر مانیں تو خیر ورنہ سب نکال دیے جائیں۔ اس فیصلہ کا رزولیوشن پاس ہونے کے بعد طلبہ کو ایک حکم محکم قضا شیم کی شان سے سُنا یا گیا جس کے آگے سر جھکانے سے طلبہ نے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ آخر انتظار کے بعد طلبہ علٰحدہ کر دیے گئے جنھوں نے لکھنؤ ہی میں رہ کے اپنا جدا مدرسہ جاری کیا۔ اور اپنے اُسی نصاب کی تعلیم جاری کرا دی۔

طلبہ کی اسٹرائک سے پہلے ہی بعض بزرگان ملت نے ندوہ کی بدنظمیون اور
بے ضابطگیون کو دیکھ کے "اصلاح ندوہ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی - اور اس
بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اول تو ندوہ کے اصول و قواعد کیا اور کیسے ہین
اور دوسرے یہ کہ برے بھلے جیسے قواعد ہون اُن پر کہان تک عمل درآمد ہوتا ہے

مگر خرابی یہ ہے کہ ندوہ کی کارروائیون پر اعتراض ہوتے دیکھ کے ٹرسٹیان
علیگڈھ کالج کو اپنی دستار بھی مرکز ثقل سے ہٹی ہوئی نظر آئی اور اپنی گرتی ہوئی
چھت مین پشتیان لگانے کی غرض سے وہ بھی ارکان انتظامی ندوہ کے ہم آہنگ ہوکے
کہتے ہین کہ مقررہ ذمہ دار جماعت کے اقتدارات مین دخل دینے کا حق کسی کو نہین
حاصل ہے - بیشک - پبلک کی عام مخالفت سے سلطنتین پلٹ سکتی ہین برطانیہ
عظمی کی پارلیمنٹ ٹوٹ سکتی ہے - حکومتین اپنے قوانین مین رد و بدل کر سکتی
ہین - مگر علیگڈھ کالج کے ٹرسٹیون اور ندوۃ العلما کے ممبران انتظامی کے
اقتدارات پر کوئی اثر نہین پڑ سکتا - ساری دنیا کہتی ہے کہ سکرٹری صاحب
علیگڈھ کالج بدلنے کے قابل ہین - مگر ٹرسٹیون کا مجمع علی رغم انف مسلمانان
ہند اُن پر اطمینان کا ووٹ پاس کرتا ہے - مگر یاد رہے کہ یہ "من ترا حاجی
بگویم تو مرا ملا بگو" کی کارروائی زیادہ زمانے تک نہین چل سکتی -

---

ریویو

سیر پنجاب - سرکار آصفیہ حیدرآباد دکن کے سابق مدار المہام مہاراجہ سرکشن
پرشاد یمین السلطنۃ بہادر نے پار سال ایک سفر کیا تھا - ۲۶ر جون سنہ ۱۳ع
کو گھر سے نکلے تھے اور اجمیر - بمبئی - دہلی - ہردوار - رڑکی - پیران کلیر - امرتسر
لاہور - کورکشیتر - پانی پت متھرا - فتح پور ہسوہ - الہ آباد - جبل پور کی سیر کرکے
۱۴ر اگست سنہ الیہ کو واپس آگئے - ہمین افسوس ہے کہ لکھنؤ ایسے روشن
خیال رئیس اور ایسے صوفی منش سیاح کی زیارت سے محروم رہ گیا اپنے اس سفر کے حالات مین آپ نے اپنا
سفرنامہ "سیر پنجاب" کے نام سے شایع فرمایا ہے جو اچھا چھپا ہے - اور ۶۴ صفحون پر ختم ہوا ہے

مہاراجہ بہادر کا علمی و ادبی مذاق بہت اچھا ہے - اثناے سفر مین اکثر مجمعون مین آپ نے جو تقریرین کی ہین - اور رجا بجا طبیعت کو حاضر پا کے جو کلام موزون کیا ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - شاعرانہ نازک خیالیون کے علاوہ آپ تصوف کے رنگ مین ڈوبے ہوے ہین - اور سفرنامہ بتا رہا ہے کہ آپ جہان جاتے ہین اتفاق و اتحاد کے پُرجوش مشنری بن کے پہونچتے ہین - ہندو مسلمان دونون فریقون کے بزرگون اور معبدون کا ادب کرتے اور ہر جگہ تصوف کے جذبات سے دونون مین قدرت الٰہی کے جلوے دکھاتے جاتے ہین - جن حضرات کو دیکھنے کا شوق ہو مہاراجہ بہادر دام اقبالہ سے طلب فرما کے ملاحظہ فرمائین -

سفر حج کی صوغاتین - اکثر حجاج حج سے شرفیاب ہو کے اپنے دوستون کے لیے طرح طرح کی صوغاتین لایا کرتے ہین مگر ہمارے مکرم دوست مولانا محمد الدین صاحب ایڈیٹر صوفی (پنڈی بہاء الدین ضلع گجرات) گذشتہ موسم حج مین حج کعبہ و زیارت عتبات عالیات سے مشرف ہو کے مسلمانون کے لیے ایسی صوغاتین لائے ہین جن کے ذریعہ سے تمام مسلمانون کو وہی جلوے دکھا دیے ہین جو خود دیکھ آئے ہین - خانہ کعبہ اور دیگر متبرک مقامات کی فوٹو اور ایک روضہ رسول و مسجد نبوی کا نقشہ - تصویرین تو ہوتی ہی ہین مگر یہ نقشہ نہایت ہی اچھی چیز ہے جس مین بتا دیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کا رقبہ اصل مین کتنا تھا پھر اُس مین حضرت عمر فاروق - حضرت عثمان ذی النورین - ولید بن عبد الملک - مہدی عباسی اور سلطان عبد المجید خان نے اپنے اپنے وقتون مین کس کس جانب اور کس کس قدر زمین اضافہ کیا - یہ نقشہ کپڑے پر چڑھا ہوا اور رنگین ہے - مسلمانون کو چاہیے کہ ان ہدیون کو مولانا ممدوح سے منگوا کے اپنے گھر مین رکھین -

معلومات

اس نام کا ایک اعلیٰ درجہ کا نیا ماہانہ رسالہ دلگداز پریس مین چھپ کے جناب حکیم محمد عبد الوالی صاحب بی - اے کی ایڈیٹری مین جولائی سنہ ۱۹۱۴ء سے شایع ہونا شروع ہو گا - مضامین نہایت ہی مفید اور علمی ہون گے - اور امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب کا بے مثل علمی مذاق اس رسالے کے ذریعہ سے اُردو کی ادبی و علمی دنیا مین بہت کچھ اضافہ کرے گا - یہ رسالہ ۲۰×۳۰ کے پیمانے کے ۶۴ صفحون پر ہو گا - کاغذ عمدہ ولایتی ہے گا اور چھپائی نہایت واضح اور روشن ہو گی - قیمت جملہ شایقین کو پانچ روپیہ سالانہ - ملک کو اپنی قدر دانی کا ثبوت دینے کے لیے فوراً رسالہ معلومات کا خیر مقدم ادا کرنا چاہیے - اُس کے متعلق تمام خط و کتابت حکیم عبد الوالی صاحب بی - اے - ایڈیٹر معلومات سے "محلہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ" کے پتہ پر کی جاے -

نامہ نگار منیجر معلومات -

دلگداز

اردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

نمبر ۵ جلد ۱۶

مئی سنہ ۱۹۱۴ عیسوی۔ مطابق جوزا ۱۳۴۳ سنہ احمدی

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

دلگداز! دلگداز! دلگداز!!!

۱۸۸۷ء سے مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر کی ایڈیٹری مین نکل رہا ہو۔ مضامین نہین تیرو نشتر یا ایسی چشم فتان کی نگاہ ناز ہین جو دل مین اترتی اور دل ہی دل مین رہ جاتی ہے اعلیٰ درجے کے ادبی اور تاریخی مضامین ہوتے ہین ختم سال پر بشرط خریداری سال بعد مولانا شرر کا ایک نیا ناول خریداران دلگداز کو مفت دیا جاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ مع محصول ڈاک (سالانہ)

المشتہر منیجر دلگداز کٹرہ بزن بیگخان۔ لکھنؤ

مولانا شرر کی کتابون کے نئے لائبریری ایڈیشن

نفیس مزاج قدردانان علم کے لیے مولانا شرر کی نئی اور پرانی کتابین بڑے اہتمام کے ساتھ مرصع مسطر چھاپی جاتی ہین۔ جن کی نفاست دیکھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلۂ طبع کا نام لائبریری ایڈیشن رکھا گیا ہے۔ جو حضرات پہلے سے اجازت دے دیتے ہین۔ اُن کا نام لائبریری ایڈیشن مین درج کر لیا جاتا ہے۔ اور تیار ہوتے ہی ہفتہ عشرہ پہلے اطلاعی کارڈ بھیجکے بلا انتظار جواب وی۔ پی بھیجدی جاتی ہین۔ مجلد کتابون کے خریدارون سے اصل قیمت پر ۱۲ر کے حساب سے اضافہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر علمی مذاق کی مربی گری منظور ہو تو فوراً لائبریری ایڈیشن کے رجسٹر مین اپنا نام درج کرا لیجیے

نمبر ۱۔ افسانۂ قیس۔ مجنون عامری کی لائف جو از سر نو مکمل کی گئی ہے۔ قیمت فی جلد ۔۔۔۔۔۔ ۲ر

نمبر ۲۔ قیس و لبنیٰ۔ مشہور عاشق عرب قیس بن ذریح عذری اور اس کی معشوقہ لبنیٰ کے حالات کو ایک نہایت پر اثر اور دلچسپ ناول کا لباس پہنایا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ۔۔۔۔۔۔ عہ

نمبر ۳۔ حسن بن صباح۔ بانی فرقہ باطنیہ کے حالات زندگی و اس کی تعلیمین اُس کا علم و فضل اور اُس کے سرکٹ فدائی ۔۔۔۔۔۔ ۱ر

نمبر ۴۔ عصر قدیم۔ ایک نہایت مکمل اور سلجھی ہوئی تاریخ جس مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کی تمام قومون اسرائیلیون مصریون اسیریا و بابل والون۔ ایرانیون۔ یونانیون مقدونیون رومیون۔ ساسانیون۔ بطلیموسیون وغیرہ کے اجمالی حالات مین ۔۔۔۔۔۔ عہ

نمبر ۵۔ آغا صادق کی شادی۔ لکھنؤ دربار شاہی کی ایک با مذاق تصویر کس کی دُلہن کس کے ساتھ قیمت ۔ ۱ر

نمبر ۶۔ فلورا فلورنڈا۔ اندلس کا آخری دور مسلمانون کی برداشت اور مسیحیون کا احمقانہ تعصب نہایت دلچسپ اور پر اثر تاریخی ناول۔ قیمت ۔۔۔۔۔۔ عہ

المشتہر حکیم محمد سراج الحق منیجر دلگداز۔ کٹرہ بزن بیگخان لکھنؤ

حسن کی کرشمہ سازیان

اس عنوان کے تحت میں دلگداز کے مضمون پر ہم دنیا کی بہت سی نامور عورتون کے حالات لکھ چکے ہین - اور ابھی صدہا ایسی عورتین باقی ہین جن کے واقعات آیندہ بیان کیے جائین گے - لیکن اس دلچسپ سبجکٹ پر ایک عام بحث کی بھی ضرورت ہے - جس کی طرف اب ہم توجہ کرتے ہین - بہ لحاظ ترتیب اس بحث کو سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا - لیکن مضائقہ نہین - ایک ماہانہ رسالے کے مضمون کو ایسی مصنفانہ ترتیب سے ہمیشہ آزاد رہنا چاہیے - سچ پوچھو تو عورت کے حُسن کی کشش ہی نوع انسان کو دنیا مین لائی ہے - اگر حضرت آدم جناب حوا کی باتون مین آ کے خدا کا منع کیا ہوا پھل نہ کھاتے تو غالباً دنیا انسانون سے خالی ہوتی - جناب حوا کے فقرے مین آ کے حضرت آدم نے جنت الفردوس اور وہان کی آزادیان اور بےفکریان ہاتھ سے کھو دین - اور وہ اس دنیا مین پھینکے گئے جہان اُن کی اولاد کو ایک سخت آزمایش مین پڑنا اور محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ بھرنا ہے -

جنت سے جدا ہونے کے بعد بھی اگر انسان کی حالت پر غور کیجیے تو صاف ظاہر ہو ہے کہ وہ صرف اس لیے آیا ہے کہ مرتے دم تک حسن کے کرشمون مین مبتلا رہے -

اور اسی دُھن مین جان دے۔ اُس کی زندگی و موت دونون حسن کے کرشمون سے وابستہ ہین جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے سب حسن ہی کی کرشمہ آرائیان ہین۔ توالد و تناسل کا سلسلہ اور گروہ انسان کا بڑھنا اور پھیلنا فقط اُسی کشش کے نتائج ہین جو خدا نے حسن مین پیدا کر دی ہے۔ اور اب تو سائنس کی تحقیق و تدقیق یہان تک ثابت کر چکی ہے کہ انسان ہی نہین حیوان بھی۔ اور حیوان ہی نہین سارے نباتات بھی اپنی بقا اور ترقی مین کشش حسن ہی کے زیربار احسان ہین۔

یہ تو دنیوی زندگی کی حالت تھی۔ اب موت کو لیجیے۔ ہر نیکوکار و دیندار کا خیال ہے کہ دوسرے عالم مین جا کے اُس روحانی اور نورانی عالم مین حورون کی ہمکناری نصیب ہو گی۔ چنانچہ ہر پاکباز مرنے والا حورون سے ملنے کے شوق کو دل مین لیے ہوئے دنیا سے خوش خوش جاتا ہے۔ گویا وہ نہین جاتا بلکہ حوران جنت کے حسن کی کشش وہان کھینچ لیجاتی ہے۔ مسیحیون کے نزدیک حورون کے علاوہ فرشتہ بھی آسمانی کنواریان ہین جو مقبول بندون اور خدا رسیدہ ولیون اور سنیٹون کے سرون پہ کوہ قاف کی زاہد فریب پریون کی طرح معشوقانہ ادائون سے آتے اور منڈلانے لگتے ہین۔

نسل ابراہیمؑ کی ملتون مین تو اُس عالم نور کے مہوشون کا خیال ثواب آخرت اور نیکوکاری کے اجر تک محدود ہے دوسرے قدیم ادیان و ملل پر نظر ڈالیے تو نازآفرین حسینان عالم بالا نے دلربائی و دلبری کے درجے سے قدم آگے بڑھا کے معشوقی سے معبودی کی وضع و شان اختیار کر لی ہے۔ اُن کے الٰہیات کا عنصر اعظم مہ جبین دیویان ہین جو قدرت کے تمام شعبون پر متصرف و حکمران ہین۔ اُن کے نزدیک خدائی اختیارات حسین دیویون ہی مین بٹے ہوئے ہین۔ جو پاکبازان ارض پر اپنے چاند اور سورج کے ایسے حسن عالم آشوب کی کرنین ڈال کے اُنھین اپنا پوجاری بناتی ہین۔ اور حسن ہی کی کشش ہے جس سے خدا کی معبودیت اور مخلوق کی عبادت وابستہ ہے۔

حسن کی کشش ایسی زبردست ہے کہ غور سے دیکھیے تو وہی انسان کی بنانے

اور بگاڑنے والی ہے - اور خدا نے واقعی اُس مین ایک ایسی قوت پیدا کر دی ہے جو انسان سے جیسے کام چاہتی ہے کرا دیتی ہے - جنت کا چھوٹنا کوئی معمولی نقصان نہ تھا جو یہ اتنا بڑا نکھرتا تھا کہ اگر آدمی مین اپنی طبیعت پر ذرا بھی قابو ہوتا تو قیامت تک عورت کے پھندے مین نہ پھنستا - اور پھر کبھی اُس کے دل پر حسن کی کشش کوئی اثر نہ کرتی - مگر نہین - ایسا نہ ہوا بلکہ یون کہنا چاہیے کہ نہ ہو سکا - اُس کے دنیا مین آنے کے بعد بھی جو پہلا فتنہ ہوا وہ بھی عورت کی اور حسن کی کشش ہی کی بدولت تھا - ہابیل نے عورت کی زلف گرہ گیر مین پھنس کے نہایت ہی نیک نفسی اور پورے رضا و تسلیم کے ساتھ جان دی - اور قابیل نے عورت ہی کے شوق مین بھائی کے خون مین ہاتھ رنگے - اور پہلا قتل عمد کا مجرم قرار پایا - اس کے بعد سے دنیا کے تمام تاریخی واقعات کی تہ مین دیکھیے تو حسن و عشق کے کرشمون سے بھری ہوئی ہے - اور یہ بات تھوڑے تعجب کی نہین کہ مذاہب جن کی غرض و غایت خدا پرستی اور نظام عالم کی اصلاح ہے سب کی تاریخ کا آغاز عورت کی کشش اور حسن کے جھگڑون ہی سے ہوا ہے - یہود و نصاری اور مسلمانون ہی کی تاریخ کو دیکھیے جس کا متحدہ و مسلمہ افتتاح آدم و حوا اور ہابیل و قابیل کے واقعات سے ہے جن کو ہم بیان کر چکے ہین -

ہندوؤن کی دیومالا اپنے شروع ہی سے ہر بڑے سے بڑے دیوتا کی ایک دیوی ثابت کرتی ہے - اور اُن کی تاریخ کا آغاز دو عظیم الشان لڑائیون سے ہوتا ہے جو اگر سچ پوچھیے تو حسن و عشق ہی کے جھگڑے - اور دروپدی - اور سیتا جی کے بے مثال حسنون کے کرشمے تھے - وہ کیسی نازک اور اندوہناک گھڑی تھی جب دروپدی نہایت توہین اور سنگدلی کے ساتھ پانڈون کے ہاتھ سے زبردستی چھینی گئی ؟ اور پھر وہ کتنا بڑا قیامت خیز میدان جنگ تھا جس مین اِس ایک عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کا انتقام لاکھون آدمیون کے قتل سے لیا گیا ؟ اسی لیے وہ کیسا جگر خراش وقت تھا جب کیکئی کی آتش فشان زبان نے راجہ دسرت کو رام چندر جی کے بن باس پر مجبور کیا - اور اس کے بعد وہ بھی کس بلا کی عالم سوز گھڑی تھی جب رات دن

سیتا جی کو اُن کے وحشت ناک جنگلی مسکن سے اُڑا لے گیا - اور پھر ان دونوں واقعات کے نتیجہ مین وہ کیسا خون بار محشرستان تھا جب لاکھون آدمیون کے مارے جانے کے بعد رام چندر جی نے اپنی عصمت مآب رانی کو خانمان برباد دشمنون کے پنجۂ ستم سے چھڑایا ؟

اب مشرق کو چھوڑ کے مغرب مین چلیے تو وہان بھی مذہب اور تاریخ کا آغاز حسن کے اُن قیامت زا کرشمون سے ہوتا ہے جنھین عالم شاعری کے آدم اور یونان کے پہلے شاعر ہومر نے اپنی قدیم نظم ایلیڈ مین بیان کیا ہے - اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی سنسنا دینے والی گھڑی تھی جب ایشیاے کوچک کے فرمان روا پریم کا حسین و خوبرو بیٹا پارس یونان کے بڑے دیوتا جیوپیٹر کی بیٹی اور منی لاؤس شاہ یونان کی ملکہ ہلین کو بھگا لے گیا - اور پھر اس کے بعد وہ کیسی ہیبت ناک رزمگاہ تھی جس مین یونانیون نے اس مملکت کے دارالسلطنت ٹراے پر چڑھائی کر کے خون کے دریا بہا دیے - اور جس کے واقعات بتا رہے ہین کہ یورپ و ایشیا کے مابین جو جھگڑے شروع ہوئے وہ حسن کی کرشمہ سازیون کے کیسے خوفناک نتائج تھے -

دنیا کے سب سے پہلے مورخ یونان ہیرودوٹس نے اپنی تاریخ کو اسی قسم کے واقعات سے شروع کیا ہے - ایشیا والون کی قدیم روایتون سے یہ پتہ نہین چلتا کہ کبھی اُن کا خیال بھی اس جانب گیا ہو کہ اہل یورپ سے اُن سے رقابت و عداوت ہے - مگر اہل یونان اور ایشیاے کوچک والے جو ایک دوسرے کے پڑوس مین آباد تھے اُن مین ابتدا ہی سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی - اس کے چند روز بعد یونانیون سے اُن چند دوسری قومون سے رقابت پیدا ہوئی جو اُن کے ملک تک پہونچتی تھین - ان لوگون کی دست برد سے انھون نے پورے ایشیا کو اپنا دشمن خیال کر لیا - حالانکہ ایشیا والے ان معاملات کو سوا شخصی بے اعتدالیون کے کسی عام اور قومی عداوت پر محمول نہین کرتے تھے - تاہم اس مین شک نہین کہ درۂ دانیال کے اس پار اور اُس پار والون مین ایک قسم کی قومی رقابت ضرور پیدا ہو گئی تھی -

لیکن ہیرو دوطوس کہتا ہے کہ یورپ اور ایشیا والون مین مدت ہاے دراز اور قرن ہا قرن سے جو جھگڑے چلے آئے ہین وہ شایستہ اور تعلیم یافتہ اہل فارس کے نزدیک صرف عورتون کے لئے بھاگنے یا بھگائے جانے کے نتائج ہین۔ وہ کہتے ہین کہ سب سے پہلی چھیڑ فنیقی تاجرون نے کی۔ یہ لوگ ملک شام کے ساحلی علاقہ فینقیہ کے رہنے والے تھے۔ دنیا کے پہلے تاجر اور پہلے جہاز ران تھے۔ بحری سفرون کے ذریعے سے اُنھون نے اپنی تجارت اُسی قدیم زمانے مین ممالک دور و دراز پھیلا رکھی۔ اور مصر و بابل کا مال لے کے ممالک و بلاد یورپ تک جا پہونچے

اُنھین تاجرانہ سیاحتون مین اُن کے چند جہاز یونانی بندرگاہ ارغوس مین پہونچے اور مال تجارت اہل شہر کے سامنے پیش کیا۔ ارغوس اُن دنون یونان کے اکثر شہرون سے زیادہ بارونق تھا۔ اُمرا و اکابر یونان آ آ کے اُن کا مال خریدنے لگے۔ اور دریا کنارے بڑا بھاری بازار لگ گیا۔ اس بازار کو لگے چار ہی پانچ روز ہوئے تھے کہ ایک دن معزز یونانی گھرون کی خاتونین اپنی پسند کا سودا خریدنے کو آئین۔ جن مین وہان کے فرمان روا شاہ ایناچوس کی حسین و گل اندام بیٹی ایو بھی تھی۔ یہ عورتین جہاز کے پچھلے حصہ کے پاس کھڑی لین دین کر رہی تھین کہ یکایک فنیقی سوداگرون نے اُن پر حملہ کر دیا۔ نازک بدن عورتین مردون کے اس حملے کی بھلا کیا تاب لا سکتی تھین؟ گھبرا کے بھاگین۔ اور سب اپنی جان بچا کے نکل آئین مگر شاہزادی ایو اور اُس کی چند سہیلیان نہ بھاگ سکین۔ فنیقی اُنھین اپنے جہاز مین پکڑ لے گئے۔ جھٹ پٹ لنگر اُٹھا دیا۔ اور مصر مین پہونچ کے دم لیا۔

یونانیون کو اس کا بڑا ملال ہوا۔ ایو تو نہ ملی۔ مگر انتقام کے خیال سے اُن کے چند جہاز سرزمین شام کے ساحل شہر طائر مین پہونچے جو فنیقی لوگون کا منشا و مادی تھا۔ اور ایسی تدبیرین کین کہ وہان کے بادشاہ کی بیٹی شاہزادی یوروپا کو بھگا لے گئے۔

اس واقعے سے یونانیون کو اپنا انتقام مل گیا تھا مگر اُنھین اتنے ہی مین صبر نہ آیا۔ اُن کے چند اور جہاز بحر اسود مین (جو اُن دنون یوحسین کہلاتا تھا) سفر کر کے

دامن کوہ قاف کے اُس ساحل پر پہونچے جہاں فی الحال اُبا زی مسلمان رہتے ہیں۔ یہ سرزمین اُس زمانے میں کولچس کہلاتی تھی۔ اُس میں دریاے فاسس کے کنارے ایا نام ایک ساحلی شہر تھا اور وہین یہ یونانی جہاز لنگر انداز ہوئے تھے۔ اپنی مہم کے اغراض و مقاصد پورے کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے یہاں کی گل پیرہن اور جادو نگاہ عورتوں کو دیکھا جن کے حسن و جمال کی ساری دنیا میں شہرت تھی اور جن کے حسن کے کرشمون نے کوہ قاف کی پریوں کو حسن و جمال کا مکمل ترین نمونہ بنا رکھا تھا۔ غرض نہایت خاموشی کے ساتھ کوشش کر کے وہ کسی حکمت سے وہان کے بادشاہ کی بیٹی شاہزادی میڈیا کو اپنے جہاز پر لائے۔ اور اُسی وقت لنگر اُٹھا کے اُسے زبردستی یونان میں بھگا لائے۔

کولچس کے بادشاہ کو اپنی بیٹی کے پکڑ جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اپنے ایلچی یونان میں بھیجے جنھوں نے آ کے یونانیون سے اس دست برد کا جواب طلب کیا۔ اور استدعا کی کہ شاہزادی میڈیا اُن کے حوالے کی جائے تاکہ اُسے لیجا کے اُس کے جگر چاک باپ کے سینے سے لگا دین۔ یونانیون نے جواب دیا وہ جس طرح ایشیا والون نے ہماری شاہزادی ایو کے بھگائے جانے کی کوئی وجہ نہین بیان کی اور نہ اُسے واپس کیا اُسی طرح ہم بھی نہ شاہزادی میڈیا کو واپس کرین گے اور نہ اس کی کوئی وجہ بیان کرین گے کہ اُسے کیون بھگا لائے۔

ایشیا والون میں یونانیون کی اس دست برد کا انتقام لینے کا خیال برابر قائم رہا یہان تک کہ ایک نسل گزر گئی اور پریَم کا بیٹا اس بات کے درپے ہوا کہ کسی یونانی شاہزادی کو بھگا لا کے اپنی جورو بنائے۔ چنانچہ موقع پا کے وہ ہلین کو بھگا لایا۔ اور اُس کے نتیجے مین ایشیاے کوچک کے شہر ٹراے کا وہ میدان گرم ہوا جس کا ذکر ہومر نے کیا ہے۔

گزشتہ واقعات پر راے زنی کرتے وقت بقول ہرودوطوس کے ایشیا والے اور اہل فارس کہتے تھے کہ شاہزادیون کے بھگا لیجانے کے واقعات اگرچہ تابڑ توڑ دونون طرف سے پیش آئے۔ اور ابتدا اہل ایشیا ہی سے ہوئی تھی مگر اصلی الزام یونانیون ہی پر ہے۔ اس لیے کہ ہلین کے بھگا لیجانے پر اُنھون نے

پیچھے سے باہر ہو کے لڑائی ٹھان دی۔ ایرانی ان باتون کو اتنی اہمیت نہ دیتے تھے کہ ان کی وجہ سے لڑائی ٹھان دین۔ اُن کے خیال مین عورتون کو جھگڑا جاتا بے شک شرارت کا کام تھا لیکن ایسا ہو جائے تو اُس کی بنا پر انتقام کے درپے ہو جانا اور قتل و خونریزی کرنا اُن کے مذاق مین ایک لغو فعل تھا اور وہ کہتے کہ عقلمندون کا یہ کام نہین ہے کہ ایسے واقعات کی پروا کرین۔

بہرحال یورپ کی مہابھارت یعنی ٹرائے کا محاصرہ اور یورپ و ایشیا کی سب سے پہلی معرکہ آرائی حسن ہی کی ایک دلچسپ کرشمہ آرائی تھی جسے ہومر نے ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمو

نواب سعادت علی خان نے سنہ ۱۲۲۶ محمدی (سنہ ۱۷۹۸ء) مین تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزون کی نذر کر دیا۔ مشہور یہ ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و ناامید بنارس مین پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہونچی نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت کیا اور مسند حکومت پر وزیر علی خان بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی امیدین بھی خاک مین مل گئین۔ اِس قطعی یاس کے عالم مین تھے کہ بنارس کے کسی یوروپین حاکم نے آ کے پوچھا "نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیجیے گا؟" جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل مین اُس کی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے؟ بے اختیار زبان سے نکلا "آدھا ملک انگریزون کی نذر کر دون گا۔" یہ وعدہ سُن کے اُس انگریز حاکم نے کہا "تو آپ خوش ہون۔ اور مین آپ کو خوش خبری سُناتا ہون کہ آپ ہی فرمانروائے لکھنؤ منتخب ہوئے ہین۔" سعادت علی خان یہ مژدۂ غیر مترقبہ سُن کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سناٹے مین آ گئے۔ اور آخر تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفا مین اپنی آدھی قلمرو بانٹ دینا پڑی۔ جس کا کانٹا زندگی بھر اُن کے دل

مین کھٹکتا رہا۔

انگریزی تاریخون مین اُن سے وعدہ لیے جانے کا ذکر تو نہین ہے مگر اس کو سب تسلیم کر رہے ہین کہ نواب سعادت علی خان کو چونکہ انگریزون نے تخت پر بٹھایا تھا اس لیے اُنھون نے اپنا آدھا ملک شکریہ کے طور پر انگریزون کی نذر کر دیا۔ بہر تقدیر جو کچھ ہو سعادت علی خان کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدھی رہ گئی۔ لکھنؤ کے پُرانے لوگون مین مشہور ہے کہ اسی کو فت مین سعادت علی خان نے نہایت ہی کفایت شعاری سے کام لے کے اور تحصیل وصول مین بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے بائیس تئیس کروڑ روپیہ جمع کیا۔ اور انگلستان مین برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ بعوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُن کو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُن کے سالے نے کسی سازش مین شریک ہو کے زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ

؎ آن قدح بشکست و آن ساقی نماند۔

یہ اور اسی قسم کے بیسیون واقعات مشہور ہین۔ جن کا ثبوت سوا افواہی روایتون کے اور کچھ نہین مل سکتا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ سعادت علی خان اس قدر جُز رس اور منتظم واقع ہوئے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جُز آسانی سے نہ دیا ہوگا۔ دوسرے اُن کے طرز عمل اور اُن کی پالسی مین ایک ایسی مضطربانہ ہوشیاری اور پُر اسرار بیقراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے۔ اور اُن کے تیور بہت ہی پُر معنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے اُنھین سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت کی نصف آمدنی گھٹ گئی۔ اور آصف الدولہ مرحوم نے مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ اُنھین اپنے دربار کے مصارف گھٹانے پڑے جو نہایت ہی مشکل چیز تھی۔ اس کوشش مین اُنھون نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنی ادنی رقمون پر نظر ڈالی۔ معافیون اور جاگیردون کی

نہایت سختی کے ساتھ تھان بنا ان کی۔ دربار کے مصارف مین جہان تک بنا کمی کی۔ غرض جس طرح ہو سکا بدنامیان اٹھاکے اور لوگون پر سختیان کرکے انھون نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروائیان دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ تو سعادت علی خان کی لیاقت و خوش تدبیری کے قائل ہو گئے مگر عوام مین بے انتہا ناراضی پھیلی۔ ایک طرف ان معافی داروں اور جاگیرداروں کا گروہ شاکی تھا جن کی جائدادین ضبط ہوئی تھین۔ دوسری طرف وہ فضول اور از کار رفتہ ملازمین رو رہے تھے جن کی تنخواہیں تخفیف مین آگئی تھین۔ اسی قدر نہین ملک مین ایک بڑا بھاری گروہ ان لوگون کا بھی تھا جو وزیر علی خان کے طرفدار تھے۔ اُن کو جائز اور سچا حقدار سلطنت خیال کرکے سعادت علی خان کو غاصب بتاتے تھے۔ غرض ملک مین ہزارون دشمن تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر نہ حملہ کر بیٹھین علاوہ فوج بھی نئے نواب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بیشمار فوج کا ٹڈی دل جو نواب شجاع الدولہ کے عہد مین جمع تھا اُس مین آصف الدولہ ہی کے زمانے مین سرکار انگریز بہادر کے مشورے سے تخفیف شروع ہو گئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیون اور فضول خرچیون نے بہلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ نہین بلند ہونے پائی۔ سعادت علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی اور اُس کے ساتھ جز رسی بھی اختیار کی تو ہر طرف ہائے ہائے پڑ گئی۔ اور رجو تھا اُن کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدون اور سرکشون کی سرکوبی کے لیے اور نیز امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک بیرونی زبردست قوت کا ہر وقت شہر مین موجود رہنا بہت ہی ضروری تھا۔ جس کی نسبت سُنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

زبان زد روایان اودھ نے اس سے بیشتر اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی

سادگی ظاہر کی تھی - پہلے تین حکمرانون یعنی نواب برہان الملک نواب صفدر جنگ - اور نواب شجاع الدولہ نے جن تین سادے مکانون مین زندگی بسر کی وہ بھی اُن کی ذاتی ملکیت نہین بلکہ کرائے پر تھے - انھون نے اپنا اصلی مکان یا تو میدان جنگ کو خیال کیا یا ساری مملکت کو جس مین دورہ کرتے رہتے اور ساری مملوکہ زمین کے ہر حصہ کو اپنا مسکن و مکان تصور کرتے نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی عشرت پسند تھے - عیاشی و فضول خرچی مین بدنام تھے مگر اُن کے لیے بھی صرف ایک سادہ پرانی قطع کا مکان یعنی مچھی بھون کے قریب دولتخانہ کافی تھا - حالانکہ اُنھین عمارت کا بڑا شوق تھا - اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ بیس لاکھ روپیہ ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر مین صرف کر دیے اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک - مختلف بازارون - منڈیون - پلون اور سراؤن وغیرہ کی تعمیر مین خرچ کی - غرض پہلے تین فرمانروا اُن کا شوق تعمیر اگر قلعون - گڑھیون کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے مین پورا ہو تا تھا تو آصف الدولہ کا شوق پائداری کی عمارتون یا نفع رسانی خلق اللہ کے کامون مین - اس کے ساتھ عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک نبھتا چلا جاتا تھا - آصف الدولہ کے زمانہ تک کی عمارتین قدیم مذاق تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہین - دہلی و آگرے مین شاہجہان بادشاہ کو اعلیٰ درجے کا سنگ رخام اور سنگ سرخ قریب کی کانون مین مل گیا تھا جس نے وہان کی عمارتون مین خاص قسم کی نفاست اور اعلیٰ درجے کی شان پیدا کرا دی - لکھنؤ مین پتھر کا ملنا غیر ممکن تھا - اور آگرے اور جے پور سے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو منگوانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی - آصف الدولہ نے اینٹ اور چونے سے وہی کام لیا - اور ویسی ہی شانداری دکھا دی -

نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شعاری - جزرسی - اور روپیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانون اور عمارتون کا شوق تھا - مگر افسوس اُن کا یہ شوق کلکتہ وغیرہ مین رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتون کے دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہو گیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتون سے وہ پرانی خصوصیتین

جب اٹھ گئین - اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا -

لکھنؤ مین اس انقلاب تعمیر کا اصلی باعث کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب سعادت علی خان کی غریب الوطنی خانہ بدوشی اور اقوام یورپ سے ملنا جلنا تھا اور زیادہ تر یہ چیز تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دو ایک کوٹھیان یہان بنوا کے ایک نئی وضع عمارت فرمانروا اُون کے سامنے پیش کر دی جو بلحاظ مضبوطی کے ناقص اور باعتبار ضروریات زندگی کے نہایت ہی دلفریب تھی - جن عمارتون کی حالت بالکل اُن کھلونون کی سی تھی جو بچون کے ہاتھ مین دے دیے جاتے ہین - اور روز ٹوٹتے اور نئے خریدے جاتے ہین - ناقدین یورپ تنقید کرتے وقت بڑے زور و شور سے اعتراض کرتے ہین کہ آصف الدولہ کے بعد والے فرمانروایان لکھنؤ کا مذاق عمارت بالکل بگڑ گیا تھا - اور اُن کی تمام عمارتین لڑکون کے کھلونے یا لڑکیون کے گھروندے ہین - مگر ادھر توجہ نہین کرتے کہ یہ مذاق بگاڑا کس نے ؟ کہا جاتا ہے کہ یہان کا قومی مذاق اس لیے بگڑ گیا کہ یہان دراصل کوئی قوم تھی ہی نہین - اور اس کا خیال نہین کیا جاتا کہ یہان کی قومیت کو کس نے بگاڑا - اور کس کی کرشمہ سازیون نے لوگون سے اُن کی پرانی وضع چھڑا دی - سچ یہ ہے کہ ؎ اے بادصبا این ہمہ آوردۂ تست -

سعادت علی خان نے پہلی کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپیہ پر جنرل مارٹن سے مول لی - اُسی مین رہنا شروع کیا اور اُس کے متصل اور کئی مکانات بنوائے پھر وہان سے قریب ہی صاحب رزیڈنٹ کی سکونت کے لیے ٹیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کھنڈر رزیڈنسی کے اندر پڑے ہوئے ہین - اس کے بعد اپنے دربار کے لیے اُنھون نے لال بارہ دری تعمیر کرائی جس مین اب کتب خانہ ہے - اور اُن دنون قصر السلطان کے نام سے مشہور تھی - اس کے علاوہ دریا پار اُنھون نے دلآرام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی - اور اسی سلسلے مین ایک بلند ٹیلے پر جو اب صدر یعنی لشکر گاہ لکھنؤ کے علاقے مین واقع ہوا ہے اور جہان سارے شہر گرد کے میدانون اور دریا کا دلکش منظر نظر کے سامنے ہو جاتا ہے ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کی - اور دلکشا اُس کا نام رکھا - اُسی طرح ایک

اور کوٹھی تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا - مگر دو کوٹھی نواب سعادت علی خان کے بعد کے فرمان روایان اودھ کے استعمال مین نہین رہی - اُس مین غدر سے پہلے میجر بینک رہتے تھے - اور غدر کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو معزز یورپین اودھ کے چیف کمشنر مقرر ہو کے آتے اُسی کوٹھی مین قیام کرتے -

مذکورہ بالا کوٹھیون کے علاوہ نواب ممدوح نے مشہور عمارتین منور بخش اور خورشید منزل بھی تعمیر کرائین - اور چوپڑ کا اصطبل بھی اُنھین کی یادگار ہے - مگر ان سب عمارتون کی تعمیر مین پرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی - اور یورپ سے آئی ہوئی نئی جدتین اختیار کی گئین - اور ظاہر ہے کہ اس بارہ خاص مین لکھنؤ کا کوئی فرمان روا بھی اُن نئی عالیشان عمارتون کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولت برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہرون مین تعمیر ہو چکی ہین یا روز بروز تعمیر ہوتی رہتی ہین - غرض یہی زمانہ ہے جب لکھنؤ مین اُن قدیم مذاق کی عمارتون کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخی وقعت رکھتی ہون - اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیاحون کو اپنی طرف بُلاتی ہون -

نواب سعادت علی خان نے لکھنؤ کے مغربی حصہ مین ایک بڑا گنج بنوایا - اور اُس کی آبادی و رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُس کے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے - اور تاجرون اور دُکانداروں کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے - اُس نے بڑی رونق پائی - اور آج تک باوجودیکہ شہر کی آبادی سے فاصلہ پر اور بالکل الگ واقع ہوا مختلف چیزون کی سب سے بڑی منڈی ہے - اور عالم نگر کا اسٹیشن صرف اُسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے -

سعادت گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نواب ممدوح کے عہد مین قائم اور آباد ہوئے حسب ذیل ہین - رکاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلہ وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج - مقبول گنج - گولا گنج - اور رستوگی محلہ - موتی محل مین جو اچھی اور پرانی

وہ بھی نواب سعادت علی خاں ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ عمارت موجودہ احاطۂ موتی محل میں شمال کی طرف واقع ہے۔ اس میں ایک نہایت ہی نفیس سفید گنبد تھا جس میں کاریگروں نے موتی کی سی آب و تاب پیدا کر دی تھی۔

سعادت علی خاں اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز و مدبر اور اس کے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار و جزرس بلکہ بخیل خیال کیے جاتے ہیں۔ ملک کا انتظام انھوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر ان کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گزشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دور ہو جاتیں۔ اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر دیے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا دل تاج و تخت اور فرماں روائی و جہانبانی سے کھٹا ہو گیا تھا۔ انھیں باتوں سے عاجز آ کے انھوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکار عظمت مدار برطانیہ کے سپرد کر دیا اور سمجھے کہ اب میں اپنے مخصوصہ علاقے میں بے خرخشہ و بے تردد حکومت کر سکوں گا مگر افسوس کہ اب بھی ان کو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا۔ جو ملک ان کے قبضے میں چھوڑا گیا تھا اس میں بھی جابجا انگریزی فوج کے کیمپ قائم کیے گئے۔ اور بڑی مقدار خاص لکھنؤ اور اس کے حوالی میں مقیم ہوئی جس کی سنبھال دشوار تھی۔ اور اس کی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا۔ اس کے مقابل انھیں اپنی بہت سی فوج گھٹا دینی پڑی۔ مگر باوجود ان افکار و ترددات کے انھوں نے جو جو اصلاحیں کیں بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ مگر سب سے عجیب یہ بات ہے کہ بازاروں کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ ان کے دربار میں باکمال لوگوں اور قابل قدر لوگوں کا اتنا مجمع ہو گیا تھا کہ اس وقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبان کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اسی جگہ کھنچ کھنچ کے آتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیاضی ظاہر کیا کرتے ہوں۔ سعادت علی خاں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جزرس اور بخیل تھے۔ مگر اس بخل و کفایت

شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیت دوسرے باکمالون کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی - اور اسی بات نے اُن کے ہاتھون سے لائق لوگون کی بڑی بڑی قدرین کرائین - اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا - جو قابل آدمی جہان ہوتا سعادت علی خان کی قدر دانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیرآباد کہہ کے لکھنؤ کا رخ کرتا - اور یہان آ کے ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا -

۱۲۲۹ھ محمدی (۱۸۱۴ء) مین نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا - اور اُن کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند حکومت پر رونق افروز ہوئے قیصرباغ کی مربع عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور اُن کی بی بی مرشدزادی کے مقبرے ہین - ان دونون مقبرون کی جگہ ایک مکان تھا جس مین نواب غازی الدین حیدر ایام ولی عہدی مین رہا کرتے تھے - باپ کی آنکھین بند ہوتے ہی جب وہ ایوان شہریاری مین گئے تو کہا "مین نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ اپنا مکان اُنھین رہنے کو دے دون" اس خیال کے مطابق نواب مرحوم کو اپنے گھر مین دفن کرایا - اور پُرانا مکان منہدم کرا کے یہ مقبرے تعمیر کرا دیے -

اب غازی الدین حیدر کے عہد مین نہ باپ کی سی بیدارمغزی اور دولت کی قدر تھی - اور نہ اگلے فرمان رواؤن کی سی فوجی سرگرمی - ہان آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اُس مین بھی یہ فرق آ گیا تھا کہ آصف الدولہ کا اصراف بھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی -

غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کرورون روپیہ کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے مین نہایت ہی دریا دلی سے اُڑنے لگا - موتی محل مین ہم کہہ آئے ہین کہ شمالی جانب سعادت علی خان نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی - غازی الدین حیدر نے اُس احاطہ مین دو اور کوٹھیان تعمیر کرائین جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے - شاہ منزل کے

پاس ہی کشتیون کا ایک پُل تھا اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف ہٹی ہوئی تھی - شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اُس مین میلون تک نزہت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا - اُس مین اکثر مست ہاتھی گینڈے اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے اُن کی لڑائی کا تماشا ملاحظہ فرماتے - شیرون کی لڑائی بھی وہین ہوتی جس کے لیے مقفس کٹہرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا - مگر جو چھوٹے غیر آزار رسان جانور لڑائے جاتے اُن کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطہ مین ادن پار ہوتی -

یہ درندون اور وحشی جانورون کے لڑانے کا شوق ہندوستان مین یہان سے پہلے اور کہین نہین سُنا گیا - معلوم ہوتا ہے کہ رزیڈنٹون اور درباری اہل یورپ سے رومیون کے امفی تھئیٹر کے حالات سُن کے جہان پناہ کے دل مین شوق پیدا ہوا - اور رومتہ الکبریٰ والون کی ظالمانہ دلچسپیون کا مذاق لکھنؤ مین بھی پیدا ہو گیا - اور موتی محل مین یہان بھی ایک مختصر امفی تھئیٹر بن کے تیار ہو گیا - غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یوروپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا - اور اُس کا نام ولایتی باغ قرار دیا - وہان سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی - غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے اُنھین "بادشاہی" کا لقب عطا کیا گیا - اس سے پیشتر فرمان روایان اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے اور سوا نواب کے اور کسی اعزازی لقب سے نہین یاد کیے جاتے تھے - اس زمانے تک ہندوستان مین شہنشاہی مغلیہ کی اتنی آن بان باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر حکمرانون مین بٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضہ مین صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہان پناہ وہی تھے - نہ سریر آرایان دہلی کے سوا ہندوستان مین کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا - اُن کے اس غرور کے توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو جنھون نے باپ کے اندوختہ

میں سے بہت سا روپیہ انگریزوں کو قرض دے دیا تھا - شاہی کا خطاب دیا- اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا- چنانچہ اس وقت سے حکمرانان اودھ جو ریذیڈنٹوں کے ہاتھوں کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے - اور آخری فرمان روا واجد علی شاہ کے مرنے تک ان کا سرمایۂ ناز رہے

غازی الدین حیدر نے اسی خطاب شاہی کی یادگار میں دریا پار چھتر منزل کے ایک نیا بازار بسایا اور اُس کا نام بادشاہ گنج رکھا- اسی زمانے میں حکیم مہدی نے مہدی گنج آباد کیا- اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے دُور تک پھیل جانے کی وجہ سے عین وسط شہر میں محلہ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا - اور اسی عہد میں آغا میر کی سرا تعمیر ہوئی -

بادشاہ کو اور اُن سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات میں بہت زیادہ انہماک تھا- صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری تھا- مگر ہندوستان کے عام مسلمان سُنی تھے - نواب برہان الملک چونکہ ولایت سے نئے آئے تھے اس لیے اُن کا اور اُن کے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا- باوجود اس کے زمانے تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا- مگر اس وقت سے بادشاہ اور اُن کے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی - فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی- اور خاندان اجتہاد عروج پا کے سلطنت کا اصلی مقنن قرار پایا-

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا- خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں- جن کی وجہ سے اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا کیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی نرالی اور عجیب ہو گئی-

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس مین اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل مین امام ممدوح کے حالات بیان کرکے ثواب حاصل کر لیا جای تو مضائقہ نہ تھا مگر نہین یہان ہندؤن کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا - اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدون کی خوبصورت لڑکیان سب کے ائمۂ اثنا عشر کی بی بیان قرار دی گئین جن کا نام اچھوتیان رکھا گیا - اور جب وہ امامون کی بی بیان تھین تو پھر اُن کے وہان امامون کی ولادت بھی ہوتی - اور بارھون امامون کی ولادت کی تقریبین بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگین -

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضبناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے - اور رعب و داب اس بلا کا تھا کہ اُن کے سامنے لوگون کے ہوش و حواس بجا نہ رہتے - اُن کے زمانے مین انگریزون سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولی عہد سلطنت تک اُس کے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے - غازی الدین حیدر اُسے گھونسون اور لاتون سے مارتے - جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا - مگر اس کا بدلہ دیگر معززین دربار اور امراے شاہی تک سے لے لیا کرتا -

اس پہلے بادشاہ اودھ نے مذہبی ارادت و عقیدت سے دریاکنارے اور موتی محل کے متصل نجف اشرف یعنی روضۂ مطہرۂ حضرت علی کی نقل لکھنؤ مین بنوائی - اور اُس کی روشنی و خدمت کے لیے بہت سا روپیہ سرکار انگریزی کے حوالے کیا جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے - اور سنہ ۱۲۵۶ محمدی (سنہ ۱۸۲۷ء) مین جب اُن کا انتقال ہوا تو اُسی مین دفن ہوئے -

فقیرون کا بادشاہ

ہندوستان مین معمول ہے کہ لوگون کا ہر گروہ اور ہر طبقہ باعتبار اپنے خصوصیات و اطوار کے دوسرون سے جدا رہتا ہے - اور اُس کے اخلاقی تعلقات اپنے ہی گروہ مین محدود رہتے ہین - اسی امتیاز کی وجہ ہے کہ

ہر گروہ کی بجائے خود ایک گورنمنٹ قائم ہو جاتی ہے جس مین ایک بادشاہ یعنی چودھری ہوتا ہے - اور اُس کی مشیر ایک مجلس وزرا ہوتی ہے جسے پنچایت کہتے ہین -

اس قسم کا نظام تمدن بعض دیگر ممالک مین بھی قائم ہے مگر وہان اس نظام کو ایسی قوت نہین حاصل ہو سکتی جیسی کہ ہندوستان مین ہے - اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے فرزندون مین ذات اور برادری کی ایسی تفریقین واقع ہوئی ہین کہ وہ بالطبع اسی نظام کے خواستگار ہین -

ہمین اپنے ایک قدامت پرست دوست سے معلوم ہوا کہ پچیس تیس سال کا زمانہ ہوا سندیلہ مین ایک پُرانے ہیجڑے کے مرجانے پر قریب قریب شمالی ہند کے کل ہیجڑے جمع ہوئے تھے - جن مین ایک ہیجڑون کا بادشاہ بھی تھا - جس کی شاید نواح فرخ آباد مین بہت بڑی جاگیر تھی - اور اُس کی نسبت یہ روایت مشہور تھی کہ شاہنشاہان دہلی مین سے کسی تاجدار کا کوئی بیٹا ہیجڑا ہو گیا تھا - پہلے تو باپ کی نظر مین وہ ذلیل وخوار رہا - لیکن آخر بادشاہ کا بیٹا تھا مجبوراً اُسے دہلی سے دُور ایک بڑی جاگیر عطا کی گئی تاکہ گھر سے الگ وہین بیٹھ کے اپنی بے شرمی کی زندگی ختم کر دے - ہیجڑون نے اُس کی یہ قدر کی کہ اپنا بادشاہ بنا لیا - اور اُس وقت سے جو ہیجڑا اُس گدی پر بیٹھا ہیجڑون کا بادشاہ قرار پا گیا -

غرض ہندوستان مین قریب قریب ہر ذلیل وحقیر گروہ کی ایک جماعت قائم ہو گئی ہے جس کا کوئی فرمان روا بھی ضرور ہوا کرتا ہے - چنانچہ ہر گروہ اور ہر طبقہ کی شاہیان یہان مدت ہاے دراز سے چلی آتی ہین - لیکن تعجب یہ ہے کہ ایک سب سے ذلیل گروہ کی بادشاہی کبھی ہندوستان مین نہین سنی گئی تھی جس کا تکملہ انگلستان نے کر دیا -

ہندوستان مین کبھی کوئی فقیرون کا بادشاہ نہین سنا گیا - اگرچہ تصوف کے عام مذاق اور درویش پرستی کے رجحان نے یہان ہر فقیر کو "شاہ جی" کا لقب دے کے شاہی دلوا دی - اور ہر فقیر اپنا گدی اور اپنے تکیہ کا

بادشاہ بن گیا - اور جب ہر فقیر یہان ایک بادشاہ بن گیا تو پھر کیونکر ممکن تھا کہ وہ کسی ہم عصر کے آگے سرِ نیاز جھکائے؟ اور کسی کو ان کی بادشاہی کا فخر حاصل ہو؟ لیکن انگلستان مین فقیرون کا ایک نامی گرامی بادشاہ ہو چکا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہان کے عام فقرا "شاہ صاحب" نہین پائے جاتے -

ان انگلش شاہ کورا یان کے حالات غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہون گے - ان شاہ صاحب کا نام "کارلو" یا نام نامی "مُور" تھا اور لقب "فقیرون کا بادشاہ" آپ ایک گرجے کے مہتمم پادری صاحب کے فرزند دلبند تھے - مگر سیاحت کا اس قدر شوق تھا کہ سوا شہرون شہرون ارے پھرنے کے کسی ایک جگہ قدم نہ جما -

ہنوز وطن ہی مین تھے کہ چند جپسی لوگون نے بستی کے باہر آکے پڑاؤ ڈالا

جپسی ایک خانہ بدوش قوم ہے جو نہ کہین گھر بناتے ہین اور نہ کہین پاؤن توڑکے بیٹھتے ہین - متمدن لوگون کے خلاف وہ نہایت ہی بے پروا - بے تکلف اور سادہ مزاج ہوتے ہین - گداگری کرتے ہین - اور ہاتھ دیکھ کے آیندہ زندگی کے حالات بتانا - اور انسان کو تقدیری واقعات اور پیش آنے والے سوانح سے مطلع کرنا اُن کا کام ہے - انگلستان مین مشہور ہے کہ جپسی بچون کو پکڑلے جاتے ہین - اور جب اُن کا کوئی خاندان کسی بستی مین ہوکے گزرتا ہے تو مائین بچون کو گھرون مین پکڑ کے بٹھالیتی ہین اور اکثر بچے خود ہی ایسے سہمے ہوتے ہین کہ اُن کا نام سنتے ہی کونون مین دبک جاتے ہین -

برخلاف عام اہل انگلستان کے جو جپسی لوگون سے الگ ہی الگ رہتے ہین یہ شاہ کارلو صاحب اُن سے جاکے ملے - ملاقات پیدا کی اور چند روز مین ایسا ربط وضبط پیدا کرلیا کہ ان کو اُن سے اور اُن کو ان سے ملنے مین لطف آنے لگا - ان ملاقاتون مین شاہ کارلو کو جپسیون کی زندگی بہت پسند آئی - اُن کی خانہ بدوشی کی روارَوی اور اُن کی سادی زندگی مین کچھ ایسی دلکشیان نظر آئین کہ جس طرح اگلے دنون ہمارے یہان بعض بگڑے شریف زادے شہدون کی زندگی پسند کرکے اُنھین مین مل جل

جاتے اور اُن کی معاشرت اختیار کر لیا کرتے تھے آپ نے اُن کی زندگی اختیار کر لی تمام دوستوں اور عزیزوں کو خیرباد کہہ دی اور رحبیبوں کے ساتھ ہو لیے۔

اس زندگی کے اختیار کر لینے کے بعد شاہ کاریو نے طرح طرح کے کارنامے دکھانے ہر گھڑی ایک نئی وضع میں آنے اور ایک نیا فقرہ بنانے میں ایسے کمالات دکھائے کہ لوگ اُن کی باتوں کو جادو یا کرامت ماننے لگے۔ ایک ہی صحبت کے سامنے دن میں چار چار پانچ پانچ بار آتے۔ ہر دفعہ ایک نئی بات بنا کے پیش کرتے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آتا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی چند گھڑیاں ہوئیں دوسری وضع میں آیا اور کوئی اور فقرہ دے کے کچھ وصول کر لے گیا ہے۔ کبھی وہ ایک ستم زدہ مستم کنندہ بن کے آتے اور کہتے "میں قاعدے کے موافق حلف نہ اُٹھا سکا اور اپنی خدمت سے محروم رہ گیا" دوسری بار دوسرے بھیس میں آکے فرماتے "میں ایک کویکر[ع] ہوں تجارت میں گھاٹا ہونے سے تباہ ہو گیا" تیسری بار تیسری وضع میں آکے فرماتے "میں ایک کشتی شکستہ ہوں۔ جہاز ڈوب گیا۔ اور مجھے تختوں یا موجوں نے ساحل پر پھینک دیا۔ چوتھی بار جو بھیس بہروپ میں آکے کہتے "میں فلاں گاؤں کا لوہار ہوں۔ بھٹی کے بھڑک اُٹھنے سے آگ لگ گئی۔ اور سارا گھر جل کے خاک ہو گیا۔ بی بی بچے شعلوں کی نذر ہوئے مصیبت کے ایام کاٹنے کے لیے میں زندہ ہوں" ہر گھڑی نیا روپ بھرنے میں ان شاہ صاحب کی اس قدر شہرت تھی کہ تمام لوگوں کی زبان پر تھا "ہر لحظہ بوضع دگر آن یار برآمد۔ اور متحیر ہو ہو کے کہتے کہ پروطیوس[عـه] بھی

ع کویکر مسیحیوں کا ایک نیا مبتدع گروہ تھا جو لوگ حلف اُٹھانے کو بُرا سمجھتے۔ اور اپنی راست بازی میں مشہور رہیں۔

عـه پروطیوس یونانیوں کا ایک دریائی دیوتا تھا جسے گھڑی گھڑی اپنی صورت بدل لینے میں کمال بتایا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آیندہ قسمت کا حال بتاتا تھا۔ جزیرہ فارس کے ایک غار میں رہتا۔ لوگ وہاں اُس سے غیب کی باتیں پوچھنے کو جاتے لیکن صرف اُسی صورت میں کامیاب ہوتے جب کہ وہ سوتا ہوا ملتا۔ کیونکہ اگر جاگتا ہوتا تو اپنی ایسی صورت بنا لیتا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا۔

اتنی جلدی صورت نہ بدل سکتا ہوگا جس قدر جلد یہ حضرت روپ بدل لیا کرتے ہیں۔ ایک خاص طریقہ آپ نے یہ اختیار کر رکھا تھا کہ کسی خاص تدبیر سے لوگون کے کتون کو پھسلا لے جاتے۔ اور کسی کو کانون کان خبر نہ ہوتی۔ اس جرم میں آپ دو دفعہ گرفتار ہو کے سزایاب اور امریکہ میں جلاوطن کر دیے گئے۔ مگر دونون دفعہ کوئی نہ کوئی جتن کر کے وہان سے بھاگ آئے۔

انھیں جلاوطنیون میں سے ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ علاقہ ورجینیا سے چلے تو بڑا بھاری جنگل قطع کیا۔ امریکہ کے مشہور دریائے ڈیلاوار کے اس پار اس وضع میں آئے کہ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھے۔ اور لگام کے عوض صرف ایک رومال اُس کے سر سے اٹکا ہوا تھا۔

مملکت گدائی کے اس نامی فرمان روا کی نسبت کہتے ہیں کہ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ اور جس سے بات کرتا اُس کا دل اس طرح لبھا لیتا کہ مجال نہ تھی وہ دھوکا نہ کھا جائے۔ نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کبھی ایک رئیس اعظم بن جاتا اور کبھی ایک درویش بے نوا۔

آپ نے اپنے ہم مذاق لوگون یعنی مکار فقیرون کی ایک بڑی بھاری جماعت پیدا کر لی۔ جو ملک کے لیے ایک زبردست فتنہ تھی۔ اور چونکہ تمام باتون میں آپ سب سے زیادہ قابلیت اور کمال رکھتے تھے اس لیے سب نے مل کے آپ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اور اُسی وقت سے آپ فقیرون کے بادشاہ مشہور ہوئے۔ اور آخر زندگی تک اس معزز خدمت کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ جیتے جی آپ ہی اُن کے فرمان روا رہے۔ کسی اور کے منتخب کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

آخر اسی حکومت و فرمان فرمائی کے ساتھ ۱۷۶۸ء میں ستتر برس کی عمر پا کے آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔ اور انگلستان میں علاقہ ڈیون شائر کے قصبہ بکلے میں ۱۶۹۳ سنہ عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔

ریویو

فلسفۂ جذبات یعنی نفسانیات (سائیکالوجی) پر اُردو زبان مین سب سے پہلی کتاب ہے مصنفہ مولوی عبد الماجد صاحب بی ۔ اے ۔ یہ کتاب ۱۸ × ۲۲ پیمانے کے ۲۲۹ صفحون پر ختم ہوئی ہے - انجمن ترقی اُردو نے اسے اپنے اہتمام سے طبع کروا کے شایع کیا ہے اور اُردو کے کتب خانے مین ایک نہایت ہی قیمتی کتاب اضافہ کر دی ہے - جو جذبے نفس انسانی اور نفوس حیوانی مین پیدا ہوا کرتے ہین اُن پر خوش اسلوبی کے ساتھ عالمانہ و محققانہ بحث اس کے سوا اور کسی اُردو کتاب مین نہ نظر آئے گی - جو حضرات عالمانہ مذاق کے دلدادہ ہین ضرور ملاحظہ فرمائین - مولوی عبد الماجد صاحب نہایت ہی گہرا علمی مذاق رکھتے ہین - اور مسلمانون مین اُن کے ہم مذاق چند ہی لوگ نظر آئین گے - ملک مین ایسے فلسفیانہ مذاق کا پیدا ہونا بڑی خوش نصیبی کی بات ہے - اور تعلیم یافتہ اہل وطن کا فرض ہے کہ اس علمی خدمت کی قدر اور مصنف کی حوصلہ افزائی کرین - آخر مین "فرہنگ اصطلاحات" کے عنوان سے گیارہ صفحون کی ایک فہرست لگی ہوئی ہے جس مین ۱۲۵ نوایجاد اصطلاحات بتائے گئے ہین جن کو فاضل مصنف صاحب نے خود ہی اختراع کر کے اُن سے علمی مسائل کے ادا کرنے مین کام لیا ہے - یہ کتاب دو قسم کے کاغذون پر چھپی ہے - عمدہ کاغذ والی کی قیمت عہ؍ اور اردو سہرے درجہ والی کی قیمت عہ؍ فی جلد ہے - مہتمم صاحب "دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو" سے فلاور مانز لکھنؤ کے پتہ پر خط بھیج کے منگوائی جائے -

فتح قسطنطنیہ یہ ۲۰ × ۲۶ پیمانے کے ۱۳۸ صفحون کا نہایت ہی نفیس چھپا ہوا ایک بیش بہا رسالہ ہے جس مین حاجی بدر الدین احمد صاحب بی ۔ اے نے سلاطین آل عثمان کے دلچسپ حالات آغاز سے فتح قسطنطنیہ کے زمانے تک بڑی خوبی کے ساتھ موثر اور پرجوش زبان مین بیان فرمائے ہین - قیمت فی جلد عہ؍ ہے - ملک مین تاریخ کا مذاق ترقی کر رہا ہے - اور ہمین یقین ہے کہ ہمارے جن دوستون کو اسلامی تاریخ مین دلچسپی ہے اس تازہ تصنیف کو بہت پسند فرمائین گے - جون ۱۹

...ملیل اسٹریٹ ڈاکخانہ انٹالی۔ کلکتہ" کے پتہ پر خود مصنف صاحب کو لکھ کے منگوائی جا سکتی ہے۔

رہبر کامل یہ چھوٹے پیمانے کے ۴۰۵ صفحون کی ایک ضخیم کتاب ہے اور "غرر الحکم و درر الکلم" نام ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جس مین حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے کلمات و نصایح حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہین۔ اصلی عربی کتاب کے مولف کا اسم گرامی علامہ عبدالواحد محمد بن عبد الاحد احدی تمیمی ہے۔ اسناد و صحت روایت مین جو مصنفین سلف مشہور ہین اُن مین ہمین اس مصنف کا نام کہین نہین نظر آیا۔ اور نہ مترجم صاحب نے اُن کے حالات اور اُن کے زمانے کی ہمین اطلاع دی ہے۔ لہذا یہ کتاب علم و حکمت کا چاہے کتنا ہی بڑا خزانہ ہو لیکن حضرت علی مرتضی کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے ہم مجبور ہین کہ اس کے ہر ہر مقولے کی تنقید روایت اُسی احتیاط سے کرین جس احتیاط کا لحاظ اہل اسلام سلف سے آج تک احادیث و آثار صحابہ کے بارے مین کرتے آئے ہین۔ اور جب تک ایسی صحیح روایتون سے جو ہر طرح کی پرکھ مین پوری اُتری ہون یہ اقوال ہمارے سامنے نہ پیش کیے جائین ہم اُنھین حضرت علی رض کی طرف منسوب کرنا شان مرتضوی مین بے ادبی تصور کرتے ہین۔ حضرت علی رض کا ایک دیوان اشعار بھی موجود ہے نہج البلاغہ مین آپ کے خطبات بھی جمع کر دیے گئے ہین۔ لیکن اصول تنقید کی رُو سے کوئی بھی اس قابل نہین کہ اُس پر وثوق کیا جائے۔ اس رسالہ کی قیمت عہ/ فی جلد ہے اور مہتمم صاحب کتب خانہ اسلامی کی خدمت مین "یکی دروازہ۔ لاہور۔ پنجاب" کے پتہ پر درخواست بھیج کے طلب کی جا سکتی ہے۔

چند خیالات و واقعات

مسلمانون کو خواجہ کمال الدین صاحب کا نہایت ہی شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نازک زمانے مین جبکہ دنیائے اسلام مین ہر جگہ سیاسی انحطاط نظر آرہا ہے اُن کی خالص ہی سرگرمیون سے اسلام کی روحانی ترقیان کوکب اقبال کی طرح نمایان ہوئین۔ اسلام کا روحانی علم فی الحال اُن قومون کے ہاتھون مین ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے ناتوان و کمزور ہین۔ اس لیے خدا کی اگر مرضی ہے کہ یہ مجاہدین باقی رہے تو بے شک اب وہ اس علم کا حامل و حامی ان قومون کو بنائے گا جن کے ارادے نئے اور حوصلے تازے ہین۔ اور جن کی رگون مین

نیا پُرجوش خون دوڑ رہا ہے - خدا کی یہ مشیت اگر خواجہ صاحب کے ذریعہ سے پوری ہوتی نظر آتی ہے تو ہمین اُن کی نہایت ہی قدر کرنی چاہیے - مسلمانون مین اگر اپنے دین کی سچی محبت ہے تو خواجہ صاحب کو پوری مدد دین گے اور کوشش کرین گے کہ اُن کا مشن مضبوط ہو جائے بعض حضرات فرماتے ہین کہ مسلمانون کو پہلے خود ہندوستان کی مسلمانون کو اور اس کے بعد یہان کے عام لوگون کو مسلمان بنانا چاہیے یہہ وہ سچ فرماتے ہین - اور اسی لیے ہم ان کی خدمت مین بکمال التجا عرض کرتے ہین کہ اس حصۂ تبلیغ کو جو اُن کے نزدیک مقدم ہے اپنے ذمے لین - اور جس کسی نے بعد کا کام اپنے ذمے لیا ہے اُسے اُس کا کام کرنے دین -

---

جو حضرات ایسی رائین دیا کرتے ہین وہ شاید ایک بڑی قوم کو چند ممبرون کی چھوٹی انجمن سمجھے ہوئے ہین - کارروائیون کے لیے اس قسم کا پروگرام بنانا کمیٹیون اور انجمنون کا کام ہے - قومین جن کے افراد لاکھون کرورون سے تجاوز کیے ہون اپنے لیے کوئی پروگرام نہین بناتی ہین اور نہ بنا سکتی ہین - اُن کے مختلف گروہ بلا لحاظ تقدم و تاخر اپنے خیال اور اپنے جوش کے مطابق مختلف کامون مین لگ جاتے ہین - اور سچا خیر اندیش قوم و خادم ملت وہی ہوتا ہے جو ہر گروہ کو اُس کے مقاصد مین مدد دے اور ہم سے پوچھیے تو ہمارے نزدیک سب سے اہم اور سب سے مقدم دینی خدمت یہی ہے جو خواجہ صاحب بجا لا رہے ہین - اور اُن کی مدد مین کمی کرنا ایسی بے حسی ہے جس کے بعد مایوسی کے سوا کچھ نہین ہو سکتا -

---

ہمین افسوس ہے کہ ہمارے نہایت پرانے دوست منشی گنگا پرشاد ورما ایڈیٹر ہندوستانی ایڈوکیٹ دنیا سے رخصت ہو گئے - وہ ہمارے عنفوان شباب کی ساتھی اور پوری زندگی تھے - اُنھون نے لکھنؤ کو باغ بنا دیا - اور اگر چند روز اور زندہ رہتے تو خدا جانے لکھنؤ کیا ہو جاتا - انھون نے لکھنؤ میونسپلٹی کو زندہ کر دیا تھا جس سے شہر کو بیحد نفع پہونچا - اُن کی وفات پر افسوس کرنا صرف اُن کے پس ماندون کی ہمدردی نہین بلکہ شہر لکھنؤ کی ہمدردی ہے - اس لیے کہ لکھنؤ کو ایسا سچا دوست پھر مشکل سے ملے گا -

کارخانہ روغن الریاحین لکھنؤ کا اعلیٰ عطر
(آپ ایک دفعہ آزما کے تو دیکھیں!)
عطر کیلئے لکھنؤ مشہور ہے مگر افسوس کہ جو عطر ہے وہ باہر والوں کو نہیں ملتا کیونکہ کہیں مال کی ردی نکلی ہو کر ان کے
ہاتھ ہوا دھوکے و نقل اصل کا خمیازہ ان غریبوں ہی کو اٹھانا پڑتا ہے جو باہر سے منگوا اور بے دیکھے خریدنے پر مجبور ہیں
اور بعض اشتہار دینے والوں کی یہ حالت ہے کہ روپیہ کا مال دو کو اور کبھی چار کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ عام خرابیاں دیکھ کے
ہم نے عزم کیا ہے کہ باہر کے جو صاحب طلب فرمائیں ان کے لئے معتبر اور مستند کارخانوں کے عطر اعلیٰ درجے کے تیل وغیرہ خاص
طور پر اہتمام کر کے مال بخوبی جانچ کے اور کفایت سے خرید کر کے روانہ کر دیا کریں جس کا بہت اچھا اور قابل اطمینان انتظام کیا
گیا ہے۔ عطر کے شائق ایکبار امتحاناً منگوا کر دیکھ لیں کہ ہمارے ذریعے سے انہیں کیسا اچھا عطر اور کن داموں کو ملتا ہے۔
عطروں کی فہرست حسب ذیل ہے
عطر حنا فی تولہ
عطر مجموعہ (اصلی) فی تولہ
عطر چمپک
عطر کیوڑا
عطر خس
عطر چمپا
عطر مولسری فی تولہ
عطر موتیا
عطر چمیلی
عطر برگ حنا
عطر فتنہ
عطر گلاب
عطر سنگترہ فی تولہ
عطر عروس
عطر اگر عرقی
عطر جوہی
عطر نرگس اصلی
عطر مجموعہ عنبری فی تولہ
عطر بیلا فی تولہ
روح گلاب
روح خس اصلی
عطر اگر کہنہ
عطر سہاگ
عطر شمامۃ العنبر
خوشبودار تیلوں کی فہرست بھی ملاحظہ ہو
روغن چمیلی فی سیر
روغن بیلا فی سیر
روغن کیوڑا فی سیر
اعلیٰ درجے کا خوشبودار عمدہ اور بامزہ تمباکو۔
زردہ تمباکو مشکی فی سیر
زعفرانی
قوام تمباکو مشکی فی تولہ
زعفرانی
گولیاں تمباکو مشکی طلائی فی تولہ
نقرئی
نوٹ۔ درخواست آتے ہی ویلیو پے ایبل روانہ ہوگا۔ باردانہ اور مصارف ڈاک وغیرہ ذمہ خریدار۔
آپ کا خادم محمد عبدالحلیم شرر ایڈیٹر دلگداز کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی تاریخی رسالہ

نمبر ۶ جلد ۱۶

جون سنہ ۱۹۱۴ عیسوی۔ مطابق طرن سنہ ۱۳۴۳ محمدی

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

حسن کی کرشمہ سازیان

بثینہ محبوبہ جمیل

عاشق و معشوق ہر قوم اور ہر سرزمین مین گزرے ہین مگر جیسے اور جتنے وارفتہ مزاج نامی عاشق خاک عرب نے پیدا کیے شاید اور کوئی ملک نہ پیدا کر سکا ہوگا۔ ہر ملک کے لٹریچر مین دو چار جانبازان محبت کے نام ضرب المثل اور شاعری کے عنصر قرار پا گئے ہین۔ مگر عرب مین بیسیون عاشقون نے اپنی بیتابیون اور بیقراریون کی بدولت ناموری کی شہ نشین پر جگہ پائی اور سب ملکی لٹریچر مین ضرب المثل ہو گئے۔

عرب کا قریب قریب ہر شاعر عاشق تھا۔ اور عاشق بھی نام کا نہین بلکہ سچا عاشق جسنے کسی معشوقہ کو دل دیا۔ زندگی بھر اُس کے عشق مین سر دھنتا رہا۔ اور اُسی کے فراق مین روتا ہوا مرا۔ ان عشاق عرب مین سے صرف ایک مجنون عامری کا نام تو عربی شاعری سے نکل کے فارسی اور اردو شاعری مین بھی آگیا۔ لیکن دوسرے دلدادہ عاشقون کے نام عربی ہی کی ادب مین رہے جسکی وجہ سے ہمارے تمام اہل وطن کو انکے حالات کی بہت ہی کم اطلاع ہو سکی۔

ان خالص عربی شاعری کے نامور ان عشاق مین سے قیس و لُبنیٰ کے سچے حالات ہم اپنے ایک ناول کے ذریعہ سے قدردانان دلگداز کے سامنے پیش کر چکے ہین۔ اب ایک

دوسرے عاشق کے حالات نذر ناظرین کرتے ہین جس کا نام جمیل تھا - اور اُسکی معشوقہ بھی بثینہ تھی جس کا خوبصورت نام ہمنے زیب عنوان کیا ہے - حُسن کی کرشمہ سازیون کے سلسلہ مین ہمین صرف اس نازنین عرب کے واقعات سے تعلق ہے - مگر عشق عاشق و معشوق کو ابد الآباد تک کیلئے باہم ایسا وابستہ کر دیا کرتا ہے کہ دونون کا جدا کرنا امکان سے باہر ہو جاتا ہے اور ایک کے حالات دوسرے کے حالات بنجاتے ہین -

بثینہ بنت حبا قبیلۂ بنی عُذرہ کے ایک نہایت معزز خاندان کی لڑکی تھی - ہم بتا چکے ہین اور غالبًا ہمارے ناظرین کو یاد بھی ہوگا کہ بنی عُذرہ سارے عرب مین حسن و عشق کے لحاظ سے ممتاز تھے - اُن کی لڑکیان جیسی حسین و نازنین ہوتی تھین ویسے ہی اُنکے لڑکے عاشق مزاج اور تیغ ابرو کے گھائل ہوا کرتے تھے - اسی عشق کی چاشنی نے بنی عذرہ کے لڑکون اور لڑکیون دونون مین شاعرانہ مذاق پیدا کر دیا تھا - لڑکے جس جوش و خروش سے عاشقانہ اشعار کہتے ویسے ہی ذوق و شوق سے لڑکیان اُن اشعار کو سنتی اور پڑھتی تھین - اور ضرورت یا جوش کے وقت مین خود بھی غزلخوان ہو جایا کرتی تھین -

غرض بثینہ ایسے زندہ دل قبیلہ کی ایک پاک باطن و عفت شعار لڑکی تھی جس کا زمانہ تابعین کا تھا - اسکی شادی نبیہ بن اسود نام ایک شریف نوجوان کے ساتھ ہو گئی تھی - اسکے ذاتی صفات یہ تھے کہ قبیلہ کی تمام لڑکیون سے زیادہ شیرین ادا و صاحب جمال اور حد درجہ کی سخن سنج و فصیح البیان تھی - اُس کی آنکھ مین بھی جادو تھا - اور زبان مین بھی اور انھین خوبیون نے اس کے ہم قوم شاعر جمیل بن عبد اللہ کو اسکا عاشق بنا دیا جو عہد بنی امیہ کے اعلیٰ ترین شعرا مین سمجھا جاتا ہے -

عشق کی شمع دونون دلون کے اندر بچپن ہی مین روشن ہو گئی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر بثینہ کے حسن کی شہرت جمیل کے اشعار سے ہوئی تو جمیل کو بثینہ ہی کے دلستان حسن نے شاعر بنایا - آغاز عشق یون ہوا کہ ایک دن جمیل اپنی اونٹنیون کو چراتا ہوا علاقہ بغیض کی ایک وادی مین لے آیا جہان پانی بھرا ہوا تھا - یہان پہونچ کے خود ایک مقام پر صاف جگہ دیکھ کے لیٹ گیا - اور اونٹنیون کو چھوڑ دیا بعض چرنے لگین - بعض پانی پر جھکین - اور بعض بیٹھ کے جوگالی کرنے لگین - اتفاقًا اس وادی کے کنارے ایک طرف بثینہ کے قبیلہ کا پڑاؤ تھا بثینہ اپنی ایک ہمسن سہیلی کے ساتھ یہان پانی

لینے کو آئی۔ راستہ مین جمیل کی اونٹنیان ملتی تھین۔ بثینہ نے انھین کچھ اس طرح شوخی کے ساتھ چھیڑا کہ وہ بھڑک کے بھاگین۔ اور جمیل نے گالی دیکے کہا "و میری اونٹنیون کو کیون ستایا ہم"۔ بثینہ نے یہ سخت و سست کلمات سنے تو اسے کہان تاب تھی؟ بگڑ کھڑی ہوئی۔ اور ایک کی سو سنا دین۔ لیکن اسکے اس بگڑنے اور کوسنے مین کوئی ایسی دلفریب ادا تھی جس نے جمیل کی خرمن جان مین عشق کی آگ لگا دی۔ دل مین کہا۔ ع بجواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کاش میری یہ تمنا پوری ہوتی اور یون کہ

گالیان کھائے پہ مزے کے ساتھ گال گورے سے چومتا جائے

بس یہی جمیل کا آغاز عشق تھا جسے وہ خود اپنے اس شعر مین یاد دلاتا ہے۔

واوّل ماقاد المودۃ بیننا بوادی بغیض یا بثین سباب

(جس ادا نے پہلے پہل ہم دونون مین محبت پیدا کی وہ اے بثینہ تیرا کوسنا تھا)

غالباً یہ وادی القریٰ کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے اور جہان جمیل کا نشو و نما ہوا تھا۔ اب دل مین عشق کی گرمی پیدا ہوئی تو طبیعت شاعرانہ اُمنگیان اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ سچے جوش کی بیتابیان دکھانے لگی۔ آخر اپنے درد دل کو اشعار کے ذریعہ سے ظاہر کرنے لگا اور وہ اشعار اہل زبان مین مقبولیت حاصل کرنے لگے اور چند ہی روز مین بثینہ پر اسکا عشق سارے عرب مین مشہور ہو گیا۔ جمیل کے مان باپ نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو بثینہ کے باپ کو اپنے لڑکے کا پیام دیا۔ وہ اُس کے عشق کی خبرین سُن سُن کے سخت برہم ہو رہا تھا۔ شادی کا پیام سُن کے بگڑ کھڑا ہوا اور کہا "شریف زادیون کا نکاح اُن بدمعاشون کے ساتھ نہین ہو سکتا جو اُن پر اظہار عشق کرکے انھین بدنام کرتے ہون"۔ غرض یہی نہین ہوا کہ بثینہ کے باپ نے جمیل کا پیام نامنظور کیا بلکہ نبیہ بن اسود نام ایک اور شخص کے ساتھ اسکا نکاح بھی پڑھا دیا۔ اور یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے چکا دیا۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہین۔

جمیل کے لیے اس سے بڑی کوئی ناکامی نہ ہو سکتی تھی مگر عشق سچا تھا اور کسی شہوانی خواہش نے اُسے بثینہ کے رخ زیبا کا دیوانہ نہین بنایا تھا۔ اس خبر نے آتش عشق کو اور بھڑکا دیا۔ اور رات دن اسی کوشش مین رہنے لگا کہ کسی طرح بثینہ سے ملے۔

اُس کے حسن عالم آشوب کی زیارت کرے۔ اُسکی پیاری باتین سُنے اور اُسے اپنے پرسوز اشعار سُنائے۔ بثینہ کے بھائی حواش نے جب یہ دیکھا کہ بثینہ کی شادی ہو جانے پر بھی جمیل اُس پر اپنا عشق ظاہر کرنے اور اپنے اشعار مین اُسپر تشبیب کرنے سے نہین باز آتا تو غصہ مین آکے خود بھی شعر کہنا شروع کیے جن مین جمیل کی بہن پر اپنا عشق ظاہر کرتا۔ جمیل نے اسکی بھی کچھ پروا نہ کی لیکن حواش کو چند ہی روز مین نظر آ گیا کہ اُس کے اشعار کو کوئی سنتا بھی نہین اور جمیل کے اشعار جمیل کی زبان سے نکلتے ہی ساری دنیا کی زبان پر جاری ہو جاتے ہین مجبوراً اُسنے اپنی بیہودہ شاعری چھوڑ دی اور سمجھ گیا کہ جمیل کا عشق ایک ایسی بلا ہے جو کسی طرح نہین ٹل سکتی۔

لیکن بثینہ کے باپ بھائی اور شوہر کا زور ہی کیا چل سکتا تھا جبکہ خود بثینہ دل مین جمیل کے عشق کی قدر کرتی تھی۔ اور باوجود دوسرے کی منکوحہ ہونے کے اُس کو جمیل کے ساتھ ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ دل کو اُسکی طرف سے پھیرنا اختیار سے باہر تھا۔ ان دنون جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے عرب کی مسلمان عورتون کا معمول تھا کہ اچھے کپڑے پہن کے اور پورا بناؤ سنگھار کر کے عید کے دن عیدگاہون مین جایا کرتین۔ اور اپنے عزیزون اور دوستون سے بے تکلف ملتین۔ جمیل کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا عیدگاہ مین جا کے وہ جگہ ڈھونڈھ نکالی جہان بثینہ اپنی رازدار بہن اُم الحسین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جمیل کو دیکھ کے وہ خوش ہوئی۔ اُس سے کھل کے ملی۔ باہم سوال و جواب رہے جن سے ناز و نیاز کے صدہا اسرار نمایان ہو رہے تھے۔ غرض دیر تک لطف و محبت کی باتین رہین۔ اور آخر دونون ایک دوسرے کی ملاقات سے محظوظ ہو کے اپنے اپنے گھر واپس گئے۔ جمیل نے بے انتہا کوشش کی تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اسکا راز عشق دوسرون پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن عشق بھلا چھپنے والی چیز ہے؟ اُن تمام لڑکون اور لڑکیون پر جو اس صحبت مین شریک تھے راز فاش ہو گیا جس کو خود جمیل نے محسوس کر کے اپنے نئے اشعار مین ظاہر کیا اور بصد حسرت و یاس کہا کہ "ہائے! اب ہمیشہ سال عید ہی مین ملنا ہو گا"۔

ان اشعار نے راز عشق کو درطشت از بام کر دیا۔ اہل قبیلہ نے بثینہ سے کہا کہ خبردار پھر کبھی اس شریر شخص سے نہ ملنا۔ مگر اُس کے تو دل کو لگی ہوئی تھی قسم کھا کے

چاہے کچھ ہو مین تو جمیل سے ضرور ملونگی - اور جب سنتی تھی کہ دروازے پر آیا ہو بلا تامل نکل آؤن گی - بثینہ کی اس قسم کا حال جمیل کو معلوم ہوا تو بار بار قبیلے کے پڑاؤ کے پاس منڈلانے اور رہا دے پھرنے لگا - بثینہ کسی ذریعہ سے اسے اپنے آنے کی خبر کر دیتا تھی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکل کے آتی - دونون ایک دوسرے کے دیدار سے خوش ہوتے جبتک موقع پاتے بیٹھ کے باتین کرتے اور رخصت ہو کے اپنے اپنے مقام میں چلے جاتے۔

ان خبرون کو سن سن کے بثینہ کے اعزہ دانتون سے انگلیان کاٹتے - مارے غیرت کے زمین مین گڑے جاتے - اور مشتعل ہو ہو کے انتقام کے درپے ہوتے یہان تک نوبت پہونچی کہ سب اس تاک مین تھے کہ کسی جگہ دونون کو باتین کرتے دیکھین اور تلوارین مار کے دونون ختم کر دین - اتفاقاً ایک دن انھین خبر لگ گئی کہ آج جمیل بثینہ سے ملنے آنے والا ہو - فوراً دس بارہ آدمی تلوارین باندھ باندھ کے گھاٹیون مین چھپ رہے - اب ادھر سے بثینہ اور اسکی بہن ام الحسین گھر سے نکل کے ایک وادی مین پہونچین - ادھر سے جمیل ایک تازہ دم اور صبا رفتار سانڈنی پر سوار آیا - اور معشوقہ سے مل کے جوش دل کو ظاہر کرنے لگا جس طرح بلبل پھولون مین بیٹھ کے چہکتا ہو ویسے ہی آپ نے بثینہ کا رخ زیبا دیکھتے ہی غزل خوانی شروع کر دی - اور شکوہ و شکایت کا دفتر کھل گیا - اپنے اشعار خوب گا گا کے سنائے - اور آخر ایک شعر سنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ "اے بثینہ تیرے قبیلے کے جن مردون نے میرے مار ڈالنے کی نیت کی ہو اور میرا خون حلال کر لیا ہو کاش وہی مجھے پا جائے (اور مار ڈالتے ا)" یہ شعر پڑھا ہی تھا کہ ایک جانب سے وہ لوگ تلوارین کھینچے ہوئے نمودار ہوئے - لڑکیون کے نازک کلیجے دہل گئے - مگر جمیل نے ان سے پھر ملنے کا وعدہ کیا اور جھٹ پٹ سانڈنی پر سوار ہو کے بھاگا - اونٹنی ایسی تیز تھی کہ دشمنون کے مجمع مین سے ہو کے نکل گئی اور کسی نے اسکی گرد بھی نہ پائی -

اس واقعہ کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک اعرابی بثینہ کے قبیلے مین آیا اور لوگون سے کہا "تمھارے پڑاؤ کے قریب ہی پہاڑیون مین تین شخصون کو دیکھا وہ معلوم ہوتا ہو کسی کی گھات مین ہین - غالباً ڈکیتی کرینگے - تم لوگون کو ہوشیار رہنا چاہیے" قبیلہ والون نے ان لوگون کے حلیے اور ان کی وضع پوچھی اور اعرابی کے بیان سے سمجھ گئے کہ نہ کوئی ڈاکو ہو نہ کوئی چور بلکہ میان جمیل ہین جو غالباً بثینہ سے ملنے کو آئے ہین

اور ساتھ ہی خیال آیا کہ معلوم ہوتا ہے بثینہ سے آج ملنے کا وعدہ ہے۔ اسلیئے کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ آج گھر سے باہر نہ جانے پائے۔ فوراً بثینہ کا خیمہ گھیر لیا۔ اور وہ غریب رات بھر اپنے خیمہ مین قید رہی۔ جمیل نے گھاٹیون مین رات بھر نہایت ہی بیتابی وبیقراری سے انتظار کیا۔ اور صبح کو ناکام ونامراد اپنے آپ کو کوستا اور معشوقہ شیرین ادا پر بدگمانی کرتا ہوا واپس گیا کہ معلوم ہوتا ہے اُسنے عہد وفا کو توڑ دیا۔ پچھتاتا ہوا گھر پہونچا تو وہان کی بعض شریر لڑکیون نے جنھین اس ناکامی کی خبر ہوگئی تھی بنانا شروع کیا کہ "واہ۔ اچھی لڑکی پر مرتے ہین جسے اِن کی محبت کی پرواہی نہین۔ ایسی بے وفا پر مرتے تمھین شرم نہین آتی؟" اصل یہ ہے کہ جمیل کے قبیلہ والے چاہتے تھے کہ اُس کے دل کو بثینہ سے نفرت ہو جائے اور اکثر لڑکیان چاہتین کہ بجائے بثینہ کے اُسے اپنا شیدا بنالین۔ ان کی یہ طعن وتشنیع کی باتین سُن کے جمیل نے چند شعر سنائے جن مین سے آخری شعر کا مطلب یہ تھا کہ "جس سے محبت ہو اُس کے جھوٹ اور اُسکی بے وفائی مین بھی مزہ ہو"

اس کے بعد ایک مدت تک دونون مین فراق رہا۔ لیکن گو کہ جمیل کو اوی جانان مین جانا دشوار نظر آتا تھا۔ مگر شوق دل لے ہی گیا۔ دونون مین وقت مقرر ہو گیا۔ اور سواد قبیلہ کے پہاڑون کی ایک محفوظ گھونگھٹ مین عاشق ومعشوق ایک دوسرے سے ملے مگر بثینہ کی ایک لونڈی کو خبر ہوگئی جو کسی بات پر جلی ہوئی تھی۔ فوراً جا کے اُسکے باپ اور بھائی کو خبر کر دی۔ اسی قدر نہین خود اُن کے سرون پر لے جا کے کھڑا کر دیا۔ دونون نے طیش مین آ کے تلوارین کھینچ لین۔ اور دم سادھ کے آڑ مین کھڑے ہو گئے کہ اُن کی بے عصمتی وبے حیائی کی چند باتین سُن لین تو حملہ کرین۔ اتفاقاً جمیل نے آج ہمیشہ کے خلاف دلدارانہ ناز آفرین سے کہا "بثینہ! تم میری آہ وزاری سنتی اور میری بیتابی وبیقراری کو دیکھتی ہو مگر اس محبت کی قدر نہین کرتین؟" بثینہ نے کہا "آخر کیا کرون؟ اور تمھاری محبت کی کیونکر قدر کرون؟" بولا "جس طرح عورتین مردون کی محبت کی قدر کر کے اُن کی آرزو پوری کیا کرتی ہین" یہ جواب سنتے ہی بثینہ چونک سی پڑی۔ حیرت زدہ ومبہوت ہو کے جمیل کی صورت دیکھی اور بولی "تمھاری محبت کی یہی غرض ہے؟ مگر میرے دل مین تمھاری طرف سے خدا کی قسم کبھی ایسا خیال بھی نہین گزرا تھا۔ مین ایک شریف عرب کی بی بی ہون۔ اور گناہ سے ڈرتی ہون۔ اگر پھر کبھی تمھاری زبان سے یہ کلمات نکلے تو یاد

ملتا تو زندگی میں پھر میری صورت نہ دیکھو گے۔" یہ جواب سُن کے جمیل کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا مسکرایا اور کہا "بثینہ! میں نے یہ فقط تمھارا امتحان کرنے کیلئے کہا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر تم میری آرزو پوری کرنے کی ذرا بھی حامی بھرتیں تو میرا دل ٹوٹ جاتا۔ دل میں کہتا کہ ایسی معشوقہ مجھے نہیں چاہیئے۔ اور تلوار کھینچ کے تمھارا سر اڑا دیتا۔ لیکن اگر اسکا موقع نہ ملتا تو تمھیں چھوڑ کے چلا جاتا اور پھر کبھی نہ ملتا۔ میری محبت بھی تمھاری ہی طرح پاک ہے جس کو میں اپنے اشعار میں ظاہر کر چکا ہوں" یہ کہہ کے اسی مضمون کے چند اشعار سنائے۔ یہ گفتگو سنتے ہی باپ نے تلوار میان میں کر لی۔ اور بیٹے سے کہا "چلو گھر پلٹ چلیں۔ اب ہم ضرورت نہیں کہ ایسے پاکباز عاشق کے عشق میں مزاحم ہوں۔ یا بثینہ کو اُسکے پاس جانے سے روکیں" بیٹے نے بھی باپ کے خیال سے اتفاق کیا۔ اور دونوں واپس گئے۔ اور عاشق و معشوق نے اپنی صحبت وصل بے غل و غش پوری کی

لیکن اس پر بھی اہل قبیلہ کے کہنے سننے سے اور نیز تمام قبائل عرب میں بدنام ہونے کے اندیشہ سے پھر بثینہ کو روکا۔ اور اس کو گوارا نہ کر سکے کہ جمیل آزادی کے ساتھ آ کے اُن کی لڑکی سے ملا کرے۔ مگر بثینہ کے دل کو خود ہی ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ ہزار روک اور بندش ہو وہ جب سنتی کہ جمیل پاس کی پہاڑیوں میں آیا ہے کوئی نہ کوئی جتن کر کے پہونچ جاتی۔ اور مل آتی۔ چنانچہ ایک دن جمیل نے کسی شخص سے کہا "بھلا تم میری اتنی مدد کرو گے کہ مجھے بثینہ سے ملا دو؟" اُس نے کہا "اچھا" پھر اسے ساتھ لے جا کے خاندان بثینہ کے پڑاؤ کے پاس کی پہاڑیوں میں چھپا دیا۔ اور اُس کی انگوٹھی لے جا کے چپکے سے بثینہ کے چرواہے کو دی۔ اور کچھ دے دلا کے کہا "تم اس انگوٹھی کو بثینہ تک پہونچا دو۔ اُسے فلان مقام کا پتہ دے دو۔ اور اس سے وعدہ لے آؤ" بثینہ انگوٹھی دیکھتے ہی مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو گئی چرواہے کا شکریہ ادا کیا اور رات کو آنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ رات کو جیسے ہی قبیلہ کے سب لوگ سو گئے وہ چپکے سے دبے پاؤں اُٹھ کے پہاڑوں میں آئی۔ بڑے ذوق و شوق سے ملی۔ رات بھر یہ صحبت عیش گرم رہی جمیل کمال بیتابی کے ساتھ اپنے اشعار سناتا رہا اور صبح ہوتے ہی رخصت ہو کے بثینہ اپنے خیمے میں گئی۔ اور جمیل نے اپنے قبیلہ کا راستہ لیا۔

(باقی پھر)

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

۱۲۵۶ھ محمدی (۱۸۲۷ء) مین غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم بتا چکے ہین فرمان روایان اودھ نواب نہین بادشاہ تھے۔ اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست وذی وقعت فرمان رواسب نواب وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت وسطوت رخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پالٹکس مین ان لوگون کا بالکل اثر نہین باقی رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جاسکتا ہو کہ انگریزون نے حکمرانان اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے اُن کی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی۔ اور انھین نام ہی کا بادشاہ نہین بلکہ حقیقۃً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہین ہمین نظر یہ آتا ہو کہ اس عہد مین اودھ سے باہر ان لوگون کا اثر تو بالکل تھا ہی نہین۔ خود اپنی قلمرو مین بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ ان کے ماسبق بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزون کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو مین جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہوسکتا تھا۔ سریر شہر یاری ایک اسٹیج تھا جسپر جو کچھ ہوتا بظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہین مگر اصل مین وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت مین تھے جو پردے کی آڑ مین تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانان اودھ کی اور انکے ساتھ قریب قریب سارے وابستگان دامن دولت کی حس مفقود ہو گئی تھی جس کی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کرسکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش وعشرت مین مشغول ہوگئے۔ اور نصیر الدین حیدر کو تو تخت شاہی ورثہ مین ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی مین دونون کا ممد معاون ہوا۔ کچھ انگریزون کو قرض دیا گیا کچھ ان مبتدعہ مذہبی رسمون کی بجا آوری مین صرف ہوا جنھین بادشاہ اور اُن کی ملکاؤن نے اپنے مذاق کے موافق ذوق وشوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فضول خرچیو اور عیاشیون کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو شاہی کیا تھا کہ نجف اشرف

تقل ہوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا - اور بغیر اس کے کہ اپنے ورثہ پر بھروسہ کرین کچھ روپیہ انگریزون کے حوالے کیا کہ اُسکے سود سے پورے دینی آداب کے ساتھ نجف کی داشت کیا کرین - چنانچہ آج تک اُن کی قبر پر ہمیشہ چراغ روشن ہوتا ہے مجلسیں ہوتی ہیں - قرآن خوانی ہوتی ہے - اور محرم مین خوب روشنی ہوتی ہے جس کی طفیل تھوڑے سے غریبون کی پرورش ہوجایا کرتی ہے - مگر نصیر الدین حیدر کو ہجوم عیش مین اتنی بھی توفیق نہ ہوئی - دریا پار محلہ ارادت نگر مین انھون نے ایک کربلا بنوائی جو خود نکامرت قرار پانے والی تھی مگر اس کی خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہین کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالی گنج کے اسٹیشن کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانیوالا بھی نہین - انکے زمانے مین نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہین دریا پار آباد ہوئے -

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جسنے علم ہیئات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر مین ایک اعلیٰ درجہ کی رصد گاہ قائم کرائین چنانچہ اسی غرض کیلیے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خان کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان مین تعمیر کرائی جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ مین "تارے والی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہوئی - اُس مین بڑی بڑی دوربینین اور اعلیٰ درجہ کے آلات رصد جمع کیے گئے - اُن کے مناسب طور پر قائم کرنے کا کام اور اُن کا انتظام و اہتمام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا جو ایک اچھے ہیئات دان تھے - مگر لکھنؤ کی یہ رصد گویا کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی کا ایک مجہول الحال کارنامہ تھی - کیونکہ ۱۲۴۶ھ ہجری سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا آغاز ہوا جسکے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہوئی ہوگی - اور اسوقت سے ۱۲۶۳ھ ہجری (۱۸۴۷ء) تک جبکہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا یہ رصدگاہ انھین کے اہتمام مین رہی سنہ مذکور مین کرنل صاحب کا انتقال ہوا اور اُنکی جگہ کوئی ہیئات دان اس خدمت پر نہین مقرر کیا گیا - واجد علی شاہ نے اسکی طرف سے بے پروائی کی لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سنا گیا کہ اس کی سب سے بڑی دوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے حیدری طوائف کے حوالے کر دیا تھا - لیکن گزٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ انتزاع سلطنت کے زمانے تک قائم تھی - غدر مین غالباً بلوائیون نے اسے تباہ کر دیا - کیونکہ احمد اللہ شاہ نے (جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے

بڑی مستعدی و گرمجوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی مین سکونت اختیار کی تھی اسی مین اپنا دربار قائم کیا تھا۔ اور باغی فوجون کے افسر اکثر یہین جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے مین روشن الدولہ نے جو وزیر سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جس مین فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہین اسلیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزون کے قبضہ مین آیا ہے یہ کوٹھی ایک سرکاری جائداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہو کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظام مملکت کی خرابی تھی بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ دینداری کی رسمون سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا انتظام سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا۔ اور وزیرون کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے حکیم مہدی بلائے گئے وہ منتظم تو اعلے درجہ کے تھے مگر چاہتے تھے سلطنت کو اپنی ہی میراث بنالین۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے ان مین زیادہ تر نا طبیعت داری ان سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیون کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سارا روپیہ پانی کیطرح اُڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اسپرطرہ یہ کہ بادشاہ اور اُن کی ماں یعنی غازی الدین حیدر کی خاص محل مین جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ منا جان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھین اور بادشاہ اُس کو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتون نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا حکمرانون مین حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہین ہے۔

صاحب رزیڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا۔ ڈرایا ــ دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا۔ اور برابر کان کھولتے رہے مگر یہان کسی کے کان پر جون نہ رینگی نصیر الدین حیدر مین عورتون مین رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتون کی سی باتین کرتے۔ اور عورتون ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بی بی (اچھوتیان) اور اُن کی ولادت کی تقریبین جو اُن کی ماں نے قائم کی تھین ان کو اور زیادہ ترقی دے دی۔ یہان تک کہ ولادت ائمہ کی

تقریبوں مین خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے مین بیٹھتے۔ چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے جس کے لیے ولادت چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبین اسقدر زیادہ تھین کہ سال بھر بادشاہ کو انھین سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربار اودھ اور سرکار انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور ریزیڈنٹون کی نظر عنایت نہ ہوتی۔ اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگران تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو انتزاع سلطنت کی کارروائی اسی زمانے مین ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کر کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے پرانے معتبر لوگون کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتون کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتون مین بسر ہوتی تھی اسلیے ان کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتین ہی ہوتین۔ بیسیون عورتون کو ادنی قصور اور معمولی بدگمانی پر دیوارون مین چنوا دیا۔ کہتے ہین کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینہ پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا فوراً عورت کی چھاتیان اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیون کے بعد جبکہ اندر باہر تمام اہل دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے بادشاہ خود اپنے دوستون اور عزیزون کے ہاتھ کا شکار بنے اور کسی نے زہر دے کے سنہ ۱۲۶۶ محمدی (سنہ ۱۸۳۷ء) مین قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین لاولد مرے تھے منا جان جنھین غازی الدین حیدر کی بادشاہ بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارث سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونون نے انکے نسل شاہی ہونے سے انکار کیا تھا جس کی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ مرزا محمد علی خان کی تخت نشینی کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا منا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ مین آ گئین۔ ریزیڈنٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سنی اور زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا جنھون نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذرین لین۔ اور اپنے دشمنون سے فوراً بدلہ لینا شروع

شروع کر دیا۔ بہتون کے گھر لٹوائے بعض کو گرفتار کیا بعض قتل ہوئے۔ اور شہر مین ایک ہڑبونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اُن کے اسسٹنٹ فوراً دربار مین پہونچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ منا جان وارث سلطنت نہین ہو سکتے۔ اور اس مین آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا بہتر یہی ہو کہ منا جان تخت کو خالی کر دین۔ اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل مین آجائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے مندیاؤن سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بُلوالی تھی جس نے تختگاہ کے سامنے توپین لگا دی تھین اور سپاہی صفین باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عالیشان نے گھڑی ہاتھ مین لی اور کہا دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہو اس زمانے کے اندر اگر منا جان تخت سے نہ اُتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا حالانکہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہین۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہین۔

ان تنبیہون کا کسی نے خیال نہ کیا اور یکایک توپون نے گراہین مارنا شروع کین۔ آناً فاناً مین تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ مجرمی کر رہا تھا اس مین سے بھی کئی آدمی زخمی ہوئے۔ شیشہ آلات جھناجھن ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے مارے جا چکے تو منا جان نے بھی تخت پر سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا مگر پکڑ لیے گئے۔ غرض بیگم صاحب اور انہین دونون کو انگریزون نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل مین آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ اودھ قرار پائے۔ اور منا جان اور اُن کی دادی سخت حراست مین لکھنو سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنارگڈھ مین بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ۶۴ برس کی تھی - بوڑھے تجربہ کار تھے زمانے کے گرم و سرد اور دربار کی طفلانہ مزاجیان دیکھتے رہے تھے - سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھین دیکھے ہوئے تھے - انھون نے بہت سنبھل کے کام کیا - کفایت شعاری کے اصول جاری کئے - اور جہان تک بنا انتظام کے سنبھالنے کی کوشش کی - مگر عمر زیادہ آ چکی تھی - اور قوی جواب دیتے جاتے تھے - تخت پر بیٹھتے ہی انھون نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلوا کے خلعت وزارت دیا - مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے - تب ظہیر الدولہ کو خلعت وزارت ہوا - دو تین مہینہ بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوے - اور منور الدولہ وزیر قرار پائے - جھون نے دو چار مہینہ کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلا سے معلے چلے گئے - پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اوروں کے دیکھتے ذی ہوش اور متین تھے -

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ مین ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اُس مین معتد بہ اضافہ ہوا - اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اُس کے جس علاقے مین بد نظمی دیکھے اُسے جبتک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے - بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہد نامے پر دستخط کئے اور جہان تک بنا ملک کی اصلاح کرنے لگے -

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس انھون نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اُس کے قریب ایک عالیشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق و وسعت مین بڑھ جائے -

اُن دنون لکھنؤ کی آبادی و دولت اس قدر ترقی کر گئی تھی - اور اس کثرت سے آدمی اُس کی سواد مین آباد تھے کہ اُسے ہندوستان کا بابل کہنا بیجا نہ تھا واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا -

اس مشابہت کو شاید انگریزون یا کسی درباری سے سن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دین - اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دین

جو اُن کے نام کو تمام شاہان اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ انھون نے بابل کے مینار یا وہان کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد کے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے مقام پر تعمیر کرانا شروع کی جس مین محرابون کی مدور حلقہ پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقہ پر تیسرا حلقہ۔ غرض یونہین تلے اوپر قائم ہوکے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یونہین سات منزلون تک اُسے بلند کر کے ایک اتنا بڑا اور اونچا بُرج بنا دیا جائے جو دنیا بھر مین لاجواب ہو۔ اور اُس کے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اُس کے گرد کی فضا نظر آئے یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام "ستکھنڈا" قرار دیا گیا تھا۔ اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلین بننے پائی تھین کہ محمد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ ہجری (۱۸۴۲ء) مین سفر آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے مین بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہون یا ملک مین بدنظمی کی فریاد بلند ہو لکھنؤ کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کنارے کنارے ایک سڑک نکالی۔ جو چوک کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر با وجودہ و طرفہ عالیشان مکانون کے ایک طرف رومی دروازہ آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اُس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف ستکھنڈا اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اس نئے امام باڑے کی مختلف سربفلک عمارتین تھین اور اُن کے پہلو مین جامع مسجد واقع تھی۔ ان سب عمارتون نے مل کے دونون جانب ایک ایسا خوشنما اور نظر فریب منظر پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوشنما سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان مین باشندگان شہر کے جتنے مکانات واقع تھے سب کھُد گئے مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

خلفائی بنی امیہ کا ادبی مذاق

خالص عربی مذاق کو قائم رکھ کے جیسی شانداری و کرّ و فر کے کرشمے بنی امیہ کے خلفا نے دکھائے اور کوئی اسلامی سلطنت نہین دکھا سکی ہے۔ اور یہی سبب تھا کہ اصلی عربی لٹریچر اور ادبی علم و فضل کا جتنا بڑا مرکز مملکت ہسپانیہ مین کبھی تھی بغداد کی عباسی خلافت بھی نہ تھی۔ خلافت بغداد کی قوت بے شک بڑی تھی اور اس کا دربار بھی زیادہ پُرسطوت و جبروت نظر آتا ہے لیکن بغداد کے خلفا نے اپنے علمی ذوق مین جو کچھ کیا یہ تھا کہ دیگر زبانون کے علوم کثرت سے عربی مین نقل کر لیے۔ اسکے سوا اور تمام باتون مین ساسانی مذاق اور ایرانی معاشرت کا اُن پر اس قدر اثر پڑ گیا تھا کہ اُن مین نہ عربی وضع قطع ہی باقی رہی تھی نہ عربی سخن سنجی نہ عربی سادگی معاشرت باقی تھی نہ عربی آزادی و حریت اب اُن مین نہ وہ اگلا عربی لٹریچر تھا نہ وہ عرب العربا کی پُرانی پُرجوش و ولولہ خیز شاعری۔ ہر چیز مین عجمیت کی بو آ رہی تھی۔ اور بعض یورپین مورخین کا کہنا بالکل بجا ہے کہ دربار خلافت کا بغداد مین قائم ہونا عربی سطوت کا بڑھنا نہ تھا بلکہ دراصل عربیت پر عجمیت کی ایک زبردست فتح تھی۔

یہ خلاف عباسیون کے بنی اُمیہ کے دربار ابتدا سے آخر تک جہان رہے خالص عربیت کے رنگ مین ڈوبے رہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے عہد مین عربی زبان اور عربی لٹریچر نے بڑی ترقیان حاصل کین۔ دمشق مین خلفای بنی امیہ اگرچہ سطوت قیصری سے بڑھ کے شان و شوکت دکھا رہے تھے اور عیش و عشرت کے سامانون مین گھرے ہوے تھے مگر اپنے مذاق عربیت کے قائم رکھنے کا یہان تک اہتمام تھا کہ شاہزادے اور اعیان خلافت کے فرزند بچپن سے صحراے عرب مین بھیج دیے جاتے تاکہ قدیم قبائل عرب مین رہ کے عربی فصیح و خالص زبان کے ساتھ عربی خصائل و عادات کو سیکھین اور بدوی شجاعت سے ناآشنا نہ ہونے پائین۔ مگر بنی عباس کے زمانے مین یہ طریقہ تعلیم مفقود ہو گیا تھا۔

غالباً کہا جائے گا کہ اُن خلفا کے عہد تک عرب لوگ غیر قومون کے مذاق و معاشرت سے آشنا نہین ہونے پائے تھے اسلیے کہ وہ فتوحات عرب کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لیکن نہین۔ بنی اُمیہ اندلس نے بھی جو بنی عباس کے معاصر اور پورے رقیب تھے سرزمین اندلس مین پہونچنے کے بعد جو جزیرہ نماے عرب سے ہزارہا کوس کی مسافت پر تھی اپنے عربی مذاق کو نہین چھوڑا تھا۔

یہ دیکھ کے نہایت حیرت معلوم ہوتی ہے کہ گاتھ لوگون کی سرزمین پر اور مسیحیت کے آغوش مین جہان ایک طرف فرانسیسی و لاطینی معاشرت تھی اور اور دوسری طرف صحرا نشینان افریقہ کی رومی آمیز بدویت چند خانہ بدوش عربون نے پہونچ کے ایک ایسی زبردست سوسائٹی قائم کر لی جس کا مذاق خالص عربی تھا۔ اور جس کا لٹریچر عربی ادب کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھا جو کسی بیرونی اثر سے مغشوش نہ تھا۔ وہان ان پر نہ شارلمین کے دربار کا اثر پڑا نہ رومیون کے علم و فضل کا۔ نہ گاتھک معاشرت نے اُن کی عادات و اطوار کو بگاڑا نہ یونانی علوم نے ان کی سادگی مذاق و سادگی عقاید مین تفرقہ ڈالا۔ وہ خالص عرب تھے اور صدیان گزرنے کے بعد بھی خالص عرب رہے بلکہ اگر غور سے دیکھیے تو اُن کا مذاق سخن مصر و شام اور عراق و عرب کے شعرا کے مذاق سے اچھا اور سچا تھا۔

اندلس مین عربی ادب و شاعری کا سب سے بڑا قدردان خلیفہ الحکم المستنصر باللہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود بہت بڑا عالم و ادیب تھا۔ اور تصنیف و تالیف اور کتب بینی مین جیسا انہماک اُس کو تھا شاید دنیا کے کسی بادشاہ مین نہ دیکھا گیا ہوگا۔ اُس کا باپ مشہور خلیفہ اندلس عبدالرحمن ثالث الناصر لدین اللہ اگرچہ اپنی پچاس سال سے زیادہ زمانے کی حکومت مین ہمیشہ فتوحات اور خروج کشیون مین مصروف رہا۔ لیکن اس پر بھی اسپین مین اس کی قدردانی سے بڑے بڑے گران پایہ فاضلون کا مجمع ہوگیا تھا۔ خلف بن ایوب بن فرج کی شاعری کی ساری عربی دنیا مین دھوم تھی۔ اور اس کی نظمین اُن اعلیٰ محفلون مین جنھین ولی عہد خلافت

اکثر شاہی قصر مروان، میں منعقد کیا کرتا تھا اور جن میں تمام علما و فضلای ملک جمع ہوتے تھے) نہایت ذوق و محویت کے ساتھ سُنی اور سُنائی جاتی تھیں۔ اسی قسم کی ایک صحبت وزیر سلطنت عبید اللہ بن یحییٰ بن ادریس کے گھر پر بھی اکثر ترتیب ہوا کرتی اور ابن فرج اور دیگر مشہور شعرا کے اشعار لطف کے ساتھ پڑھے جاتے۔

ابوبکر اسمٰعیل بن بدر بھی اُس زمانے کا ایک فاضل گران پایہ تھا جس کی خلیفۃ الناصر بڑی قدر و منزلت کرتا جس کے اشعار پر بادشاہ نے شعر کہے تھے ایک اور گران پایہ صاحب علم و فضل سلیمان بن عبد الغافر القرشی تھا۔ یہ عالم ہونے کے ساتھ ایک زبردست سپہ سالار بھی تھا۔ بڑے بڑے میدانوں میں فتح کے جھنڈے اُڑا چکا تھا مگر اب دنیا سے علٰحدہ ہو کے لذات دنیوی سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ بہت ہی سادی زندگی بسر کرتا۔ جوتا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ بھیڑوں کی کھال اُس کا لباس تھا۔ اور شب و روز زہد و تقوی میں مصروف رہتا۔ اور باوجود اس شان کے اُس سے خلیفۃ الناصر سے اکثر صحبت رہتی۔ جیسے اُس پر اس قدر وثوق تھا کہ غربا میں اکثر خیرات اُسی کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی۔ اور بہت سے مفلوک الحال خاندانوں کی خبر گیری و دستگیری کا ذریعہ وہی تھا۔ الناصر نے ایک دن برسبیل تذکرہ اُس سے کہا "مجھے اپنی پچاس سال کی کامیاب اور فتحمندیوں کی سلطنت میں صرف چودہ دن ایسے نظر آتے ہیں جن میں پورا اطمینان قلب حاصل تھا"

عبد الرحمن الناصر آخر عمر میں اپنی زندگی مدینۃ الزہرا میں بسر کرتا۔ جس نئی ہی خوبصورت بستی کو اُس نے قرطبہ کے پاس آباد کر کے اور اپنی ایک محبوبہ خاص زہرا کے نام سے نامزد کر کے بڑے بڑے خوبصورت قصروں اور عالیشان جامع مسجد سے آراستہ کر دیا تھا۔ یہیں اس کے گرد بڑے بڑے علما و زہاد کا مجمع رہتا۔ اور اُس کی ترک دنیا کی زندگی علمی صحبتوں میں گزرتی۔ ایک بڑا صاحب علم ... اشبیلیہ ابوبکر اسمٰعیل بن بدر بن اسماعیل بن زیادہ تھا جو اموی النسل تھا۔ اُس کی نسبت ابن فرج نے اپنی کتاب "جنات" میں لکھا ہو کہ خیال آفرینی و سخن سنجی میں

تمام معاصرین سے بڑھا ہوا تھا۔
مرد تو مرد اُن دنون بہت سی صاحب علم عورتین الناصر کی شقیقانہ صحبت علم مین موجود تھین جن کے نام دنیاے اسلام مین ہمیشہ مشہور رہین گے۔ بادشاہ کی اس پاکبازی کی صحبت کو اکثر محسنہ کا دلکش نغمہ شگفتہ رکھتا۔ عسنہ صاحب علم و فضل تھی اور محل مین بادشاہ کی معتمدی یا پیش دستی کی خدمت انجام دیتی۔ فن موسیقی مین کمال رکھتی تھی اور اس کے ساتھ گلا بھی بڑا پیارا پایا تھا۔ دوسری خاتون عائشہ بنت احمد بن قاسم تھی جو قرطبہ کی ایک نازکبدن و نازک طبع نازنین تھی۔ اس کی شاعری کی ان دنون سارے اندلس مین دھوم تھی۔ اس کی نسبت عام خیال تھا کہ بہ اعتبار عصمت و عفت۔ حسن و جمال۔ اور علم و فضل کے سارے ملک مین اپنا جواب نہین رکھتی۔ صفیہ بنت عبد الراعی بھی اس عہد کی ایک بڑی صاحبہ علم خاتون تھی۔ اُس کے اشعار مین شاعرانہ نازک خیالی کے ساتھ ایسی عالمانہ متانت و بلند پردازی تھی کہ خلیفہ الناصر کو نہایت ہی لطف آتا۔ اسی درجہ کی ایک قابل کنیز ناراہیدیا تھی (غالباً یہ اندلسی زبان کا نام ہوگا یا ایسا بگڑا ہے کہ ہم نہین پہچان سکتے) جو بادشاہ کی محبوبہ تھی اور اُس کی خوش طبعی و ظرافت بذلہ سنجی و لطافت سے الناصر کے آخری ایام زندہ دلی و لطف مین بسر ہوتے۔

۳۵۰ھ مین جب عبد الرحمن الناصر نے سفر آخرت کیا تو خلیفہ الحکم کا علمی ذوق و شوق پہلے سے بہ درجہا زیادہ بڑھ گیا۔ ابتداے عمر سے اُسے علم کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے تمام عیش درکنار اُسے حکمرانی و فتحمندی مین اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ کتابون کے جمع کرنے اور اُن کے مطالعہ مین تھی اُس بات کی دُھن تھی کہ دنیا بھر کی عربی کتابین اُس کے کتب خانے مین جمع ہو جائین۔ چنانچہ اُس کی مسلسل کوششون سے شاعری ادب دینیات و اخلاق۔ تاریخ و جغرافیہ اور تمام علوم و فنون کی کتابون کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا جو دنیا کے کسی شہر مین نظیر نہ رکھتا تھا۔ اُس کے

نائب اور ایجنٹ کتابون کو تلاش کرتے ہوئے ساری دنیا مین مارے مارے پھرتے تھے۔ اور اسی مضمون کے نامہ و پیام سے کے اس کے سفیر افریقہ و مصر و شام و عراق اور فارس و عرب کے اسلامی دربارون مین پہونچے۔ اور انھین عام اجازت حاصل تھی کہ جتنا روپیہ درکار ہو خرچ کرین مگر کسی قیمتی کتاب کو ہاتھ سے نہ جانے دین۔
چند ہی روز مین شاہی قصر مروان کتابون سے بھر گیا۔ کتابون کے سوا اُس کے کمرون مین کوئی چیز نہ نظر آتی۔ اور فرنیچر وغیرہ جو کچھ تھا کتابین تھین۔ غرض سوا خلیفہ اندلس الحکم بن عبدالرحمٰن الناصر الملقب بہ مستنصر باللہ کے کوئی مسلمان فرمان روا دنیا مین نہین گزرا ہے جسے کتابون اور علم و فضل کا اس قدر شوق ہوا ہو۔ اُس کے پاس کتابون کے ذریعہ سے عربون کے اُن تمام قبائل کے انساب جمع ہو گئے جو عرب و افریقہ مین آباد تھے۔ اور اُن کے عرب سے نکل کے دیگر ملکون مین آباد ہونے اور مختلف مشاغل مین مصروف ہونے اور اُن کی نقل و حرکت کی پوری تاریخ موجود تھی۔ اُس کے قصر کا دروازہ اہل علم کے لیے ہمیشہ اور ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ جن مین سے اکثر کو وہ بہت کچھ دولت دے کے روانہ کرتا کہ دنیا کی سیر کرین اور جو نئی کتابین ملین اُس کے کتب خانے کے لیے لے آئین۔
اسی قسم کے جویاے علم علماے دربار مین سے ایک علامہ ابواسحٰق محمد بن القاسم الشیبانی تھے جو مصر مین اُس کے لئے کتابین تلاش کرتے۔ شام مین اُس کے ایجنٹ علامہ ابوعمر محمد بن یوسف بن یعقوب الکندی تھے جو غالباً مشہور فیلسوف عرب یعقوب کندی کے بڑے پوتے تھے۔
علامہ ابوالفرج اصفہانی نے جو نسل بنی اُمیہ سے تھے انھین دنون اپنی مشہور کتاب "اغانی" تصنیف کی تھی جس کی تصنیف کے ساتھ ہی ساری دنیا مین شہرت ہو گئی۔ خلیفہ الحکم نے علامہ موصوف کے پاس خاص اپنی دستخطی تحریر ایک ہزار اشرفیون کے ساتھ بھیجی جس کا

مضمون تھا کہ یہ تھوڑی رقم ابتداءً نذر کی جاتی ہو اور اس کے سوا جس قدر مطلوب ہو خزانے سے روانہ کی جائے گی۔ مہربانی کر کے اپنی کتاب کا ایک نسخہ میرے پاس بھیج دیجیے۔ علامۂ ممدوح نے فوراً اپنی کتاب مذکور کا ایک نسخہ روانہ کر دیا اور اُس کے ساتھ ہی خاندان بنی امیہ کی ایک تاریخ مرتب کر کے بھیجی جس مین تمام شاہان بنی امیہ کے حالات و انساب ایسے استیعاب کے ساتھ درج تھے کہ کوئی جزئی واقعہ بھی مصنف کے قلم سے نہین چھوٹا تھا۔ اور ملوک بنی مروان کی تعریف کے قصائد بھی تصنیف کر کے بھیجے۔

خاص بغداد مین بھی اُس کے ایجنٹ کی حیثیت سے محمد بن طرخان موجود تھا جو ہر کتاب کو چاہے کتنے ہی دامون پر ملے بلا تامل خرید لیتا۔ اسی قدر نہین الحکم نے دنیا کے ان تمام اسلامی شہرون مین جو علم و فضل کے اعتبار سے شہرت رکھتے کاتب مقرر کر رکھے تھے اور اُن کو حکم تھا کہ جو کتابین قیمتہً دستیاب نہ ہو سکین تو جس طرح بنے اُن کی نقلین کرا لائین۔

اس کوشش اور ایسے ذوق و شوق سے الحکم نے قرطبہ کا کتبخانہ جمع کیا۔ جس مین کتابین نہایت ہی صفائی اور اہتمام سے رکھی جاتین جو علوم اور فنون کے لحاظ سے جدا جدا مرتب تھین قصر مروان کے ہر کمرے اور بڑے ہال بین لکھ کے لگا دیا گیا تھا کہ اس مین کن کن فنون کی کتابین ہین۔ ان کتابون کی اُس نے جو فہرست خود ہی مرتب کی تھی۔ اُس مین صرف کتابون اور مصنفون ہی کے نام نہ تھے بلکہ یہ بھی درج تھا کہ مصنف کون تھا؟ کہان کا تھا؟ اُس کا نسب کیا تھا؟ اُس کے کمالات کیا تھے؟ اور علم و فضل کی دنیا مین اس کا کیا پایہ تھا؟

اس جستجو و تدقیق کا یہ نتیجہ تھا کہ الحکم کو اُن تمام عربون کے انساب ازبر تھے جو اندلس کے مختلف شہرون مین جا جا کے آباد ہو گئے تھے اور علم انساب مین وہ اپنے زمانے کا بے نظیر و بے ہمتا عالم تھا۔

اس علمی تحقیق میں اُسے اپنے معتمد ابو عبد السلام غالب بن محمد بن
عبد الواہب سے نہایت ہی بیش قیمت مدد ملتی تھی - اسی ابو عبد السلام
نے بادشاہ کے اشارے سے اندلس کے ہر ہر شہر اور قریے کا ایک
ایک گزیٹر مرتب کیا تھا جس سے سارے ملک کی حالت آئینہ ہو گئی تھی

علامہ ابو محمد ابن حزم جو اُن چند منتخب علما سے اسلام میں ہیں
جن پر دنیاے اسلام کو ناز ہو اپنی کتاب الفصل فی الملل والاہوا
والنحل میں" خلیفہ الحکم کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ خلیفہ اپنی پندرہ سالہ
فرمان روائی میں علم اور اہل علم کا حامی و مربی رہا جس کے ساتھ رعایا
کو دلی محبت تھی اور لوگ اس کی علم پروری پر ناز کرتے تھے"

اندلس کا نامور مورخ ابن حیان الحکم کے اس کتب خانہ کا نام
"کتب خانہ مروانیہ" بتاتا ہے - اسلیے کہ وہ قصر مروان میں تھا - اور
کہتا ہے کہ "اس کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی - اور ہر جلد میں
بچاس تختے لگے تھے - اور یہ جلدیں اول سے آخر تک کتابوں اور مصنفوں
کے ناموں سے بھری ہوئی تھیں" - ایک اور مصنف طلید الفتحی کہتا ہے
کہ کتب خانے کی فہرست الحکم کے زمانے میں پوری طرح مکمل نہیں ہونے پائی تھی
بلکہ الحکم کے بعد اُنکے بیٹے خلیفہ ہشام نے اسے تکمیل کو پہونچایا"

ان واقعات کو سنکے انسان کے دل میں خیال گزر سکتا ہے کہ
الحکم صرف کتاب کا کیڑا تھا اور ملاؤں اور کتابوں میں حد سے زیادہ
مصروف ہو جانے کے باعث فوج کشی خوش تدبیری اور دیگر امور
سلطنت کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا ہوگا - لیکن ایسا نہ تھا - الناصر
نے اپنی زندگی ہی میں فرمان روائی سے گوشہ گیر ہو کے نظام سلطنت
فاضل بیٹے کے ہاتھ میں دے دیا تھا - اُسوقت اُس نے اپنی علمی
مشاغل کے لیے وقت مقرر کر کے حکمرانی کے لیے کافی زمانہ نکال لیا تھا -
اور تمام انتظامات نہایت ہی حسن و خوبی سے انجام دے لیکن اُن میں بھی
قدر دانی علم کا وہی عالم تھا - افریقہ اندلس ممالک اسلامیہ مشرق سے

تمام علما و فضلا کے پاس اُس نے پیام بھیجا کہ یہان آ کے قیام کیجیے۔ اور ہسپانیہ کو اپنا گھر بنائیے۔ اُس کے دو بھائی تھے عبد العزیز اور المنذر جو علم و فضل مین اُس کے ہم مذاق تھے۔ کتب خانہ کو اُس نے عبد العزیز کے انتظام مین دیا۔ اور المنذر کو صرف اس کام پر مامور کیا کہ علما و فضلا کی خدمت و خبرگیری کیا کرے۔ اور اس طرح اُن کی دلدہی کرے کہ وہ شوق سے یہان رہین اور اپنے وطنون کو بھول جائین

ان دونون برخلاف عام سلاطین اور دولت مندون کے اندلس کی شاہی شہر مدینۃ الزہرا کے قصرون اور کوشکون مین بجاے اس کے کہ عیش و عشرت کے کرشمے نظر آئین اور رقص و سرود کی محفلین گرم ہون ہر وقت علمی صحبت قائم رہتی۔ اور سوا علوم و فنون کے کسی چیز کا چرچا نہ تھا۔ رضیہ نام ایک مہ جبین عورت الحکم کی محبوبۂ خاص تھی۔ اُس کے سوا اور کسی پری وش نازنین کی صحبت مین اُس کا دل نہ لگتا۔ اس مہ جبین عورت کی نسبت مورخین اندلس کہتے ہین کہ جس طرح حسن و جمال اور ناز و انداز مین جواب نہ رکھتی تھی اسی طرح علم و فضل اور تاریخ دانی و سخن سنجی مین بھی یکتاے روزگار تھی جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُس کے ساتھ الحکم کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہین بلکہ اُس کے علم و فضل کی وجہ سے محبت تھی۔ الحکم نے اُسے "نجم السرور" خطاب دیا تھا اسلیے کہ اس کی صبح عید کا مطلع رضیہ ہی کا دلکش چہرہ تھا۔

الحکم کی خدمت مین سب سے زیادہ رسوخ علامہ محمد بن یوسف کو تھا جو وادی الحجارہ کے رہنے والے تھے اور ایک مشہور زمانہ مورخ تھے انھون نے اسپین اور افریقہ کی ایک ضخیم و مستند تاریخ لکھی تھی جسمین بادشاہون اور مشاہیر ملک کے حالات درج تھے۔ اسی عہد کا ایک اور ادیب محمد بن یحیی تھا۔ جس پر بادشاہ کو ناز تھا۔ اس کی علمی قدردانی کی یہ حالت تھی کہ تخت نشینی کے دوسرے ہی برس سرحد کے مسیحی باغیون کی سرکوبی کے لیے زبردست فوج لے کے روانہ ہوا تو طلیطلہ

(بالڈو) میں پہونچ کے سُنا کہ فوج کا کوئی نوجوان بیماری کے عذر پر شرکت جہاد سے معافی چاہتا ہو۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ قاضی عبد الولید یونس بن عبد اللہ شہیر بہ ”ابن الاصفر“ کا بیٹا عبد اللہ ہو اور نوعمری ہی میں علم و فضل اور ذوق تاریخ کے لحاظ سے فرید زمانہ بن گیا ہو۔ سامنے بلوا کے اُس کی صورت دیکھی۔ حالات دریافت کیے۔ اور اپنے سپہ سالار سے کہا ”انھیں رہنے دو۔ اِن کی صحت بہت قیمتی ہو۔ اچھے ہو گئے تو اِن سے ایسے کاموں کی امید ہو جو مجھے بہت عزیز ہیں“ پھر اُس سے کہا ”عبد اللہ! تم اُن لوگوں میں ہو جن کی ذات سے مجھے امید ہو کہ بنی عباس کی قلمرو کی علمی ترقیوں کو حسد کی نگاہ سے نہ دیکھوں گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم قرطبہ میں چلے جاؤ۔ اور وہاں میرے قصر مطلاً میں جو دریا کنارے ہو قیام کرو۔ وہاں کی آب و ہوا میں جب میرے اطبا پوری توجہ سے علاج کریں گے تو جلدی اچھے ہو جاؤ گے“ نوجوان نے شکر گذار ہو کے عرض کیا ”میں اپنے گھر کی خاموشی میں زیادہ اچھا کام کر سکوں گا“ اور خلیفہ کی نظر عنایت کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ نوجوان تندرست ہوتے ہی شعرائے سلطنت کے قصائد جمع کرنے اور ایک مکمل تاریخ مدون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس قدر جلد اس علمی خدمت کو انجام دیا کہ ادھر الحکم فتح کے پھریرے اُڑاتا ہوا قرطبہ میں آیا اور اُدھر نوجوان عبد اللہ اپنی کتاب لے کے حاضر دربار ہوا جو علما و فضلا کے مجمع میں پسند کی گئی۔ اور عبد اللہ بھی اُن مستند صاحب علم لوگوں میں شامل ہو گیا جنھیں خاص مدینۃ الزہرا کی اکیڈمی میں جگہ دی گئی تھی۔

جو اہل علم وہاں جمع تھے اُن میں ایک احمد بن سعید الہمدانی تھے جنھوں نے اسپین کی تاریخ لکھی تھی۔ ایک یوسف بن ہارون الرمادی تھے جو ابو عمر کے لقب سے مشہور تھے۔ اسی طرح کے اور صدہا عالم تھے جو مختلف علوم میں باکمال تسلیم کیے جاتے۔

اُن دنون اسپین مین علم و فضل کو اس قدر ترقی تھی کہ مرد تو مرد عورتین بھی اپنی علمی قابلیتون سے ناموری حاصل کر رہی تھین - الناصر کے عہد کی صاحب علم عورتون کے حالات ہم بتا چکے ہین - الحکم کے زمانے مین نئی عورتین شہرت کے شہ نشین پر آئین - الحکم کے قصر لبنی مین ایک بہت بڑی صاحب علم نازنین تھی جو نحو وصرف ادب اور شاعری مین مشہور تھی - ان علمون کے علاوہ اُسے علوم ہندسہ وریاضی مین بھی اچھا دخل تھا - عبارت نہایت ہی پاکیزہ لکھتی تھی - اور اُس کی ہر ہر ادا کی طرح اس کا ہر ہر فقرہ بھی دلکش ہوتا تھا - بادشاہ جب محل مین ہوتا تو اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فرمان جاری ہوتے الحکم اُس کے زور قلم زور بیان اور اُس کی رائے صائب کا نہایت ہی معترف تھا -

محل ہی مین ایک اور لائقہ و فاضلہ فاطمہ بنت زکریا ہی شبلیری تھی اُس کے زور قلم اور عبارت آرائی کی بھی اندلس مین دھوم تھی - ایک خاتون عائشہ بنت احمد بن محمد تھی جس کے علم و فضل اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے دیگر محاسن کا قرطبہ مین بہت شہرہ تھا - ابن حیان اس خاتون کی نسبت اپنی تاریخ مین لکھتا ہے کہ سارے اسپین مین اُن دنون کوئی عورت نہ تھی جو حسن و جمال عفت و عصمت اور فضیلت و علمیت مین اس کی مدمقابل ہو سکے - خوبی عبارت کے ساتھ اُس کی خوشخطی بھی ایسی اعلی درجہ کی تھی کہ دیکھ کے آنکھین روشن ہو جاتین -

شہر مین ایک اور صاحب علم خاتون تھی حفصہ بنت جعفر بن نصیر التمیمی اُس نے علمی کتابون کا ایک بہت اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا اور اُس کے اشعار مقبول عام تھے - چونکہ وہ نہایت ہی خوش گلو تھی اسلیے اپنے اشعار ایسے دلکش نغمہ کے ساتھ سنایا کرتی کہ سننے والے وجد مین آجاتے - ایک عالمہ خاتون مریم بنت ابو یعقوب انفیصولی التغلبی تھی اُسنے اشبیلیہ مین ایک مدرسۂ نسوان جاری کر رکھا تھا جس مین وہان کے تمام معززین کی لڑکیان تعلیم پاتین - اور چند روز مین یہ ہو گیا کہ قرطبہ کی قریب قریب تمام امیرزادیان اور معزز خاتونین اسی مدرسہ کی "اولڈ گرلز" تھین

الحکم کی وفات کے بعد رضیہ نے محض علمی شوق مین مشرق کا سفر اختیار کیا مصر و شام و عراق کی تمام شہرون مین گئی - اور جہان پہونچتی اُس کا نام ہر جگہ اس سے پہلے پہونچ چکا ہوتا - ا

تمام تصانیف مولانا شررؔ اور مطبع دلگداز کی دوسری کتابیں

تصنیفات مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شررؔ

تاریخ و سیر وغیرہ

(۱) ابوبکر شبلی۔ حضرت شیخ شبلی کے حالات ۔ ۔
(۲) تاریخ سندھ۔ سندھ کی مکمل تاریخ ہر دو جلد قیمت
جلد اول ۔ جلد دوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(۳) حروب صلیبیہ۔ مصنفہ مسٹر کاکس کا ترجمہ نوٹس ۔
(۴) تاریخ بغداد۔ مرکز خلافت عباسیہ۔ قیمت ۔
(۵) ملکہ زنوبیہ۔ ایک عربی نژاد ملکہ ۔ ۔ ۔ ۔
(۶) خواجہ معین الدین چشتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(۷) الحکم الرفاعیہ۔ مصنفہ شیخ احمد رفاعی کا ترجمہ ۔
(۸) آغائی صاحب۔ رئیس لکھنؤ مرحوم کے حالات ۔
(۹) سکینہ بنت حسین۔ جناب سکینہ کے حالات ۔
(۱۰) سرسیّد کی دینی برکتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ناول

(۱۱) رومتہ الکبریٰ۔ سب سے نیا اور تاریخی ناول ۔
(۱۲) حسن کا ڈاکو۔ سب سے نیا اخلاقی ناول حصہ اول ۔ حصہ دوم ۔
(۱۳) زوال بغداد۔ شیعہ اور سنیوں کا جھگڑا اور سلطنت عباسیہ کا خاتمہ ۔
(۱۴) غیب دان دلھن۔ پاکدامن اور عفیفہ دلہن بی بی کی برکتیں اور اس کی حیرت انگیز غیب دانی ۔ ۔ ۔ ۔
(۱۵) ماہ ملک۔ مولانا کا نیا اور اچھوتا ناول ۔
(۱۶) یوسف نجمہ کامل۔ بے جگ بیتی نہیں آپ بیتی ۔

(۱۷) فتح اندلس۔ اسپین پر عربوں کا حملہ ۔ ۔
(۱۸) مقدس نازنین۔ ایک عورت کا پوپ بن جانا ۔ ۔
(۱۹) ملک العزیز ورجنا۔ تیسری صلیبی لڑائی ۔ ۔
(۲۰) ایام عرب۔ جاہلیت عرب کے حالات ہر دو حصہ ۔
(۲۱) فردوس بریں۔ جیتے جی جنت کی سیر ۔ ۔
(۲۲) حسن انجلینا۔ روم اور روس کی لڑائی ۔ ۔
(۲۳) منصور موہنا۔ ایک عربی خاندان سندھ میں ۔ ۔
(۲۴) شہید وفا۔ اسپین میں مسلمانوں کی پہلی ۔

(۲۵) جلد ہائے دلگداز

جلد دلگداز ۱۹۰۰ء	جلد دلگداز ۱۹۰۶ء
جلد دلگداز ۱۹۰۹ء	جلد دلگداز ۱۹۱۰ء
جلد دلگداز ۱۹۰۵ء	جلد دلگداز ۱۹۱۱ء
جلد دلگداز ۱۹۰۶ء	جلد دلگداز ۱۹۱۲ء

جلد دلگداز ۱۹۱۳ء

دیگر اعلیٰ مطبوعات دلگداز پریس

معاشرت۔ ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی کتاب انگریزی کی
گلستان سر جان لبک کی "یوز آف لائف" کا ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔
آتالیق بی بی۔ میاں بی بی کے اخلاق پر بی بی کی مزیدار
نکتہ چینیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
رفع النقاب۔ مصر میں پردے کے خلاف ایک
بے مثل رسالہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولنا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرۂ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

حسن کی کرشمہ سازیان

بثینہ محبوبۂ جمیل

ان دنون جمیل کا معاصر شاعر کثیر تھا - اور جس طرح جمیل بثینہ کے شمع رخسار کا پروانہ تھا وہ عزہ نام ایک مہ پارہ نازنین کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا - اتفاقاً کثیر ایک دن جمیل سے آ کے ملا - جمیل نے پوچھا "کہان سے آتے ہو؟" کہا "بثینہ کے باپ کے پاس سے آ رہا ہون" پوچھا "اور جا کے کہان ہو؟" کہا "عزہ کے شوق دیدار مین جاتا ہون" بولا "تو پہلے ایک کام کرو - عزہ سے پھر مل لینا - اسوقت بثینہ کے قبیلہ مین واپس جاو - اور جس طرح بنے میرے لیے اُس سے وعدۂ وصل لے آو" کثیر نے عذر کیا کہ "مین ابھی ابھی وہان سے چلا آتا ہون دوبارہ جاتے شرم آتی ہے" بولا "شرم آتی ہو تو آیا کرے - اس وقت تو تمھین میری خاطر سے وہان جانا پڑے گا" مجبور ہو کے کثیر نے کہا "اچھا بتاو تمھین اُس سے ملے ہوے کتنے دن ہوئے؟" کہا "اوائل شوال مین اس کا دیدار نصیب ہوا تھا - اور چونکہ مین اُس کے قبیلے کے پڑاو کے قریب وادی دوم نام ایک نالے کے کنارے پہونچا تھا کہ کیا دیکھتا ہون بثینہ اور اُس کی ایک لونڈی کپڑون کی گٹھری لیے ہوئے نہانے اور کپڑے دھونے کو آ رہی ہین - جب وہ پانی مین

اُتر چکین تو مجھ سے نظر دو چار ہوئی۔ بثینہ نے کوئی اجنبی سمجھ کے جھٹ پٹ ایک بھیگی چادر مین مُنھ چھپا لیا اور لونڈی نے پوچھا ”آپ کون ہین؟“ مین نے کہا ”جمیل“ نام سُنتے ہی بثینہ نے چہرہ کھول دیا۔ مانوس ہو کے بے تکلف باتین کرنے لگی۔ اور غروب آفتاب کے وقت تک اُس سے لطف و محبت کی باتین ہوتی رہین۔ اب جدائی کی گھڑی آپہونچی تھی۔ مین نے پوچھا ”اب اس کے بعد کب ملو گی؟“ بولی ”اس وقت اس کا کیا جواب دون؟ ہمارا قبیلہ یہان سے کوچ کرنے والا ہو۔ کسے خبر کہ اب کہان پڑاؤ ہوگا؟ اور کب اور کس جگہ ملنے کا موقع ملے گا؟“ لاچار مین چلا آیا۔ جب سے درد فراق مین مبتلا ہون۔ اور اس درد کا علاج سوا تمھارے کسی سے نہین ہو سکتا۔“

کثیر مجبوراً اُلٹے پاؤن بثینہ کے قبیلہ کی طرف پھر چل کھڑا ہوا اور جمیل سے کہتا گیا ”جب تک مین واپس نہ آؤن تم یہین ٹھہرے رہنا۔“ بثینہ کے باپ نے جیسے ہی کثیر کو واپس آتے دیکھا جوش مسرت سے مرحبا کہی اور واپسی کا باعث دریافت کیا۔ کہا ”آج تین نئے شعر میرے خیال مین آئے ہین۔ جی چاہا کہ تمھین آکے سناؤن۔“ جواب ملا ”ضرور سناؤ۔ اس سے بڑی کیا عنایت ہو سکتی ہو؟“ کثیر نے خیمے کے پاس کھڑے ہو کے اور اس بات کا یقین کر کے کہ بثینہ کے کان تک آواز پہونچ جائے گی اپنے وہ اشعار سنائے۔ اُن اشعار کا مضمون یہ تھا کہ ”مین نے جمیل سے کہا کہ اپنا قاصد بھیجون گا تاکہ تو بتائے کہ کب ملے گی۔ اور وصال کے بارے مین تیرا کیا حکم ہو۔ آخری ملاقات وادی ردم مین ہوئی تھی جب کپڑے دھوئے جا رہے تھے۔“ یہ اشعار سُنتے ہی بثینہ بیتاب ہو گئی۔ بے اختیار سینہ پر ایک دوہتڑ مارا۔ اور منھ سے نکلا ”ارے رے رے!“ باپ گھبرا کے اندر دوڑا گیا۔ اور پوچھا ”بیٹی کیا ہوا؟ خیریت تو ہو؟“ بولی ”وہ کچھ نہین۔ وہی کُتا تھا جو لوگون کے سو جانے کے بعد رات کو پہاڑون سے نکل کے آتا ہو۔ میری آواز سن کے بھاگ گیا۔“ یہ کہہ کے اُس نے اپنی لونڈی سے چلّا کے کہا ”دو چار دوڑ کے دومات (چند ٹیلون کا نام) سے لکڑیان لے آ۔ تاکہ ہم ایک بکری ذبح کر کے اپنے مہمان کو کھلائین۔“ کثیر نے یہ سن کے کہا ”نہین! تکلیف نہ کرو۔ مجھے اس وقت

جانے کی جلدی ہو۔ ٹھہر نہیں سکتا۔ اور اسی دم واپس آ کے جمیل سے یہ کیفیت بیان کی۔ وہ سنتے ہی مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو گیا اور بولا "میری بثینہ نے اُس وقت جب سارے قبیلہ والے رات کو سو چکیں گے دہات میں ملنے کا وعدہ کیا ہے" کثیر نے کہا "اگر تمھارے نزدیک اُس نے وعدہ کیا ہے تو چلو۔" شام ہوتے ہوتے دونوں دہات میں پہونچ گئے۔ بثینہ نے ساتھ لینے کو اپنی بہن ام الحسین اور اپنی خالہ زاد بہنوں لیلیٰ اور نجیا کو بھی راضی کر لیا تھا جب سب سو گئے تو چاروں لڑکیاں اپنے خیموں سے نکل کے مقام موعود پر آ پہونچیں۔ عاشق و معشوق عجیب خلوص اور خوشی سے ملے۔ صبح تک ایک دوسرے کی باتوں اور صحبت جاناں کی لذتوں میں مشغول اور مسرور رہے۔ خود کثیر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی بھر نہ اس سے زیادہ عفت و پاکبازی کی کوئی صحبت دیکھی تھی۔ اور نہ کبھی اس سے بڑھ کے سچی محبت کا کوئی منظر نظر آیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے اس قدر واقف تھے اور دلوں کی باتوں کو اس طرح سمجھ جاتے تھے کہ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کس کا عاشقانہ علم غیب بڑھا ہوا ہے آخر روز ہجران کی قیامت کا آفتاب نکلا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہو کے اپنے گھروں کو سدھارے۔

اس ملاقات کی بثینہ کے گھر والوں کو خبر ہو گئی۔ اور سب نے قسم کھا لی کہ جمیل جہاں ملے گا مار ڈالیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیل و بثینہ پر دنیا تنگ تھی۔ بثینہ تو گھر میں پڑی پڑی کڑھا کرتی۔ مگر جمیل کا یہ عالم تھا کہ جوش عشق جنون اور مالیخولیا کی شان دکھانے لگا۔ راتوں کو قبیلۂ بثینہ کے قریب آتا۔ اندھیرے میں ٹیلوں پر چڑھتا۔ اور دیار جاناں کی طرف رخ کر کے ہوا سے کہتا۔

هبي لي نسمة من ريح بثن ومنّي بالهبوب الى جميل

(بثینہ کی خوشبو کا کوئی جھونکا لا۔ اور جمیل پر اتنا احسان کر کہ اس کی طرف چل)

ان پہاڑوں میں رات بھر روتا اور صبح سے پہلے بھاگ جاتا۔ ادھر بثینہ کا یہ عالم تھا کہ اپنی سہیلیوں سے بار بار کہتی "وہ ہائے جمیل کے رونے کی آواز آ رہی ہے" وہ کہتیں "ہوش کی دوا کرو۔ جمیل یہاں کہاں؟"

انھیں دنون کثیر سے پھر ملاقات ہوئی۔ اُسے جمیل کی بیتابیان دیکھ کے اُس کے چند مشہور اشعار یاد آئے۔ جو اُس نے بثینہ کے فراق مین کہے تھے وہ اشعار پڑھے اور کہا "کیا بثینہ نے یہ شعر نہیں سُنے جو اس قدر بے پروا ہو؟" جمیل نے اسی قسم کے چند اشعار کثیر کے پڑھ دیے اور کہا "کیا عزہ کے کان تک تمھارے یہ شعر نہیں پہونچے جو تمھیں نہین پوچھتی؟" جواب معقول تھا دونون نے لپٹ کے رونا شروع کیا اور ساری رات روتے اور آنسو بہاتے رہے۔

آخر جوش عشق اس حد کو پہونچا کہ نہ رہا گیا۔ اور یہان پر کھیل کے جمیل قبیلۂ بثینہ کی طرف چلا۔ اور ایک تالاب کے قریب پہونچ کے ٹھہر گیا کہ بثینہ کی کوئی لونڈی یا اُس کے گلہ کی چرانے والی خادمہ ملے تو زہے قسمت خوشامد درآمد کر کے پیام شوق لیجانے پر راضی کرے۔ بثینہ کی کوئی لونڈی تو نہ ملی مگر بنی عذرہ ہی کی ایک اور حبشن لونڈی مشک لیے ہوے پانی لینے کو آ گئی۔ وہ اتفاق سے جمیل کو پہچانتی تھی۔ صورت دیکھتے ہی چلائی "واخاہ! کیسے رہے؟" اور اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے لگی۔ جمیل نے کہا "تمھیں مجھ پر ترس آتا ہو تو اتنا احسان کرتین کہ کسی بہانے سے میری یہ انگوٹھی لیجا کے بثینہ کو دے دیتین۔ میرا پیام شوق پہونچاتین۔ اور اُس سے وعدۂ وصل لے آتین۔ تم جب تک واپس نہ آؤگی مین یہان تمھارا منتظر رہون گا" لونڈی نے قبول کیا۔ اور انگوٹھی لے کے گھر گئی۔ یہان باتون مین اُسے اتنی دیر ہوگئی تھی کہ اُس کے آقا نے خفا ہو کے پوچھا "اتنی دیر تو نے کہان لگائی؟" اس نے کچھ معمولی عذر کر دیے جن کا کسی کو یقین نہ آیا۔ اور لوگ اس سے مار مار کے پوچھنے لگے کہ "سچ بتا اتنی دیر سے کہان تھی؟" زیادہ مار پڑی تو اُس نے ساری کیفیت بیان کر دی اور جمیل کی انگوٹھی نکال کے اُن کے ہاتھ مین رکھ دی۔ اس واقعہ کی خبر بثینہ کے گھر مین پہونچی تو اُس کے باپ بھائی اور شوہر تلوارین سُوت سُوت کے کھڑے ہو گئے کہ اسی وقت جا کے اس کا کام تمام کر دین گے۔ خدا کی قدرت دو چار عذری جوان آ گئے جنھین جمیل سے ہمدردی تھی۔ انھون نے ان لوگون کو قتل پر آمادہ دیکھ کے کہا "کیا ہوا کیا؟" انھون نے ساری

سرگذشت بیان کرکے کہا "جاتے ہیں جمیل کو مار ڈالیں گے"۔ جرا ثرن سے پوچھا "جمیل ہے کہان؟" کہا "ان پہاڑیون کے اُس طرف فلان مقام پر"۔ کنانہ نے کہا "لیکن تم نے اسے کوئی جرم کرتے یا بثینہ سے ملتے نہیں پکڑا ہے۔ اُس کی نکسیر بھی پھوٹی تو اُس کے اعزہ بدلہ لینے پر آمادہ ہو جائینگے"۔ یہ سن کے بثینہ کے عزیز خاموش ہوئے اور کہا "پھر کیا کرین؟" کہا "اگر اُس سے انتقام لینا چاہتے ہو تو ایسی تدبیر کرو کہ وہ بثینہ کے پاس بیٹھا اور اُس سے باتین کرتا ہوا پکڑا جائے"۔ یہ تجویز پسند کی گئی۔ اور یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اُس حبشن لونڈی کو انگوٹھی واپس دی گئی۔ اور کہا گیا کہ تو اُسے لے جا کے بثینہ کو دے۔ اور اُن سے وعدہ لے۔ اور یہ نہ بتا کہ کسی اور کو بھی خبر ہوگئی ہے۔ اور جس وقت وہ جانے کا وعدہ کرے اُس کی ہمین خبر کر دے۔ لونڈی تو ادھر بثینہ کے پاس گئی۔ اور یہ لوگ اِدھر سیدھے جمیل کی تلاش مین روانہ ہوئے۔ پتہ پوچھ ہی لیا تھا دم بھر مین جا پہونچے اور سارے واقعہ کی خبر کر دی۔ جمیل نے کہا "خیر مین تو چلا جاؤنگا مگر تم کسی طرح بثینہ کو خبر کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ یہان آکے پریشان ہو"۔ سب نے اس کا وعدہ کیا۔ اور جمیل کو وہان سے بھگا کے آئے اور بثینہ کی لونڈی کو کچھ دے دلا کے راضی کیا۔ اور اُس کے ذریعہ سے اُسے بھی خطرے اور جمیل کے چلے جانے سے آگاہ کر دیا۔

اس کے بعد پھر جمیل و بثینہ مین کئی ملاقاتین ہوئین۔ اور اہل قبیلہ کو معلوم ہو گیا کہ بثینہ اپنی حرکتون سے باز نہین آتی۔ اور برابر جا جا کے ملتی ہے۔ تب ناچار ہو کے انھون نے اُم منظور نام ایک بڑھیا کو بثینہ کا نگہبان مقرر کیا جو ہر وقت سایے کی طرح اُس کے ساتھ رہتی۔ اور کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتی۔ جمیل کو شوق دیدار اُم منظور کے پاس لے آیا۔ اُس کے ہاتھ جوڑے ناک رگڑی سب طرح کہا کہ "لِلّٰہ بثینہ کو ایک نظر دکھا دو"۔ وہ بگڑ کے بولی "جاؤ اپنا کام کرو۔ مین کوئی کٹنی نہین ہون"۔ جمیل نے کہا "بُوا ایسا نہ کرو کہ پھر تمھین میری شکایت ہو"۔ اُم منظور نے ایک نہ سنی۔ اور جمیل نے نہایت ہی حسرت کے ساتھ بے دلی کی حالت مین دو شعر کہہ ڈالے جن کا مضمون یہ تھا کہ "ہاے وہ گھڑی نہ بھولوں

جب اُم منظور نے سب سے چھپا کے مجھے بثینہ کا جلوہ دکھایا تھا" یہ اشعار انکی زبان سے نکلتے ہی قبائل عرب مین مشہور ہوگئے۔ اور جب بثینہ کے شوہر اور باپ بھائی کے کان تک پہونچے تو وہ ام منظور پر بہت بگڑے۔ اس نے لاکھ قسمین کھا کھا کے اپنی برارت کی ایک نہ مانی اور اُس پر سے بھی اپنا اعتبار اٹھا لیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہو کہ جو واقعہ جمیل نے شعرون کے ذریعہ سے مشہور کیا اس کی کچھ اصلیت بھی تھی۔ کیونکہ مصعب بن زبیر نے اپنے عروج اور حکومت عراق کے زمانے مین کسی کی زبانی جمیل کے اِن دو شعرون مین سے ایک کو سنا تو اُنھیں بڑا لطف آیا۔ اور جوش مین آکے کہنے لگے "کاش یہ معلوم ہوتا کہ ام منظور نے جمیل کو بثینہ کا جلوہ کیونکر دکھایا تھا؟" جس نے شعر سنایا تھا اُسی نے ان کی یہ تمنا سن کے کہا "وہ تو مشکل ہی کیا ہو۔ جس ام منظور کا اس شعر مین ذکر ہو ابھی زندہ موجود ہو خود اُس سے بلا کے پوچھ لیجیے"۔

مصعب نے فوراً جہان ام منظور تھی وہان کے عامل کو حکم بھیجا کہ "ام منظور کو فوراً میرے پاس عزت و حرمت سے سوار کرا کے بھیجو" اور جب وہ آئی تو کہا "بڑی بی اتنا بتا دو۔ تم نے کس ادا سے بثینہ کو جمیل کا جلوہ دکھایا تھا کہ اس سے ایسا مزے کا شعر نکل گیا؟" ام منظور نے کہا "سنیئے۔ مین نے ایک ہار بثینہ کے گلے مین ڈال دیا تھا۔ ایک خمار سر مین لپیٹ دی تھی۔ کاکلون کی چوٹیان گوندھ دی تھین۔ اور مانگ مین خلوق (خوشبو جو صندل کی طرح لگائی جاتی تھی) لگا دیا تھا بس اتنا ہی سنگار کر کے مین نے بثینہ کو ایک جگہ بٹھا دیا اور جمیل کو صرف اتنی اجازت دی کہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کے پاس سے گزر جائے۔ اسی شان سے وہ کن انکھیون سے دیکھتا ہوا گزرا۔ اور قدم قدم پہ پھر پھر کے دیکھتا جاتا تھا یہان تک کہ نظر سے غائب ہو گیا"۔ مصعب کو ان دنون عائشہ بنت طلحہ کے عشق کا دورہ تھا۔ اُن سے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور ہر لحظہ اُن کے شمع رخسار کے پروانے بنے رہتے۔ ایک بیتابی کے ساتھ ام منظور کو قسم دلائی کہ "یونہین تم مجھے عائشہ بنت طلحہ کا جلوہ دکھا دو" بڑھیا کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔

اپنے خیال کے مطابق عائشہ بنت طلحہ کو اس وقت کی بثینہ بنا کے بٹھا دیا۔ اور مصعب اونٹ پر سوار ہو کے جس طرح بڑھیا نے بتایا تھا کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے نکل گئے۔ اور جب تک نظر کام دیتی تھی پھر پھر کے دیکھتے جاتے تھے۔

بہر تقدیر ان دو شعروں سے ام منظور کا کام تو راستے سے نکل گیا لیکن معشوقہ پری تمثال کے قبیلہ میں میاں جمیل جاتے کیونکر؟ ارمان جو تھا خون کا پیاسا تھا۔ اور یہاں تاب فراق نہ تھی آخر ایک دن چرواہے کا بھیس کر کے چلے ہی گئے۔ اتفاقاً اس دن بثینہ کے گھر میں چند مہمان ٹھیرے ہوئے تھے آپ بھی ان کی آڑ میں دبکے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بثینہ نے پوچھا "تم کون ہو؟" کہا "ایک محتاج غلام ہوں" غلام خیال کر کے اس نے ان کو اور مہمانوں سے الگ بٹھایا۔ پھر آگ روشن کی۔ اور وہ خود اور اس کی ایک لونڈی آگ میں گوشت بھون بھون کے سب کو کھلانے لگیں۔ اتنے میں آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "سرما زدہ شکستہ حال کے لیے کیا حکم ہو؟ وہ رات بھر آگ ہی تاپتا رہے یا اسے اوڑھنے کو کچھ ملے گا؟" سنتے ہی بثینہ چونک پڑی اور لونڈی سے کہا "یہ تو خدا کی قسم جمیل کی آواز ہے! جا کے دیکھ تو سہی" لونڈی نے آ کے دیکھا۔ اور واپس آ کے چپکے سے کہا "آپ سچ کہتی تھیں۔ جمیل ہی ہیں" اس جواب پر بثینہ نے بیتاب ہو کے ایک ایسی چیخ ماری کہ پاس پڑوس کے تمام آدمی دوڑ پڑے۔ مگر جب تک کوئی آئے آئے اس نے گھبرا کے اپنا دوپٹہ آگ میں ڈال دیا۔ اور جب لوگوں نے آ کے چیخنے کا سبب پوچھا تو بولی "اے کیا کروں میرا دوپٹہ جل گیا" اس کے بعد جب سب چلے گئے تو لونڈی بھیج کے جمیل کو اپنے پاس بلایا۔ بڑی گرمجوشی سے ملی۔ اپنی کہی اور اس کی سنی۔ اور تین دن تک اپنے پاس چھپائے رکھا۔

اس موقع پر بثینہ نے اپنے اعزا اور شوہر کی مرضی کے خلاف نہایت ہی جرأت کا کام کیا تھا۔ لیکن عشق اور اس سچی محبت کے تقاضے سے

جو اُسے جمیل کے ساتھ تھی وہ ہر طرح کے خطرون مین پڑنے اور اس سے بھی بڑھ کے جراتین کرنے کو تیار ہو جاتی تھی - چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہو کہ ایک اندھیری رات مین جبکہ بادل گرجتا تھا مینھ برس رہا تھا اور وہ بنی قدرہ کی کسی دعوت سے واپس آ رہی تھی - اس کی بہن ام الحسین اور کئی اور لڑکیان ساتھ تھین - چلتے چلتے کسی لڑکی پر ایک کنکری آ کے گری - وہ سہم سی گئی اور ڈر کے بولی یہ کنکری تو کسی جن نے ماری ہو - بثینہ سمجھ گئی کہ جمیل کے سوا اور کوئی نہین ہو سکتا - لڑکیون سے کہا "ہان یہ جنون ہی کا کام ہو - جلدی قدم اٹھاؤ - کہ بھاگ کے اپنے گھر ہو رہین - اور جاتے ہی پڑ کے سو رہین" سب لڑکیان بجاے اس کے کہ کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھ کے باتین کرین بھاگ بھاگ کے اپنے گھر چلی گئین - فقط ام الحسین اور وہ بڑھیا ام منظور جس کا ذکر آ چکا ہو رہ گئین - تو بثینہ خود جا کے جمیل کو اپنے خیمے مین بلا لائی - اور دونون ساتھ بیٹھ کے باتین کرنے لگے - ساری رات باتون مین کٹ گئی - مگر پچھلے کو نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ دونون ایک دوسرے کے پہلو مین پڑ کے غافل سو گئے - اور اسی حالت مین صبح ہو گئی پاس ہی خیمے مین اس کا شوہر تھا - اسلیے کہ ان دنون عربون مین رواج تھا کہ میان بی بی جدا جدا خیمون مین رہا کرتے - اس کے شوہر کا معمول تھا کہ روز صبح کو اپنے غلام کے ہاتھ اُس کے پینے کو ایک کٹورا دودھ خاص اپنے اہتمام سے بھیجا کرتا - اُسی معمول کے مطابق آج جو غلام آیا تو کیا دیکھتا ہو کہ بثینہ کے پہلو مین جمیل پڑا سو رہا ہو - فوراً واپس گیا کہ اپنے آقا کو خبر کر دے - اتفاقاً لیلیٰ نام قبیلہ کی ایک عورت نے جو بثینہ کی دوست تھی اُسے روک کے پوچھا "کہان جاتے ہو؟" اور غلام نے سارا حال بیان کر دیا - لیلیٰ کو بثینہ کے حال پر ترس آیا - غلام کو باتون مین لگایا اور چپکے سے اپنی لونڈی کو اشارہ کیا کہ بثینہ کو جا کے ہوشیار کر دے - اُس نے آ کے جگایا - اور ماجرا

بیدار ہو گیا تو بثینہ گھبرا کے اُٹھی جمیل کو جھنجھوڑ کے اُٹھایا اور کہا خدا کے لیے اپنی جان بچاؤ!“ جمیل نے کہا ”مین ڈرنے والون مین نہین ہون“ یہ کہہ کے تلوار کھینچ لی - اپنے بہادرانہ عشق کی مدح مین فخریہ دو شعر پڑھے اور مقابلہ کو تیار ہو گیا - یہ دیکھ کے بثینہ اور سہم گئی - اور خوشامد سے کہا ”یہ وقت نہ بہادری کا ہے اور نہ شاعری کا - تمھارے لیے نہین مین خود اپنی آبرو کے لیے ڈرتی ہون - اسی مین مصلحت ہے کہ چپکے سے تخت کے نیچے دبک رہو“ آخر معشوقۂ نازنین کے کہنے سے جمیل تخت کے نیچے گھس گیا - بثینہ اپنے بچھونے پر لیٹ کے سوتی بن گئی اور اس کے پہلو مین بجائے جمیل کے اُس کی بہن اُم الحسین آ کے لیٹ گئی - جب یہ کارروائی ہولی اور لونڈی نے واپس جا کے لیلیٰ کو اشارے سے بتایا کہ انتظام ہو گیا تب اُس نے اُس غلام کو رخصت کیا - غلام نے جاتے ہی اپنے آقا بثینہ کے شوہر کو خبر کی - وہ تلوار لے کے دوڑا کہ اس فتنہ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے - مگر یہان آ کے جب دونون ہم پہلو سونے والون کے منہ پر سے چادر ہٹائی تو کیا دیکھتا ہے کہ دونون بہنین آس پاس سو رہی ہین - نہایت ندامت کے ساتھ غلام کو گالیان دیتا ہوا واپس گیا اُدھر لیلیٰ اسی وقت بثینہ کے مان باپ کے پاس دوڑی گئی اور کہا ”خدا انھین غارت کرے! اپنی لڑکی کو یون بدنام کرتی ہو! اور یہ شریر کانا (بثینہ کے شوہر کی ایک آنکھ نہ تھی) خدا اس سے سمجھے ہر روز کوئی نئی بات اُٹھا کے کھڑی کر دیا کرتا ہے!“ وہ دونون داماد کو برا بھلا کہنے لگے اور ہر طرف سے اُس پر لعنت برسنے لگی - یہان میان جمیل دن بھر جیلہ کی معشوقۂ پری تمثال کے خیمے مین اُس سے پیار کی باتین کرتے رہے اور جب شام ہوئی تو رخصت ہوئے - اور آتے ہی اس واقعہ کو بھی موزون کر کے سارے عرب مین پھیلا دیا -

قبیلۂ بنی عذرہ کے جس بطن (شاخ) مین بثینہ تھی وہ ”بنی الاحب“ کہلاتا تھا - اب بنی احب کے ایک نوجوان عبید اللہ بن قطنہ نے جمیل کی

ہجو مین اشعار کہنا شروع کیے۔ مگر شاعری مین بھلا جمیل کا کوئی کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جواب مین ایسی مٹی خراب کی کہ اُس کے حواس جاتے رہے۔ اور چند روز کے رد و قدح کے بعد اس نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی جمیل کو نہ چھیڑونگا۔ جب وہ ہار چکا تو بنی احب کے ایک اور شخص عمیر بن رمل نے جمیل کی ہجو مین طبع آزمائی شروع کی۔ اور وہ بھی ہار کے ندامت سے خاموش ہوا۔ جمیل نے ان دونون کی ہجوون مین چونکہ سارے قبیلہ کے اوپر حملہ کیا تھا اور جن کی ہجو تھی وہ بثینہ کے عزیز تھے اسلیے انھین سن کے بثینہ بھی جمیل سے خفا ہوگئی۔ اُدھر بثینہ کے اعزہ سب طرف سے ہار کے اپنے علاقہ کے حاکم زکوۃ عامر بن ربعی کے پاس پہونچے اور فریاد کی کہ جمیل ہمارے مردون کی ہجو کرتا ہو۔ ہمارے گھرون مین چھپ چھپ کے آتا ہو۔ اور ہماری عورتون کے ساتھ عشق بازی کرتا ہو۔ عامر نے کہا "ایسا ہو تو تمھارے لیے اُس کا خون حلال ہو۔ جہان ملے بے تکلف مار ڈالو۔ اور کوئی مزاحم ہو تو مجھ سے آ کے کہنا" جمیل کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بنی احب کے علاقہ سے دُور دُور رہنے لگا۔

یہ زمانہ جمیل کے لیے بڑی بدنصیبی کا تھا۔ ایک طرف جان کا خوف تھا اور دوسری طرف بثینہ کی ناراضی کا صدمہ۔ اصل یہ ہو کہ عبیداللہ بن قطبہ اور عمیر بن رمل بثینہ کے عزیز تھے۔ جمیل نے اُن کی ہجو کہی تو اسے بُرا معلوم ہوا۔ اور کہنے لگی "میرے ساتھ عشق کا تو دعوی ہو مگر میرے عزیزون کی مذمت کرتے ہین" آخر فراق کی بیتابی۔ اور اپنے وفور محبت کو اس عنوان سے اشعار مین ظاہر کیا اور اس طرح دلجوئی کی کہ بثینہ کا دل صاف کیا۔ غیر جمیل نے اپنی شاعری کے جادو سے بثینہ کو تو مسخر کر لیا لیکن حاکم کے موافق بنانے کی کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔

آخر بے صبر دل کے ہاتھون سے مجبور ہو کے اِس خوف کے زمانے مین بھی ایک دن سب سے چھپ کے بثینہ سے ملا۔ باتین کین اور اس کے پاس بیٹھا ہی ہوا تھا کہ بنی احب سر پر آ پہونچے۔ ادھر

دست پکڑ لیا۔ مگر غنیمت یہ ہوا کہ بنی احب جمیل کے قبیلہ والون سے دبے
ہوئے تھے۔ کیونکہ بنی عذرہ کے جس گروہ مین جمیل تھا وہ بڑا زبردست
قبیلہ تھا۔ اسلئے بثینہ کے اعزہ ڈرے کہ اگر جمیل کے قبیلہ والے انتقام پر
اُٹھ کھڑے ہوئے تو لڑا کرین گے۔ ناچار خاموش ہو رہے اور اُسے نکل جانے
کا موقع دے دیا۔ مگر اُسی وقت والی ملک کے پاس دوڑے گئے اور
سارا ماجرا بیان کرکے اپنی عاجزی و بیچارگی ظاہر کی۔ اس نے حکم
جاری کر دیا کہ جہان ملے گرفتار کر لیا جائے۔ اس حکم کے بعد جمیل کو بھاگنے
راستہ نہ ملتا تھا۔ مجبوراً اپنے یار سے دست بردار ہو کے ملک یمن کی راہ
لی۔ اور وہان کی دشت نوردی مین خاک چھاننے لگا۔ یہان تک کہ وہ والی
بدل گیا۔ اور بثینہ کے قبیلہ والون یعنی بنی احب نے بھی علاقہ شام مین
جا کے پڑاؤ ڈالا۔ جمیل کو خبر ہوئی تو پھر آ پہونچا۔ اور پہلے کی طرح پھر
بثینہ سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔

اب پھر بثینہ کے اعزہ کا کوئی زور نہ چلتا تھا۔ آخر سب کے سب
جمیل کے باپ معمر کے پاس آئے جو اپنے قبیلہ کا دولتمند حاکم اور
صاحب اثر شخص تھا اور بڑی عاجزی سے کہا "خدا کے لئے اپنے بیٹے کو
روکئے۔ وہ ہماری لڑکی پر اظہار عشق کرتے اُس سے بار بار آکے ملتے۔
اشعار مین اُس کے حسن و جمال کا ذکر کرکے اُسے بدنام کرتے اور ہمین
ساری دنیا مین رسوا کرتے ہین" معمر نے وعدہ کیا کہ اچھا مین اُسے
سمجھا دون گا۔ پھر اس کے بعد جب جمیل سے ملا تو کہا "بیٹا۔ اس گمراہی
مین کب تک پڑے رہو گے؟ ایک شوہر والی عورت کے ساتھ علانیہ
اظہار عشق کرتے ہو جو ظاہر مین تم سے چکنی چپڑی باتین کر دیتی ہے
اور اصل مین اپنے شوہر کی جان نثار ہے۔ تمھین اس پر شرم نہین
آتی کہ جسے اپنی معشوقہ بتاتے ہو وہ روز غیر کا پہلو گرم کرتی ہے۔ تمہاری
ان حرکتون کو سُن سُن کے مین مارے غیرت کے مرا جاتا ہون۔ مگر تم پر
اثر نہین ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ مین نے تم سے زیادہ نالائق دیکھا ہے اور

نہ تم سے بڑھ کے کوئی بے وقوف ہوگا جو ایک ایسی عورت کے شوق میں عمر ضائع کرے جس کا ملنا غیر ممکن ہے - لہٰذا ان بیہودگیوں سے باز آؤ. میں نے اس بارہ میں خوب غور کر لیا ہے - اگر کوئی صورت امکان میں ہوتی تو تمھارے لیے اپنی ساری دولت خرچ کر کے میں اُس عورت کو لے آتا - اور تمھارے حوالے کرتا - خوب یاد رکھو کہ بثینہ جس کی ہونے والی تھی ہو چکی - تمھارے قبیلہ میں ایک سے ایک بڑھ کے خوبصورت لڑکیاں پڑی ہیں جس سے کہو شادی کر دوں مگر اُس کا خیال چھوڑ دو " جمیل نے کہا " آپ کی رائے نہایت صائب ہے - اور جو کچھ آپ فرما رہے ہیں بالکل بجا و درست ہے - لیکن یہ فرمائیے - آپ نے کبھی کسی شخص میں اتنی طاقت پائی ہو کہ اپنے عشق کو دل سے نکال ڈالے؟ اور معشوقہ سے دست بردار ہو کے دل کو تسلی دے سکے؟ خدا کی قسم اگر یہ بس کی بات ہوتی کہ اُس کی یاد کو دل سے بھلا دوں اور اُس کی صورت کو جو آنکھوں کے آگے قائم ہو گئی ہے سامنے سے ہٹا دوں تو میں ہرگز تامل نہ کرتا - مگر افسوس یہ امکان میں نہیں - دراصل یہ ایک آفت ہے جس میں پھنس گیا ہوں - اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی - جانتا ہوں کہ بثینہ کے اعزہ و اقارب اور حکومت دشمن ہے - مگر محبت سے باز نہیں آ سکتا - یہی نہ کہ اس شوق میں مار ڈالا جاؤں گا تو یہی میری تمنا ہے " اور پُرجوش اشعار میں دل کی حالت ظاہر کرنے لگا - اس وقت اُس نے اپنی بے بسی و بیقراری ایسے موثر الفاظ میں ادا کی تھی کہ باپ اور تمام سننے والے زار و قطار رونے لگے -

اب اُسے اپنی زندگی بہت دشوار نظر آنے لگی اور آمادہ ہوا کہ بھاگ کے ملک شام میں چلا جائے - چلتے وقت دل میں کہا "اب کوئے جانان سے جاتا تو ہی ہوں چلو چلتے وقت ایک رخصتی ملاقات تو کر لوں" یہ خیال آتے ہی ایک رات کو جبکہ قبیلہ والے غافل تھے بے تکلف بثینہ کے

خیمے میں چلا گیا۔ وہ صورت دیکھتے ہی سہم کے رہ گئی۔ اور کہا "خدا کی قسم تم اپنی بھی جان دو گے اور میری بھی جان لو گے! تم کو یہاں آتے ڈر نہ لگا؟" جواب دیا "اب تو شام کو جاتا ہوں۔ اور جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ آیا ہوں کہ تم سے رخصت ہو لوں" یہ سن کے اُس نے پاس بٹھا لیا۔ دیر تک عشق و محبت کی باتیں رہیں۔ پھر لپٹ لپٹ کے رخصت ہوا۔ اور کہا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں پھر تمھاری زیارت نہ ہو گی" یہ کہہ کے رو دیا محبوبہ کو بھی نڈھال کر کے رلایا۔ اور اپنے چند اشعار شوق و درد کے لہجے میں سنا کے چلا آیا۔

ایک مدت تک ارض شام میں سرگردان رہنے کے بعد پھر واپس آیا۔ اور بثینہ نے اُس کے آنے کی خبر سنی۔ اب بثینہ کی بیتابی و بیقراری بڑھی ہوئی تھی۔ قبیلہ کی چند لڑکیوں کی معرفت اُسے خود ہی پیام بھیج کے بلوایا۔ اور ایک محفوظ مقام میں اطمینان سے ملی۔ دونوں نے اپنے دلوں کی حالت ایک دوسرے پر ظاہر کی۔ اور شکایت ہجران کے دفتر کھولے۔ انھیں باتوں میں مصروف تھے کہ کیا دیکھتے ہیں بثینہ کے باپ اور بھائی سر پر تلواریں کھینچے کھڑے ہیں۔

یہ دیکھتے ہی جمیل بجلی کی طرح تڑپ کے الگ جا کھڑا ہوا۔ تلوار کھینچ لی اور شمشیر زنی کا ایسا کمال دکھایا کہ دونوں حریف مقابلے میں عاجز آ گئے اور ہمتیں ہار کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ باپ بھائی کے جانے کے بعد بثینہ نے گھبرا کے کہا "للہ اب تم خدا کے لیے واپس جاؤ۔ ذرا بھی ٹھہرے تو میں ایسی رسوا ہوں گی کہ کہیں کی نہ رہوں گی۔ اور ممکن ہے کہ سارا قبیلہ چڑھ آئے تو پھر کیا کرو گے؟" کہا "میں سب سے مقابلہ کروں گا۔ تم شوق سے جاؤ۔ مگر میں یہاں ٹھہرا رہوں گا۔ اُن کا جو جی چاہے کریں" لیکن بثینہ نے قسمیں دلا دلا کے چلے جانے پر مجبور کیا اس واقعہ کو بھی اس نے اپنے کلام میں موزوں کیا ہے۔

اب پھر جمیل بثینہ کے قبیلہ کے اس پاس مارا مارا پھرتا تھا۔ اور یہ

پہاڑوں میں بیٹھ بیٹھ کے مصیبت ہجران پر روتا تھا - اتفاقاً ایک دن
اپنے دو چچازاد بھائیوں روق اور مستعدہ سے ملاقات ہو گئی - اُن کو
پُر جوش اشعار میں اپنا دردِ دل سنایا - اور کہا "للہ کوئی ایسی صورت
نکالو کہ میں اپنی بثینہ سے مل سکوں" انھوں نے کہا "تمھارے معاملہ میں
کون دخل دے؟ اس وقت قبیلہ میں ایک سے ایک بڑھ کے حسین لڑکی
پڑی ہوئی ہے مگر تم بثینہ کے نام پر مٹے ہوئے ہو جو دوسرے کی جورو ہے
کامیابی بھی ہو تو یا تم بدکاری میں مبتلا ہو گے جسے ہم تمھاری شان کے
خلاف سمجھتے ہیں - اور یا ذلیل ہو گے جو بات ہمیں گوارا نہیں ہو سکتی
اگر تم اپنے نفس پر تھوڑا سا جبر کرو - اپنی خواہشوں کو روکو - اور
پرہیز کی کڑوی دوا ہمت کر کے گوارا کر لو تو ساری وحشت اور ہیجان دور ہو جائیں گی
یہ سن کے جمیل پھوٹ پھوٹ کے رو دیا اور کہا "بھائی اگر یہ میرے بس کی
بات ہوتی تو تمھارا کہنا ٹھیک تھا - لیکن کیا کروں دل ہی قابو میں نہیں
ہے - میں تو ایک بے بس ہی ہوں جو اپنے نفع کی کوئی بات نہیں کر سکتا میں
تمھارے پاس اس لیے آیا تھا کہ میری مدد کرو اور دردِ دل کا کوئی
علاج بتاؤ - اگر تم سے نہیں ہو سکتا تو نہ سہی مگر مجھے اور زیادہ پریشان
تو نہ کرو" یہ سن کے دونوں کو ترس آ گیا - اور کہا "خیر اگر تم جان دینے ہی
پر تلے ہوئے ہو تو ایک تدبیر ہو سکتی ہے - بنی اسد میں ہمارا ایک جانی
دوست ہے - اُس سے مدد مل جائے گی - بثینہ آج ہی رات کو قبیلہ کی
اور بہت سی لڑکیوں کے ساتھ ایک میدان میں کھیلنے کو جائے گی -
ہم تمھیں چھپ کے وہاں لے چلیں گے - اس سے ملنا - جب تک موقع ہو
باتیں کرنا - اور جب صبح ہوتے دیکھنا میرے ان دوست کے گھر میں
جا کے چھپ رہنا - اس طرح ایک زمانے تک تم وہاں قیام کر کے اس سے
ملتے رہنا" جمیل نے کہا "اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے" اور ان کے ساتھ
بھیس بدل کے راتوں رات بنی اسد میں جا پہونچے - [illegible] جمیل نے وہاں
پہونچ کے جب اپنے دوست سے یہ خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا "تم نے

ایک بڑی آفت مین پھنسا رہتے ہو۔ ذرا بھی کھل گیا تو سارا قبیلہ میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ انھون نے پھر اصرار کیا تو اس نے جبراً و قہراً منظور کر لیا۔ اور ساتھ ہی جمیل کو اپنے خیمے مین چھپا کے بٹھا لیا۔ اور رات ہی کو اپنی لونڈی کے ہاتھ اُس کی انگوٹھی بثینہ کے پاس بھیجی۔ بثینہ انگوٹھی پہچانتے ہی لونڈی کے ساتھ چلی آئی۔ بڑی گرمجوشی سے ملی۔ اور رات بھر دونون مین اظہار شوق کی باتین ہی ہوتی رہین۔ غرض مسلسل تین دن تک دونون یونہین راتون کو ملتے رہے۔ تیسرے دن جمیل نے بثینہ سے کہا ”اس نیک دل آدمی نے ترس کھا کے مجھے اپنے خیمے مین بٹھا لیا۔ اور مسلسل تین دن تک ہمین وصل کی لذت حاصل ہوتی رہی۔ اب اس پر زیادہ بار ڈالنا نہین اچھا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کو خبر ہو اور اس پر آفت آ جائے اسلیے مین اب رخصت ہوتا ہون“

جمیل اور بثینہ کے عشق مین ایک مرتبہ دو چار روز کے لیے جوش رقابت خلل انداز بھی ہوا تھا۔ اور ہوا یہ کہ بثینہ اپنے قبیلے کے کسی خوش رو لڑکے سے باتین کر رہی تھی کہ جمیل نے دیکھ لیا۔ اس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ اُس کے سامنے وہ بھی کسی اور جوان لڑکی سے ہنس ہنس کے باتین کرنے لگا۔ ان واقعات نے دونون دلون مین ذرا رکاوٹ پیدا کر دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہجر کی تکلیف دونون کو بیقرار و بیتاب کیے ہوئے تھی۔ ایک دن اسے دور سے دیکھ کے وہ آئی مگر پاس آ کے ٹھٹک کے آڑ مین الگ ہی کھڑی ہو رہی۔ جمیل کا دل ہاتھ سے نکل گیا۔ اور تین شعر پڑھے جن مین سے پہلے کا مضمون یہ تھا ”مجھے دھڑکا لگا تھا کہ ایسا نہ ہو موت مجھے فنا کر دے اور دل کی حسرتین دل ہی مین رہ جائین“ سنتے ہی بثینہ کا دل بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور دونون مین ملاپ ہو گیا۔ اس وقت جو شعر ہین آ کے بثینہ نے کہا ”جمیل اپنا یہ شعر مجھے اپنی زبان سے سناؤ۔

تطلق وصادو تستر ترنو ولطنها ۔۔۔ اذا امر من اترابھا من یرد قہا

دامن کا ہم سن چاہنے والا اُس کے پاس سے گزرا ہے اور وہ پردے کی آڑ مین کھڑی ہو کے اُسے کن انکھیون سے دیکھ رہی ہے کہ جمیل نے اس شعر کو پڑھا بثینہ سُن کے رونے لگی۔ پھر بولی "جمیل ایسا کبھی نہین ہوا۔ اور نہین بتاؤ کہ تم سے بڑھ کے میرا چاہنے والا کون ہوگا!"

اب جمیل ملک شام مین تھا اور اپنے قبیلۂ بنی عذرہ کے سردار کا مہمان تھا۔ اُس کی سات بیٹیان تھین اور ساتون حسین و گل اندام تھین۔ اُس نے چاہا کہ اپنی کسی بیٹی کا اُس کے ساتھ عقد کر دے۔ ان لڑکیون کو سمجھا دیا کہ بناؤ سنگھار کیے رہا کرو۔ اور جب موقع ہے جمیل کو اپنی صورت دکھا دیا کرو۔ عاشق مزاج نوجوان ہے اور اس کے ساتھ شریف شاید فریفتہ ہو کے کسی کے لیے پیام دے دے۔ لڑکیون نے یہ معمول کر لیا کہ جب اُسے تنہا پاتین پردہ اُٹھا کے اپنی جھلک دکھا دیا کرتین۔ جب جمیل کو معلوم ہوا کہ جان بوجھ کے یہ حرکت کرتی ہین تو اُن کی تحقیر اور بثینہ کی تعریف مین چند شعر کہے اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ملک مصر کی وادی بنی اسب کا پڑاؤ راستہ ہی مین تھا۔ اُن کے قریب پہاڑیون مین ٹھہر گیا اور ارادہ کیا کہ بثینہ کا ایک جلوہ دیکھ لے تو قدم آگے اُٹھائے معشوق شیرین ادا کی ہمکناری کے شوق مین بیتاب تھا کہ ایک دن اتفاقاً بثینہ کے قبیلہ کے مرد کہین باہر چلے گئے۔ بثینہ کا خیمہ سرراہ اس سڑک کے کنارے تھا جو شام سے مصر کو گئی تھی۔ کئی دن سے بارش تھی۔ اب پانی بھی ذرا کھلا تھا کہ بثینہ کیا دیکھتی ہے ایک شکستہ حال بھوکا بدوی خیمے مین آکے پناہ گزین ہوا ہے۔ بثینہ کے پاس ایک بڑھیا تھی جو صورت دیکھتے ہی چونک کے بولی "جمیل!" جواب ملا "ہان مین جمیل ہون"۔ اُس نے پنیر اور مسکہ کھلایا۔ پانی پلایا۔ اور جب اُس کے حواس درست ہوئے تو کیفیت پوچھی بولا "تین دن سے سامنے کی پہاڑیون مین چھپا ہوا تھا۔ اور منتظر تھا کہ مرد جالین اور پانی کھلے تو بثینہ سے آکے ملون اور اُس کا ایک

بصرہ دیکھ لون - اس لیے کہ اب مین مصر کی طرف جاتا ہون - پھر دیکھیے زندگی
مین آنا نصیب ہوتا ہے یا نہین - یہ سُن کے بثینہ اس سے بڑی سچائی اور لطف
کے ساتھ ملی - تھوڑی دیر تک دونون نے مزے مزے کی باتین کہین -
اور جمیل اس سے رخصت ہو کے مصر چلا گیا -

مصر کا حاکم و والی اُن دنون عبد العزیز بن مروان تھا - اس نے
جمیل کی بڑی قدر کی - ایک اعلیٰ درجہ کے مکان مین ٹھہرایا - ہر طرح
کی خاطر مدارات کی - اور بثینہ سے ملانے کا مضبوط وعدہ کیا - مگر افسوس
عمر نے وفا نہ کی - وہان چند ہی روز کے قیام مین بیمار پڑ گیا -
اور مرض مہلک ثابت ہوا - اتفاقاً سہل ساعدی اور ایک اور شخص
اُس کی عیادت کو آئے - اسلیے کہ جمیل اُس وقت کا بے مثل و
بے نظیر شاعر تھا اور لوگ اس کی صورت دیکھنے کے مشتاق رہتے
تھے - سہل بڑے فقیہ اور مقتداے ملت تھے اُن کو دیکھ کے جمیل نے
پوچھا بھلا ایسے شخص کی نسبت آپ کیا فرماتے ہین جس نے زندگی بھر
کبھی زنا کیا ہو - نہ شراب پی ہو - نہ کسی کی جان لی ہو - اور پچاس
سال سے اس بات کی شہادت دیتا رہا ہو کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ؟ سہل
نے کہا مین سمجھتا ہون کہ اُس کی نجات ہو گی - مگر ان خوبیون کا کون آدمی ہے؟
بولا "یہ خاکسار" سہل سُن کے حیران رہ گئے - اور حیرت کے ساتھ پوچھا بڑے
تعجب کی بات ہے کہ قریب قریب تمھاری ساری زندگی تو بثینہ پر اظہار عشق کرتے
گذری ہے اور اپنے آپ کو ایسا پاکباز و متقی بتاتے ہو!" جواب دیا "آپ جانتے
ہین کہ مین اب چند ہی روز کا مہمان ہون - لیکن مرتے وقت بھی دعوے کے ساتھ
کہتا ہون کہ مجھے محمد رسول اللہ صلعم کی شفاعت نہ نصیب ہو اگر کبھی مین نے
بُری نیت سے بثینہ کے پنڈے مین ہاتھ بھی لگایا ہو - وصال مین اکثر میرا
یہ کام ہوا کرتا کہ اُس کا نازک ہاتھ لے کے اپنے مضطر دل پر رکھ لیا کرتا
جس سے ذرا تھوڑی دیر کے لیے تسکین ہو جاتی اور اس کے بعد پھر وہی
بیقراری پیدا ہو جاتی -

شاید اس کے چند ہی روز بعد کا واقعہ ہی کہ بنی احب کے خیمون کے پاس ایک دن ایک شتر سوار آیا۔ اونٹنی سے اُتر کے ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور ایک پر سوز نوحے کی دھن مین تین شعر گا گا کے سُنائے۔ جن کا آخری شعر یہ تھا۔

قومی بثینۃ فاندبی بعویل ۔ وابکی خلیلک دون کل خلیل

(بثینہ اُٹھ۔ اور چلا چلا کر بین کر ۔ اور اپنے اُس محبوب پر رو جو سب دوستون سے بڑھ کے دوست تھا)

یہ اشعار نہ تھے جادو تھے کہ سُنتے ہی سارے قبیلے کی عورتین خیمون سے نکل پڑین۔ اور سراسیمہ و مضطر اس تازہ وارد شخص کی طرف دوڑین۔ آگے آگے ایک غزال رعنا اور حور وش ماہ سیما تھی جو نہایت بدحواس اور مضطرب الحال نظر آتی تھی۔ اپنے کرتے کے دامن مین اُلجھتی اور ٹھوکرین کھاتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "اے شخص اگر تو سچا ہی تو تو نے مجھے مار ڈالا۔ اور اگر جھوٹا ہے تو رسوا کر دیا۔ خدا کے لیے بتا ماجرا کیا ہی؟" اس نے کہا "مین جھوٹا نہین سچا ہون۔ جمیل عذری نے ارض مصر مین انتقال کیا۔ وہان مجھ سے اُن سے راہ و رسم پیدا ہو گیا تھا۔ ان دنون جب وہ سخت بیمار ہوئے اور یقین آ گیا کہ یہی مرض مرض موت ہے تو ایک دن تنہائی مین اُنھون نے مجھ سے کہا کہ "ایک بات کا اقرار کرو۔ جب مین مر جاؤن تو میرے پاس جو کچھ ہو تم لے لو اور مجھے دفن کر دو۔ پھر اس کے بعد میری اونٹنی پر سوار ہو کے قبائل بنی عذرہ مین سے قبیلۂ بنی احب مین جاؤ۔ وہان پہونچ کے میری قبا جو پہنے ہو اس کا گریبان چاک کر ڈالو۔ اور کسی بلندی پر کھڑے ہو کے میرے یہ اشعار بہ آواز بلند اہل قبیلہ کو سُنا دو۔ چنانچہ دیکھ لو یہ اُنھین کی قبا مین پہنے ہوئے ہون جس کا گریبان چاک ہی"۔

یہ حالت سُننے کے بعد پھر بثینہ کو کہان قرار تھا؟ زور زور شور سے رونے پیٹنے اور بین کرنے لگی۔ اور قبیلہ کی ساری عورتین ماتم مین اُس کے ساتھ شریک تھین۔ روتے روتے غش کھا کے گر پڑی۔ پھر دیر کے بعد اُٹھی اور جمیل کے مرثیے مین اپنے اشعار پڑھنا شروع کیے۔ جو برابر تین شبانہ روز تک زبان پر جاری تھے۔ یہانتک کہ تیسرے دن اسی

تم ہوئی وہ بھی دنیا سے چل بسی۔ اور سنہ ۸۲ھ میں دونون عاشق و معشوق کی
زندگی کے ساتھ اُن کی داستان عشق بھی ختم ہوگئی۔

اہل ادب میں ایک ایسا واقعہ مشہور ہے جو بثینہ کے اس وقت مرجانے
کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ بثینہ جب بڑھیا ہوگئی تو ایک دن عبدالملک بن مروان
نے بلوا لیے اس کو اور جمیل کے عشق کے حالات اس کی زبان سے سُنے۔
اور صورت دیکھ کے کہا کہ بثینہ۔ تم میں کوئی خوبی نہین نظر آتی۔ آخر تم مین کیا بات
تھی جو جمیل تم پر عاشق ہوگیا؟ بثینہ نے برجستہ جواب دیا ”اور آپ مین کیا بات
تھی جو لوگون نے آپ کو خلیفہ بنا لیا؟“ اس جواب پر عبدالملک مارے ہنسی
کے لوٹ گیا۔ اور انعام واکرام کے ساتھ بثینہ کو رخصت کیا۔

اس قصہ کو کسی شخص نے بنا لیا ہے۔ اور اگر صحیح ہے تو بثینہ کا نہین کسی اور
عورت کا ہے۔ اس لیے کہ اہل سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ جمیل کی خبر مرگ
سننے کے بعد بثینہ تین دن سے زیادہ نہین جی۔ علاوہ برین واقعات
مندرجہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ بثینہ جوان مری ہے جبکہ اس کے حسن وجمال
مین کسی قسم کا فرق نہین آنے پایا تھا۔ اور عبدالملک بن مروان سنہ ۸۶ھ مین
یعنی جمیل کی وفات کے چار ہی برس بعد دنیا سے رخصت ہوگیا اس لیے یہ
غیر ممکن ہے کہ چار ہی سال کے اندر بثینہ جوان سے بڑھیا اور ایک گل اندام
حسینہ سے کریہ منظر ضعیفہ ہوگئی ہو۔

عالمگیر قتال مغرب

دنیا والون کی آج تک ہمیشہ کٹتے مرتے ہی گزری ہے۔ یہ سب جانتے ہین
کہ امن وامان سے بہتر کوئی نعمت نہین۔ تہذیب اور علمی ترقی ہمیشہ یہی تعلیم
دیتی ہے کہ صلح جوئی سے بہتر کوئی اخلاقی خوبی نہین ہے۔ انسان کا نام انسان
اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس مین اُنس اور میل جول کے جذبات ہین۔ اور

وحشی درندون کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا رہنا اُس کا کام نہین لیکن حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہر کہ یہی انسان جس نے اپنا نام انسان رکھا ہو اُس سے بھی لڑے بھڑے نہین رہا جاتا۔ تعلیم۔ تہذیب۔ مذہب۔ اخلاق سب خاموشی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے ہین مگر اس کی یہ حالت ہو کہ علم و فضل اور تہذیب و معاشرت مین جس قدر ترقی کرتا جاتا ہو اسی قدر زیادہ لڑاکا اور خونخوار ہوتا جاتا ہو۔

موجودہ دور تہذیب سب سے زیادہ مدعی امن ہو۔ کہا جاتا ہو کہ آج کل کی شائستگی نے خونریزی موقوف کر دی۔ اور جہان کہین اس جدید تہذیب کا اثر پڑا ہو وہان قتل و خون کا بازار سرد پڑ گیا ہو اور لوگ نہایت ہی امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے ہین۔ اگلی خونریزیون کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہو کہ صرف اپنے عقاید کے تسلیم کرانے اور اپنے گروہ کی بات بالا کرنے کے لیے وہ ملکون مین شمشیر قتال بلند کرایا کرتا تھا۔ اور موجودہ تہذیب نے چونکہ مذاہب کا اثر کمزور کر دیا ہو اس لیے لوگون مین خونریزی موقوف ہو گئی اور دنیا کو پنپنے کا موقع ملا ہو۔

لیکن تجربہ نے آخر کار ان دعوون کو بھی توڑ دیا۔ اور ہم دیکھ رہے ہین کہ ان حاملان لوائے تہذیب اور برہم کنان صفوف ادیان کے ہاتھون سے ایسی خونریزی ہو رہی ہو جیسی کہ آج تک دنیا مین کبھی نہین ہوئی تھی۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ علم و فضل اور تہذیب و تمدن مین جرمن اور فرانس کا ترجہ آج کل دنیا کی تمام قومون سے بڑھا ہوا ہو۔ اور ان کے بعد سب سے اعلی درجہ انگلستان اور امریکا کا خیال کیا جاتا ہو جن کی نسبت یہ رای قائم کی گئی ہو کہ تحصیل زر کو علمی ترقی کے شوق پر ترجیح دیتے ہین۔ لیکن انھین تین اکثر کے ہاتھون سے آج کل دنیا پر ایسے ظلم ہو رہے ہین اور نوع انسان اس بے رحمی سے قتل ہو رہی ہو کہ اس کی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہو۔ اور کبھی مذاہب کے ہاتھون سے ایسا قتل عام نہ ہوا تھا۔ دولت برطانیہ نے بہت الگ رہنا چاہا۔ مگر نہ بن پڑی اور مجبوراً اُسے بھی اپنے ہاتھ خون مین رنگنا پڑے۔

تاریخ عالم کے آغاز مین ہمین مشرق مین مہا بھارت اور رامائن کی لڑائیان اور مغرب مین ٹراے کی معرکہ آرائیان نظر آتی ہین - اول الذکر دونون لڑائیون کے مرد میدان ہندو اور تیسری جنگ کے سورما یونانی تھے - دونون کے شعرا اپنی ان لڑائیون کو دنیا بھر کی لڑائیون سے بڑا بتاتے ہین لیکن سچ پوچھیے تو تینون میدان قومی اولوالعزمی اور مقامی سپہ گری کے اعلی ترین دنگل ضرور تھے - مگر ان کے حالات کے بیان کرنے مین شعراے قوم نے بہت ہی مبالغہ کیا ہو کیونکہ اُس عہد کی قلت آبادی کے لحاظ سے نہ اُن مین جانبازون کی اتنی کثرت ہوسکتی تھی اور نہ موجودہ ذرائع سفر کے مفقود ہونے کی وجہ سے اُن کی خونریزی کا میدان اتنا وسیع ہوسکتا تھا -

اُس کے بعد ہزارون سال تک اسی قسم کی حملہ آوریون اور خونریزیون کا میدان گرم رہا - اسیریا و بابل والون کا ارض یہودا پر آنا اور ساری نسل اسرائیل کو تباہ کر دینا - زرکسیز کا (جیسے بعض محققین تخمینہ کرتے ہین) بیس لاکھ سپاہیون کے ساتھ یونان پر چڑھائی کرنا اور بحری لڑائی مین بالکل تباہ ہو جانا - رومیون کا قرطاجنہ والون سے لڑنا اور انھین تباہ کرنا - گوتھ اور ہن کی سی وحشی قومون کے سیلاب کا مملکت روم مین آنا اور رومی تمدن و تہذیب کا غارت ہونا صحرا نشینان عرب کے عالمگیر لشکرون کا عرب سے نکلنا اور مشرق سے مغرب تک ساری متمدن دنیا کو زیر و زبر کر دینا - صلیبی مجاہدون کے ٹڈی دل کا کوہستان آلپس سے نکل کے بنی اسرائیل کی موعود زمین پر گرنا اور صدیون تک خالص دینی مقاصد پر نوع انسان کی قربانی ہوتی رہنا - اور سب کے آخر مین قراقرم کی گھاٹیون اور دشت قپچاق کے صحرا سے تاتاری درندون کے طوفان کا اٹھنا اور عربی تہذیب کے ساتھ لاکھ آدمیون کا عدم آباد مین اڑا لے جانا -

یہ سب ہوا - اور اس مین خدا کی کروڑون مخلوق تلوار کے گھاٹ اتری مگر وہ وحشی تھے - جاہل تھے - غیر مہذب تھے - اور تمدن سے مس نہ رکھتے تھے - لیکن مہذب دنیا مین تعلیم و تہذیب کے اعلی ترین کمال پر پہونچنے کے بعد بھی

خون کا سیلاب بہے - اور انسان کی سی بے نظیر امانت خاک مین ملائی جائے تو پھر ہمین یہی کہتے بنتا ہے کہ یہ مثل "لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا" جانورون ہی تک محدود نہین بلکہ انسان کو ہزار لکھایے پڑھایئے لاکھ مہذب و شائستہ بنایئے اصل مین وہ ایک خونخوار درندہ ہی ہے صلح کی برکتون کا یقین رکھنے اور امن وامان کے فائدون سے واقف ہونے پر بھی ادنی سی چھیڑ پر لڑ ہی پڑتا ہے -

اگلی غیر مہذب لڑائیون کے بعد اب ہم مہذب لڑائیون کا ذکر کرتے ہین ان کا آغاز نپولین بونا پارٹ کی اولوالعزمی سے ہوا جس نے سارے یورپ اور مصر و شام مین ہل چل ڈال دی اور اپنی ملک گیری کی ہوس پہ لاکھون آدمیون کی قربانی چڑھائی - اُس کے بعد اسی تہذیب کا تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ کو جس سے یون پیش پانا دشوار تھا رفتہ رفتہ کمزور کیا جاے - پہلے نورینو کی بحری لڑائی مین زبردست دول یورپ نے مل کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ و غرق کر دیا - اور ہزارون آدمی بحر فنا مین غرق ہوئے پھر کریمیا کی لڑائی ہوئی جس مین مہذب دول یورپ کا مقصد یہ تھا کہ روسی اثر جنوب مین بڑھنے نہ پائے - اور ترکون کو کسی قسم کا فائدہ نہ ہو - لکھو کھا خلقت اس لڑائی مین بھی ضائع ہوئی - اس کے بعد فرانس و جرمن کی پہلی لڑائی ہوئی جس مین لاکھون بندگان خدا جرمنی کے شوق ملک گیری پر بھینٹ چڑھے - بعد ازان روسیون اور ترکون کی لڑائی ہوئی جس کے لیے ایک زمانے سے اُن کے صوبون مین فساد کرایا جاتا تھا - اُن کے وزرا کو رشوتین دی جاتی تھین - اُن کی رعایا مین شورش پیدا کرائی جاتی تھی - آخر لڑائی چھڑ گئی - اور تہذیب و بدتہذیبی دونون طریقون سے لاکھون آدمی دونون حریفون کی فوجون اور رزمگاہ کی رعایا مین سے قتل ہوئے - ترکون نے آخر کئی صوبے آزاد کرکے جان چھڑائی اور امن وامان قائم کرنے کی فکر کرنے لگے - مگر زبردست فتنہ پردازون کی سازشون کے سامنے ایک کمزور صلح جو کا کیا زور چل سکتا تھا - کبھی چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا - مہذب دنیا کا یہ عام مشغلہ تھا کہ جب اور کوئی فکر نہ ہوتی

تو جزیرہ نماے بلقان اور قلمرو عثمانیہ کے پالٹکس مین مفسدانہ دخل دہی شروع
ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ جاپان (جس نے مغربی عقابون کی نظر سے بچ بچ
کے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور مہذبان مغرب ہی کا سا مہذب بن گیا تھا)
سر اٹھایا اور خم ٹھوک کے روس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بحری و بری دونون
لڑائیان ہوئین۔ اور لکھو کھا آدمی دونون کے اغراض حکمرانی پہ قربان ہوئے
آخر بڑی مصیبت سے روس نے جان بچائی۔ اب چند روز بعد تہذیب کا تقاضا
ہوا کہ اسلامی سلطنتون کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایران سے مراکش تک ہر جگہ
لڑائی چھڑ گئی۔ روس نے ایران کی پھڑپھڑانے والی بے بس رعایا کو دبا لیا
اٹلی نے بے پوچھے گچھے اور بے وجہ موجہ طرابلس کے ساحلی شہرون پر قبضہ کر لیا
فرانس نے بڑھ کے مراکو کا گلا دبا لیا۔ پھر جب اقتضاے تہذیب کے صلح پسندون نے دیکھا
کہ اٹلی کا طرابلس پر کوئی زور نہین چلتا۔ ہمت ہارے دیتا ہے۔ اور اُس کے
سوا اس کا چارہ نہین۔ تو سب طرف سے تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ طرابلس سے دست
بردار ہو کے صلح کر لے۔ اور کچھ ایسی ریشہ دوانیان چالاکیان اور سازشین
کی گئین کہ عثمانی وزارت نے اس کو قبول بھی کر لیا۔

ادھر مہذب احباب یورپ کی صلاح سے اس صلح نامہ پر دستخط ہوے
اور اُدھر انھین کرم فرماؤن کی عنایت سے تمام ریاستہاے بلقان نے دولت عثمانیہ
کے مقابلہ مین اشتہار جنگ دے دیا۔ اور سارے جزیرہ نماے بلقان مین خون کی
ندیان بہنے لگین۔ دولت عثمانیہ ان سب کے مقابلہ مین کمزور نہ تھی مگر حسن تدبیر سے
وہ کمزور کر دی گئی۔ جان باز سپاہیون کو پیٹ کی روٹی اور سامان جنگ دونون
سے محروم رکھ کے پٹوایا گیا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سوا تھوڑے سے مشرقی
علاقۂ یورپ کے جو قسطنطنیہ کے حوالی مین ہے تمام مقبوضات یورپ دولت
عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے۔ اور جن علاقون پر نصرانی ریاست ہاے بلقان کا
قبضہ ہوا تھا اُن مین مسلمان رعایا پر ایسے مظالم ہونے لگے کہ سننے سے روئین
کھڑے ہو جاتے ہین۔ غرض لاکھون خلقت امن کے زمانے مین بھی تہذیب
یورپ کی نذر ہوئی۔

لیکن جو دولت ترکان آل عثمان سے چھینی گئی تھی اُس کا ہضم ہونا آسان نہ تھا۔ غیر منقولہ مال غنیمت کی تقسیم میں دشواریاں پیش آئیں اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ جرمنی کی ایسی صاحب علم و فضل قوم نے جو موجودہ ترقیون کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کی جاتی تھی، روس کے مقابل اشتہار جنگ دیا۔ اور فرانس پر صرف اس لیے کہ وہ سلطنت روسیون کی دوست ہے فوج بڑھائی۔ بلجیم کی غیر جانبداری کے قائم رکھنے کا جو پرانا عہدنامہ تھا اُس کے ساتھ خود بلجیم کو بھی پامال کر ڈالا۔ جس کی وجہ سے انگلستان کی ایسی صاحب علم اور صلح جو سلطنت کو بھی اس کے خلاف اشتہار جنگ دے دینا پڑا۔ اور ایک ایسی لڑائی چھڑ گئی جو دنیا کی تمام گذشتہ لڑائیون سے زیادہ خوفناک ہونے کے ساتھ ساری دنیا مین پھیلی ہوئی ہے۔ یورپ مین چار طرف شمال و مشرق مین روس و جرمن کی سرحد پر وسط یورپ مین روس و آسٹریا کی سرحد پر شمالی بلقان مین سرویا و آسٹریا کی سرحد پر اور مغربی یورپ مین بلجیم اور فرانس مین کئی ہزار میل کی مسافت تک خون کا مینھ برس رہا ہے۔ ایشیا اور انتہائے مشرق مین سواحل چین پر۔ افریقہ مین زنجبار سے لے کے شمالی و مغربی سواحل افریقہ تک۔ اوشینیا یعنی جزائرستان مین آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے پاس کے جزائر مین خونریزی ہو رہی ہے۔ اور سمندر جو اگلے دنون آزاد رہا کرتا تھا آج کل عموماً خطرناک ہے۔ اور بحیرۂ بالٹک اور نارتھ سی کے سواحل سے شروع ہوا اُس سے اٹلانٹک اوشن پیسفک اوشن آرکٹک اوشن اور انڈین اوشن تک خطرے سے خالی نہین ہین۔

بلقان کے مظلوم مسلمان سعدی کا یہ شعر پڑھ رہے ہین۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را | چندان امان نداد کہ شب را سحر کند

اور ہمین مہذب قومون کا یہ رنگ دیکھ کے یہی ماننا پڑتا ہے کہ تہذیب و شائستگی سوا اس کے کہ انسان کو لڑائی کے لیے زیادہ تیار کرے۔ اور اس کی خونریزی کی قوت و ہوس کو اور بڑھا دے اور کچھ نہین کرتی ''

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولنا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریکہ آرای سریر شہریاری ہوئے محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولی عہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی ہو۔ چنانچہ انھین علما و فضلا کی صحبت مین رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجاے اس کے کہ تعلیم مین کوئی نمایان ترقی کرین اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے عنان حکومت ہاتھ مین آنے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور اُن کے ساتھ ساری رعایا جناب قبلہ و کعبہ کی حلقہ بگوش ارادت بن جاے۔ لیکن ظاہر ہے کہ علماے دین و مقتدایان ملت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہین ہو سکتا۔ وہ نہ مدبر سلطنت ہو سکتے ہین نہ ایسے نہین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی یہ تھی کہ مومنون کی خدمت گزاری کی جاے۔ اور سلطنت کا روپیہ مومنین کی اعانت و دستگیری مین صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور فقاہا پرہیزگار فرمان روا سے اودھ امجد علی شاہ کی نظر مین اُسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا تھا جب خود جناب مجتہد العصر کے مبارک ہاتھون سے انجام پاے چنانچہ ملک کی آمدنی میز سے لاکھون روپیہ زکوۃ کے نام سے اُن کی نذر کیا جاتا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمین انھین کے ہاتھ مین جاتین۔ امجد علی شاہ کے لیے تقوی طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھین

اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق مملکت کی طرف توجہ کرین - جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم و برہم ہو گئے - اور یہ حالت ہو گئی جو (قاضی محمد صادق خان اختر کے بیان کے مطابق یہ تھی) کہ تمام عمال بدکار بد باطن اور خود غرض تھے - رعایا تباہ تھی - زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی - خزانہ خالی تھا - رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی - اور جو فتنے پیدا ہوتے کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے -

لیکن اس اتقا کی خاموشی اور تمدنی غفلت و بے پروائی پر بھی انھون نے محلۂ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ مین تمام محلون سے زیادہ صاف ستھرا خوب آباد نہایت خوبصورت - دولتمند تاجرون کا اعلیٰ ترین بازار ہے اور سول لائن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے - انھون نے لکھنؤ سے کانپور تک براہ راست ایک پختہ سڑک بنوائی - اُن کے عہد مین سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پُل کی عمارت بن کے تیار ہو گئی - اس پُل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اس کے اجزا و پرزے غازی الدین حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے - مگر وہ پُرزے جب تک لکھنؤ مین پہونچین بادشاہ رہگرائے عالم جاودان ہو چکے تھے - نصیر الدین حیدر کے عہد مین جب وہ پُرزے ولایت سے آئے تو انھون نے اپنے دربار کے انجینیر مسٹر سنکلیر کو اُن پُرزون کے جوڑنے اور پُل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکہ دیا - اور حکم دیا کہ وہ پرزے رزیڈنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائین جس مقام پر پُل کے یہ آہنی پُرزے ڈالے گئے تھے اُس جگہ کا پتہ دینے کے لیے آج وہین ایک گھاٹ اور شوالہ قائم ہے - مسٹر سنکلیر نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے لیے گہرے کنوین کھدوائے - اور ستونون کی بڑائی بھی کرائی مگر اسکے بعد اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پُل کی تکمیل مین ناکامی ہوئی محمد علی شاہ کے زمانے مین یہ کام ناتمام پڑا رہا - مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد مین اس کی جانب توجہ کی اور پُل بن کے تیار ہو گیا - لیکن جو لوہے کا پل آج کل قائم ہے وہ امجد علی شاہ کے زمانے کا پل نہین ہے - وہ ایک ہینگنگ برج یعنی لٹکنے والا پل تھا

جس کا سارا بار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبون پر لٹک رہا تھا - انگریزی زمانے مین جب اُس کے پُرزے زنگ آلود ہوئے کمزور ہوے اور اُس پر عام آمد و رفت مین خطرہ نظر آیا تو اُسے منہدم کرا کے اُس کی جگہ دوسرا آہنی پُل قائم کیا گیا اور وہی پُل اس وقت موجود ہو -

امجد علی شاہ ہی کے زمانے مین اُن کے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد کیا - جس کی آبادی اور رونق آج کل روز افزون ترقی کر رہی ہو - امجد علی شاہ نے اپنے زمانے مین اگرچہ کچھ نہین کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت بنوائی جو آج کل اُن کی یادگار ہو - مگر شاید اپنے اتقا و پرہیزگاری کے صلے مین انھین یہ قدرتی ناموری حاصل ہو گئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے دو سب سے زیادہ مشہور سب سے زیادہ آباد سب سے زیادہ بارونق - اور سب سے زیادہ دولتمند محلہ امین آباد اور حضرت گنج اُنھین کے عہد کی یادگار ہین -

آخر زمانے نے اُن کے دور کا ورق بھی اُلٹا - اور ۱۲۶۳ھ ہجری (۱۸۴۷ء) مین جبکہ عمر اڑتالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی مرض سرطان مین مبتلا ہو کے دنیا سے رخصت ہو گئے - اور اپنے آباد کیے ہوئے محلہ حضرت گنج مین میڈو خان رسالدار کی چھاؤنی کے اندر دفن ہوئے - اُن کا امام باڑہ جس مین وہ مدفون ہین حضرت گنج کے مغربی حصہ مین لب سڑک موجود ہو جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی - یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہو - اور اگر حسین آباد کی طرح اُس مین بھی روشنی ہوتی تو محرم مین لکھنؤ کا شرقی حصہ بھی عالم نور بن جایا کرتا - اگرچہ اُس کے لیے کوئی وثیقہ نہین معین ہو لیکن اُس کی آمدنی بھی کم نہین - احاطے کی عمارت کے بیرونی رخ کی دکانون مین بہت سے اچھے اچھے تاجرون کی دکانین ہین - اور اندرونی عمارتون مین بہت سے یوریشین وغیرہ رہتے ہین جن سے کرایے کی معتد بہ رقم وصول ہوتی ہو - مگر کرایہ وصول کرنے والون کا یہ بھی احسان ہو جو محرم مین خاص قبر اور امام باڑے مین چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہین

اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جاہ افروز ہوے

اُن کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیہ پاستان کا
آخری بند ہو۔ چونکہ انتزاع سلطنت انھیں کے عہد میں ہوا اس لیے تمام
اہل الرائے کے ہدف سہام اور نشانہ ملامت وہی بن گئے۔ اور قریب قریب
تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں اُن کی
سلطنت کا خاتمہ ہوا ہو اُن دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی
تھیں۔ اور بری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں
سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُٹھا جو بہادر زبردست اور
ہوشیار مانے جاتے ہیں؟ دہلی میں مغل شہنشاہی کا اور بنگالے میں نواب
ناظم بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا حالانکہ ان میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ
لکھنؤ کے اریکہ آرائے سلطنت میں بتائی جاتی ہو۔ مذکورہ چاروں درباروں میں
کوئی واجد علی شاہ نہ تھا حالانکہ اُن کی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔

اصل یہ ہو کہ اس عہد میں اِدھر اہل ہند کی غفلت وجہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب
پہونچ گیا تھا اور اُدھر دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی۔ قابلیت
جفاکشی اپنی کوششوں اور اپنی اعلیٰ تہذیب وشائستگی کا ثمرہ پانے کی روز
بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانایان فرنگ کی ذہانت وطباعی
خوش تدبیری وباضابطگی ہندوستان کی جہالت وخود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانہ
نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ اور پکار پکار کے ہر ایک
قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دے گا مٹ جائے گا۔
زمانے کے اس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی۔ اور سب
مٹ گئے۔ انھیں مٹنے والوں میں ایک اودھ کی سلطنت بھی تھی۔ جس کے زوال
کا بار غریب واجد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہو۔

پابند شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت میں رکھ کے اپنا سا بنانا
چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی جو اقتضائے عمر کے ساتھ
زیادہ کھلتا گیا۔ مگر امجد علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ وارث سلطنت فرزند کا
فطری رجحان عیاشی اور فنون طرب ونشاط کی طرف تھا اگرچہ باپ کی تاکید سے لکھنے

پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔ ولیعہدی ہی مین اپنے ذاتی شوق سے انھون نے باپ کے منشے کے خلاف گویون اور طائفون کو اپنی صحبت مین رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتون اور ڈومنیون سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اور اتنا صرف ہوا کہ جو لطف انھین حسین عورتون اور گویون کی صحبت مین آتا علمی مذاق کی مہذب صحبتون مین نہ آتا۔

باپ کے خلاف انھین عمارت کا بھی شوق تھا۔ اور ولیعہدی ہی مین انھون نے خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لیے ایک پُرفضا باغ اور اُس مین دو مختصر خوبصورت اور پرتکلف مکان بنوائے۔ علی نقی خان جنھین تخت پر بیٹھتے ہی خلعت وزارت عطا کیا اُن سے زمانۂ ولیعہدی ہی مین ایک رنڈی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ اُن کی جوانانہ شوخ مزاجی نے مزاج مین درخور پیدا کیا اور جب مذکورۂ بالا باغ اور عمارت اُن کے اہتمام مین تعمیر ہو کے پسند آئی تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت اور انتظام مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزون کوئی شخص نہین ہے

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری مین آگے آگے دو نقرئی صندوقچے چلتے جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے اُن مین ڈال دیتا۔ کُنجی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل مین پہونچ کے حضور ان عرضیون کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اسی طرح کئی نئے رسالے اور کئی پلٹنین بھرتی ہوئین۔ رسالون کے نام بادشاہ نے اپنی منشیانہ دلربائی سے بانکا۔ ترچھا۔ گھنگھور رکھے۔ اور پلٹنون کے نام اختری۔ نادری رکھے گئے۔ خود بدولت بہ نفس نفیس گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹون دھوپ مین کھڑے ہو کے اُن کی قواعد اور فنون جنگ مین اُن کی مشاقی دیکھتے۔ اور خوش ہو کے باکمال سپاہیون کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کیے "راست رو" "پس بیا" "دست چپ بگرد" چند روز بعد جوان حسین عورتون کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی اور اُن کو بھی انھین اصطلاحون مین قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا یہ نقش اولین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گزرا ہوگا کہ طبیعت اِن چیزون سے اُکتا گئی۔ زمانۂ ولی عہدی کا وہی پُرانا مذاق پھر عود کر آیا۔ حسین اور آوارہ عورتون سے صحبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنون مین ڈوم ڈھاڑی ہی ارکان دولت اور معززین سلطنت تھے۔ بادشاہ کے دل مین اب اگر کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ کیونکہ خود شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ مین اُن دنون شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ مین اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو اُنکی تعداد لکھنؤ کے شاعرون سے نہ بڑھ سکتی۔ میرا اور سودا کی پرانی شاعری تقویم پارینہ ہوچکی تھی۔ اب ناسخ کی زبان اور آتش کے خیالات دماغون مین بسے ہوے تھے جن مین رند و صبا کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویون نے شہوت پرستیون کی روح پھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اُس کا نام لے لے کے اُس کے حسن کی خوبیون اور اُس کی اداؤن کی دلفریبیون کو بیان کرتے۔ اور اُس کی طرف خطاب کر کر کے اپنی بیتابیون اور بیقراریون کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اُس سے ملتے مگر تہذیب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی مین معشوق گمنام ہوگیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق اُن کے خیال کا ایک پُتلا بن گیا جسے رند مشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوبرو لڑکا بتاتے۔ مگر صوفی تھوڑی سی معنوی تاویل کرکے اُسے حسین مطلق یعنی خلاق عالم بتا دیتے۔ یہی سمویا ہوا چھپا ڈھکا مذاق رندی فارسی شاعری مین رہا اور یہی مذاق اس وقت تک اردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتون پر عاشق ہوکے اُن کے خراب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُن کی مثنویون کی زبان ایسی خوبصورت بے تکلف اور شستہ و رفتہ تھی اور اُن مین عاشقانہ جذبات

اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب و شائستہ لوگوں سے بھی بے دیکھے اور مزہ لیے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی ان مثنویوں کو دیکھا اور چونکہ ماشاء اللہ سے خود شاعر تھے اُن رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے عشقوں اور اپنی عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزون کر کے ملک میں پھیلا دیا۔ اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ کو بادشاہ رند راو اُمرا میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے گزرے ہوں گے جنھوں نے عنفوان شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ واجد علی شاہ زور میں آئے تو چاہے شاعری میں نہ بڑھ سکیں مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارناموں کے عالم آشکارا کرنے میں نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہاں تک ترقی کی کہ بعض موقعوں پر انھیں مبتذل بازاری مذاق اور فحش الفاظ کے استعمال میں بھی تامل نہیں ہوتا۔

وہ کہاریوں۔ رنڈیوں۔ خواصوں۔ محل کی آنے جانے والی عورتوں غرض صدہا عورتوں پر عاشق ہوئے۔ اور چونکہ ولی عہد سلطنت تھے اپنے عشق میں خوب کامیاب ہوئے۔ جن کی شرمناک داستانیں اُن کی نظموں۔ تحریروں۔ اور تصنیفوں میں خود اُن کی زبان سے سُن لی جا سکتی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخ میں اُن کا کیرکٹر سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک نظر آتا ہے۔

چونکہ عمارت کا بیحد شوق تھا اس لئے تخت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کر دی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتوں کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور شانداری میں لاجواب ہے۔ اس میں بہت سی خوشنما اور باشان و شوکت دو منزلی عمارتوں کا ایک مربع مستطیل قطعہ دور تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رُخ جو دریا کی جانب تھا غدر کے بعد کھدوا ڈالا گیا۔ اور تین ضلع اب تک قائم ہیں۔ جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے گورنمنٹ نے تعلقداران اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اُن میں رہیں اور اُن کو اسی وضع میں قائم و برقرار رکھیں۔

قیصر باغ کے اندر وہ قطعہ زمین جس میں چمن بندی تھی جلو خانہ کہلاتا تھا۔ درمیان میں پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس میں اور کئی عمارتیں بھی تھیں جو اب نہیں باقی ہیں۔ اس کے باہر بہت متصل ہی بہت سی شاہی عمارتیں تھیں جنھوں نے اس قطعہ زمین کو اعجوبہ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتیں قیصر باغ کے شرقی پھاٹک کے باہر تھیں۔ آپ کو اس پھاٹک سے نکلتے ہی دونوں جانب چوبی اسکرینیں ملتی تھیں۔ جن میں سے گزر کے آپ چینی باغ میں پہونچتے۔ وہاں سے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کے آپ جل پریوں کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہونچتے۔ جس پر مدار المہام سلطنت نواب علی نقی خان کا قیام رہتا تاکہ ہر وقت جہان پناہ سے قریب رہیں اور بوقت ضرورت فوراً بلا لیے جا سکیں۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت باغ تھا۔ اور اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چونے کی عمارت تھی مگر چھت میں چاندی کے پتر جڑے ہونے کی وجہ سے چاندی والی بارہ دری کہلاتی۔ اُسی سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی جس میں خود جہان پناہ سلامت رہتے۔ اور وہیں نواب سعادت علی خان کی بنائی ہوئی پرانی کوٹھی بادشاہ منزل تھی۔

اب اُن چوبی اسکرینوں کے گلیارے سے نکل کے دوسری طرف مڑیے تو پیچیدہ عمارتوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا جو چوکھی کے نام سے مشہور تھیں ان عمارتوں کا بانی حضوری نائی عظیم اللہ تھا جنھیں بادشاہ نے چار لاکھ روپیہ دے کے مول لے لیا تھا۔ نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس میں رہتی تھیں اس کے اندر۔ غدر کے زمانے میں حضرت محل کا قیام رہا۔ اور یہیں انکا دربار ہوا کرتا تھا۔

یہاں سے ایک سڑک قیصر باغ کی طرف آئی تھی جس کے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا اُس کے نیچے گرداگرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا۔ جس پر قیصر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہان پناہ جوگی بن کے اور گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے۔ اس چبوترے سے بڑھ کے ایک عالیشان پھاٹک تھا جو لکھی پھاٹک کہلاتا اس لیے کہ

ایک لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور اُس سے بڑھ کے آپ پھر قیصر باغ مین آجاتے۔ قیصر باغ کی عمارت مین سلطنت کے اسّی لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور اُس کے چارون طرف کی عمارتون مین جہان پناہ کی بیگمین اور پری جمال واہ طلعت خانگین رہتین۔ جن کی جا اب عجیب و غریب عورتون کو دیکھ کے بس پرانے زمانے کے لیے کہہ اُٹھا کرتے ہین۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز ۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر روشن الدولہ کی کوٹھی تھی جسے واجد علیشاہ نے ضبط کر کے اُس کا نام قیصر پسند رکھ دیا تھا اور اُن کی ایک محبوبہ نواب معشوق محل اُس مین رہتی تھین۔ اب اُس مین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی عدالت ہے۔ اُس کے سامنے اور قیصر باغ کے اِس مغربی پہلو پر بھی ایک دوسرا جلوخانہ تھا۔

سال مین ایک مرتبہ قیصر باغ مین ایک عظیم الشان میلا ہوتا جس مین پبلک کو بھی قیصر باغ مین آنے اور جہان پناہ کی عشرت پرستیون کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس جو ہندوؤن مین مروج ہے دیکھا تھا۔ اور سری کرشن جی کی معشوقانہ وضع عاشقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا جس مین خود کنھیا بنتے مخدرات عصمت آیات گوپیان بنتین۔ اور ناچ رنگ کی محفلین گرم ہوتین کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیون کو جلا کے بھبھوت بنائی جاتی جس کی بدولت فقیری مین بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے مین ان صحبتون مین شریک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ گیروے کپڑے پہن کے آئین جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسّی اسّی برس کے بڈھے بھی شنگرفی کپڑے پہن کے چھیلا بن جاتے۔ اور بادشاہ کی جوانی کے بادۂ طرب سے اپنے بڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ مین کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیان منائی جا رہی تھین کہ گورنمنٹ برطانیہ کو رزیڈنٹون نے یہان کے حالات سے آگاہ کیا اور وہان کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک اودھ قلمرو برطانیہ مین شامل کر لیا جائے

اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ مین آئی۔ اور یکایک خلاف توقع بادشاہ کو
معزول کیا گیا۔ آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ مین شامل کر لیا گیا۔ آپ کے لیے بارہ
لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ سالانہ ہوا۔ آپ کے متوسلین
کی اور وابستگان دامن کی ضرورتون کے لیے بخوبی کافی مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہوئی
کہ شہر کے اندر آرام سے بے فکر بن کے بیٹھے۔ اور رعایا کی نگاہون سے آزاد
ہو کے بے غل و غش رنگ رلیان منایئے۔ یہ احکام سنتے ہی شہر مین سناٹا ہو گیا۔
خود بادشاہ نے رو دھو کے بہت کچھ عذر معذرت کی۔ بادشاہ کی مان اور خاص محل
نے حق وکالت ادا کیا مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم مین رد و بدل کرنا صاحب رزیڈنٹ
کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت
کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ نے اپنی والدہ و ولی عہد و خاص خاص [illegible]
مخلصین اور جان نثار رفقا کے کلکتہ روانہ ہوے کہ انگلستان جا کے اپیل کرین اور
اپنی بیگناہی ثابت کر کے انتزاع سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائین

عربون کی فطری جمہوریت

اہل عرب بالطبع جمہوریت پسند واقع ہوئے ہین اور اسی سبب سے قدیم الایام
مین نہ کبھی کسی سے وہ مفتوح ہوے اور نہ کبھی انھین کسی غیر قوم کی غلامی کرنی پڑی۔
ان مین ہزارہا سال سے ایک قسم کی طبعی اور فطری جمہوریت چلی آتی تھی۔ باہمی ربط و
ضبط قائم رکھنے کے لیے وہ اپنے شیوخ کا حکم ضرور مان لیا کرتے تھے۔ مگر شیخ کی
حیثیت قبیلے کے ایک وکیل یا آج کل کی جدید اصطلاح مین نمایندے کی سی
ہوتی۔ جس کی سرداری و سرگروہی کو زیادہ تر سیاسیات خارجہ اور بین الاقوامی
معاملات سے تعلق ہوتا۔ مؤلفہ (یعنی دو قبیلون کا باہم دوستی و یکجہتی کا عہد و پیمان
کرنا) ان کے تمام شیوخ کو اور ان کے ساتھ کل قبائل کو ملا کے ملک مین ایک عام
پارلیمنٹ قائم کرا دیتا۔ اور قبائل کے شیوخ اس پارلیمنٹ کے ارکان بن جاتے۔
ان مین قومی آزادی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ارض عرب مین اکیلا ہاوس

ان کا منشور رہا ہو گویا آئین لا زوال کبھی نہ قائم ہو سکا۔
اسلام نے عربوں کی اس فطری جمہوریت کے لیے ایک بین الاقوامی قانون بنا دیا جس سے انھیں اور زیادہ آزادی مل گئی۔ اور نظام ملوکیت قائم ہونے میں خدا اور رسول کی فرمان برداری کے سوا وہ ہر قسم کی غلامی سے محفوظ ہو گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلیفہ منتخب ہوئے اُن کی حیثیت بالکل پریسیڈنٹ کی سی تھی۔ جن کی حکومت اسی حد تک تھی جہاں تک شرعی قانون کے اجرا کا تعلق تھا۔ قرآن مجید نے اُن کی نسبت "اولوالامر منکم" کہہ کے اُن کی پریسیڈنٹ کی حیثیت اور زیادہ مضبوط کر دی۔ اور خدا اور رسول کے بعد انھیں بھی نیابت کرنے کا حق مل گیا۔ چنانچہ اسی قرآنی اصطلاح سے اُن کے لیے امیرالمومنین کا خطاب ماخوذ کر لیا گیا۔
کہتے ہیں کہ اولوالامری کی شان خلفائے راشدین کے زمانے تک قائم رہی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ بھی اس کو آخر تک نہیں نباہ سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی خلافت اب وہ اگلی عرب ہی کی پارلیمنٹ نہ تھی بلکہ عربوں کو دنیا کی ایک زبردست سلطنت مل گئی تھی۔ اور عربوں کی پارلیمنٹ کو جو صرف علاقہ ہائے عرب کے لیے موضوع تھی دنیا کے بڑے بڑے آباد اور متمدن ملکوں پر فرمان فرمائی کرنا پڑی۔ اور روم و عجم کی شخصی سلطنتوں کی رعایا سے سابقہ پڑا جو بادشاہ کو ظل اللہ اور بجائے خلیفۂ رسول کے خدا کا نائب اور اس کے کارخانے کا مختار کل بلکہ معبود و مسجود خیال کرتی تھی۔ اور ایسی رعایا سے سابقہ پڑنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ عرب کی پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹوں سے شخصی فرمان روا اور خود سر تاجداروں کی وضع ظاہر ہونے لگی۔ اور جس طرح سکندر اعظم ایران کو فتح کر لینے کے بعد اہل یونان کے مذاق کا قائم نہیں رہ سکا تھا ویسے ہی عرب کے خلفا دنیا کے بڑے بڑے ملک فتح کر لینے کے بعد صرف پرانی عربی پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹ نہیں رہ سکتے تھے۔ بلکہ لازمی تھا کہ شخصی سلطنتوں کے تاجدار بن جائیں۔
پہلے دو خلیفوں نے اپنی پرانی وضع کو آخر تک نباہا۔ مگر حضرت عثمان کی عبادت گزاری و تربیت قرآن ہی نے یہ شان دکھا دی کہ ممالک مفتوحہ و مقبوضہ کی

شکایتون سے کان بہرے کرلیے - اور نتیجہ یہ ہوا کہ حرم مدینہ مین خونریزی ہوئی - بازار فتنہ گرم ہوا - اور وہ خود کمال مظلومی و استقلال کے ساتھ شہید ہوئے - حضرت علی کی خلافت کا آغاز ہی اندرونی جھگڑون سے ہوا - اور ان اندرونی جھگڑون ہی نے اُس کا خاتمہ بھی کر دیا - ان جھگڑون اور خونریزیون کو عام مورخین سول وار بتاتے ہین - مگر دراصل یہ عرب کی قدیم جمہوریت کا جدید شخصیت سے مقابلہ تھا - جس مین بظاہر شخصیت کو اور باطناً جمہوریت کو فتح ہوئی - اس لیے کہ عرب نے اُس خلافت ہی کو جو شاہنشاہی بنی جاتی تھی اپنے آغوش سے نکال کے باہر پھینک دیا - خلافت مدینہ سے گئی اور پھر نہ آنے پائی -

حضرت علی ہی کے عہد مین عرب کے باہر دو دربار قائم ہو گئے تھے - ایک کوفہ مین جو ارض عراق مین عربون کی ایک نوآبادی تھی اور دوسرا دمشق مین جو ابعض شام کا بہت ہی پرانا تاریخی شہر تھا - کوفے مین آزاد قبایل عرب کے بڑے بڑے شرفا آباد تھے اور جنھون نے حکومت کی آزادیون کو ہمیشہ روکا - یہان تک کہ حضرت علی کبھی اُن کو اپنا سچا مُطیع و منقاد نہ بنا سکے - مگر دمشق اور ارض شام کا نشو و نما ہی شخصی حکومتون کے آغوش مین ہوا تھا لہٰذا وہان جب امیر معویہ نے اپنے شخصی اقتدارت بڑھائے اور قیاصرۂ روم کی شان و شوکت اختیار کر کے لینے دربار مین ڈسپاٹزم (شخصیت) بڑھائی تو کسی نے چون نہ کی - اور ساری رعایا غلامی اختیار کرلے کے لیے تیار ہوگئی - اور جو دو چار آزاد مشرب عرب وہان موجود تھے اور وہ بار کا رنگ دیکھ دیکھ کے بگڑنے لگتے تھے اُن کو معویہ نے اپنے حلم اور اپنی فیاضی سے مطیع بنا لیا اگرچہ اُن دونون دربارون مین نہ وہ عربون کی سادگی اور لوالامری تھی اور نہ وہ اگلی امیر المومنینی - مگر کوفہ اور دمشق کی آب و ہوا کا فرق اُس وقت صاف نظر آگیا جب ایک سرکش مُوذی کی تلوار نے حضرت علی کی خلافت کا خاتمہ کر دیا - اور اُن کے جانشین حضرت امام حسنؑ کو خود اپنے لشکر کے باہمی اختلافات سے تنگ آکے خلافت چھوڑ دینا پڑی مگر معویہ کا شخصی دربار آخر تک قائم رہا -

حضرت علی ہی کے عہد مین عربون کی فطری جمہوریت کا پہلا نمونہ خوارج تھے جن کا خیال تھا کہ علی اور معویہ قومی حقوق کی طرف سے بے پروا ہو کے اپنے ذاتی اغراض

و مقاصد کے لیے لڑ رہے ہین - پھر جب دونون کی مسلمہ پنچایت مین حضرت علی ہی کے نائب نے کہہ دیا کہ دونون مدعیان خلافت علحدہ کر دیے جائین اور کوئی تیسرا شخص خلیفہ منتخب کر لیا جائے - اور پھر اس پر حضرت علی نے عمل نہ کیا تو علانیہ بغاوت کر دی آیۂ کریمہ "ان الحکم الا للہ" کو اپنا شعار بنایا - اپنے جھنڈے پر اُسے لکھا اور دعوی کیا کہ سوا اُس خلافت کے جو قرآن و حدیث کی پابندی مین حکومت کرے اور سچی اولوالامری ہو کسی حاکم کی تقلید اور غلامی کرنا حرام ہے - یہ لوگ شکستین کھانے پر بھی فنا نہ ہو سکے اور کوفہ و بصرہ کے اطراف مین بیٹھ کے ہر سلطنت اور خلافت سے سرتابی کرتے رہے -

اب دمشق مین خلافت کے نام سے شخصی حکومت کا دربار قائم تھا - جو قوانین شریعت اور عربی آزاد مشربی سے روز بروز زیادہ دور ہوتا جاتا - اُس کے فرمان روا ہی اُمید تھے جن کی زبان قانون تھی - اور سارے ممالک دور و دراز اُن کے آگے سربسجود تھے - مگر عرب کے اندرونی قبائل کو یہ دیکھ دیکھ کے تاب نہ آتی تھی کہ ہماری ہی قائم کی ہوئی خلافت اولوالامری سے فرعونیت بنتی جاتی ہے اور ہم کچھ نہین کر سکتے - اسی جوش نے حضرت امام حسین کو شہید کرایا اور اسی نے چند روز کے لیے عبداللہ بن زبیر کی خلافت خاص مکۂ معظمہ مین قائم کرائی - مگر دمشق کی شاہانہ فوجون کے مقابل مین وہ بھی زندہ نہ رہ سکی -

ابن زبیر کی خلافت کا خاتمہ ہونے کے بعد وسط عرب کے لوگون کو صبر آ گیا کہ اگر خلافت اُولوالامری نہین رہی تو اب وہ ہمارے ملک مین بھی نہین - ہم اپنے ملک مین آزاد ہین - اور وہی پرانی قبیلہ بندیان موجود ہین - دمشق کا شاہانہ تمرّد دوسرے ملکون کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے ہماری آزادیون مین فرق نہین ڈال سکتا - اور جب وہ ہماری آزادیون مین فرق نہین ڈالتا تو ہمین کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کو جھگڑا مول لین - مگر اطراف کوفہ و بصرہ کے خوارج کا جوش کسی طرح دھیما پڑنے کو نہ آتا تھا - وہ برابر مقابلہ کیے جاتے تھے - اور کوئی بادشاہ ہو اُس کی جان کے دشمن تھے - رہ رہ کے اُبھرتے تھے - گر گر کے سنبھلتے تھے - شکستین کھاتے تھے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے - مارے جاتے تھے اور پہلے سے زیادہ جوش خونخواری کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے -

دیگر خلفاے بنی اُمیہ نے تو فوج کشی ہی کے ذریعہ سے اُنھین دبانا چاہا مگر عمر بن عبدالعزیز نے اُن سے مناظرہ کر کے اپنی علمی قابلیت اور اپنے دینداری کے اثر سے اُن پر فتح حاصل کی جس کا بیان لطف سے خالی نہین۔ اُس کی خلافت کا آخری سال تھا کہ والی کوفہ عبدالحمید نے رپورٹ کی کہ بسطام بن یشکر خارجی نے جو شوذب کے لقب سے مشہور ہو اپنے دلیر ساتھی جمع کر کے عراق مین سر اٹھایا ہو اور سر پر خاش ہو۔ عمر نے عبدالحمید کے نام فرمان بھیجا کہ ان لوگون کو اپنی طرف سے نہ چھیڑو۔ کسی بہادر اور محتاط سردار کو فوج دے کے اُن کے مقابلے مین بھیج دو مگر تاکید کر دو کہ جبتک وہ لوگ فتنہ انگیزی و خونریزی کے مرتکب نہ ہولین اُن سے مقابلہ نہ کرے۔ اس حکم کے مطابق عبدالحمید نے محمد بن جریر بن عبداللہ بجلی کو احکام خلافت کی پابندی کی تاکید کر کے دو ہزار سپہ گردن کے ساتھ روانہ کر دیا جس نے بسطام کے مقام مین جا کے پڑاؤ ڈال دیا۔ اور خاموشی سے حریف کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔

عمر بن عبدالعزیز نے جس وقت یہ فرمان عبدالحمید کو بھیجا ہو اُسی وقت ایک دوسرا خط براہ راست بسطام کو بھیجا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ مین نے سنا ہو تم نے خدا و رسول کے حکم کے خلاف بغاوت اختیار کی ہو۔ حالانکہ تمھین مجھ سے زیادہ استحقاق خلافت کا نہین ہو۔ اچھا آؤ۔ ہم تم مناظرہ کر لین۔ اگر ہم حق پر ثابت ہون تو ساری دنیا کے مسلمانون کی طرح تم بھی میری خلافت کو خاموشی سے قبول کر لو۔ اور اگر تم حق پر ثابت ہو تو ہم غور کرین کہ اس معاملہ مین کیا کرنا چاہیے۔ بسطام نے معمول کے خلاف جب یہ رنگ دیکھا کہ خلافت کی زبردست فوج سامنے خاموش پڑی ہوئی ہو اور خود خلیفہ بحث کرنا چاہتے ہین تو عمر ابن عبدالعزیز کو خط لکھا آپ جو کچھ فرماتے ہین بجا و درست ہو اور آپ کی خواہش کے مطابق مین اپنے دو معتمد علیہ شخصون کو یہ خط دے کے بھیجتا ہون۔ ایک تو بنی شیبان کا ایک حبشی غلام عاصم ہو اور دوسرا میرے قبیلۂ بنی یشکر کا ایک معمولی شخص ہو۔ دونون بسطام کا خط لے کے مقام خناصرہ مین پہونچے جہان اُن دنون عمر بن عبدالعزیز تھا۔ اور حاضر دربار ہوے عمر اُن سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔ اور اطمینان سے ترتیب سے بٹھا کے پوچھا تم لوگون نے کس لیے بغاوت اختیار کی ہو؟ اور سرتابی کا اصلی سبب کیا ہو؟

عاصم۔ "ہمیں آپ کے ذاتی افعال وخصائل کی شکایت نہیں۔ جانتے ہیں کہ آپ نیک نفس۔ پابند شرع۔ عدالت گستر ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں مگر یہ بتائیے کہ آپ اولوالامر کس حق سے بن گئے؟ کیا ساری دنیا کے مسلمانوں نے مشورہ کرکے اور برضا ورغبت آپ کو امام منتخب کیا ہے؟"

عمر۔ "نہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ میں نے لوگوں سے خلافت مانگی۔ اور نہ جبراً حاصل کی مجھ سے پہلے وہ جس شخص کے ہاتھ میں تھی عام اس سے کہ اس نے جائز طور پر حاصل کی ہو یا ناجائز طور پر۔ اُس نے میری جانشینی کی وصیت کر دی تھی۔ اُس وصیت کے بموجب میں نے اُس کو قبول کر لیا۔ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور تمھارے سوا آج تک کوئی جھگڑا کرنے والا پیدا ہوا تھا۔ تم لوگوں کی بھی یہ رائے ہے کہ ایسے شخص کو خلیفہ ہونا چاہیے جو انصاف کرے اور عدالت گستری سے کام لے تو پھر مجھی کو وہ منصف شخص خیال کر لو۔ اور اگر میں حق کے خلاف کوئی کارروائی کروں یا صراط مستقیم سے گمراہ ہو جاؤں تو پھر میری اطاعت تم پر فرض نہ رہیگی"

یہ تقریر سُن کے بسطام کے دونوں نائبوں نے کہا "اچھا تو پھر ہمارا آپ کا ایک بات پر فیصلہ ہو جائے گا"

عمر۔ "وہ کون سی بات ہے؟"

عاصم۔ "ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اُن تمام افعال اور حرکات وسکنات کو بُرا سمجھتے ہیں جو آپ کے گھرانے کے اگلے حکمرانوں سے سرزد ہوتے رہے۔ اور اُن کو ظالم و جابر مانتے ہیں۔ لہذا اگر یہ آپ کے نزدیک صحیح ہے کہ وہ ضلالت پر تھے اور آپ حق پر ہیں تو اُن پر لعنت بھیجیے"

عمر۔ "میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے دنیا طلبی کے لیے ہتھیار نہیں اُٹھائے ہیں بلکہ فلاح اُخروی کے خواستگار رہو؟"

عاصم۔ "بے شک۔ ہم دنیا نہیں چاہتے"

عمر۔ "مگر تمھاری اس درخواست سے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہو"

عاصم۔ "کیوں؟"

عمر۔ "حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ جل شانہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

لعنت بھیجنے والا پیغمبر بنا کے نہین مبعوث کیا تھا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کا قول تھا کہ بار الٰہا جو میری پیروی کرے میرا ہو اور جو میرا کہنا نہ مانے اُس کے لیے تو بخشنے والا مہربان ہو۔ اور ان دونون بزرگون کی نسبت وہ حضرت رب العزت فرماتا ہو: یہ وہ لوگ ہین جنھین خدا نے ہدایت کی ہو۔ اس لیے تم بھی اُن کی پیروی کرو۔ مین نے ان گذشتہ خلفا کے افعال کو ظلم مان لیا۔ مذمت اور عیب چینی کے لیے اتنا کافی ہو۔ رہا گنہگارون پر لعنت بھیجنا تو یہ کوئی ایسا فرض نہین ہو جس سے مسلمان کو مفر ہی نہ ہو۔ اور اگر تمھارے نزدیک فرض ہو تو بتاؤ تم نے فرعون پر کب اور کتنی بار لعنت کی ہو؟"

عاصم "ہمین تو یاد نہین کہ فرعون پر ہم نے کبھی لعنت بھیجی ہو۔"

عمر "تو پھر تمھارے لیے تو اگر فرعون پر بھی لعنت نہ بھیجو جو بدترین خلق تھا کوئی مضایقہ نہین۔ اور میرے لیے اتنی بھی گنجایش نہین کہ اپنے اُن خاندانی لوگون اور قرابت دارون پر لعنت نہ بھیجون جو مسلمان تھے نمازی تھے۔ روزہ دار تھے۔ اور عبادت گزار تھے؟"

عاصم "جور و ظلم کرنے کی وجہ سے کیا وہ کافر نہین ہو گئے؟"

عمر "ہرگز نہین۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگون کو اسلام کی دعوت کی اور جن لوگون نے وہ دعوت قبول کر لی۔ اور آپ کی شریعت کو مان لیا اُن کے ایمان کو آپ نے تسلیم فرما لیا۔ پھر اس کے بعد اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تو اُن پر صرف حد جاری کی گئی اسلام سے خارج نہین کیے گے۔"

عاصم "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگون کو توحید کی طرف بلایا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ شرط تھی کہ آپ پر خدا جو احکام نازل کرے اُن کے ماننے کا اقرار کرین۔"

عمر "بے شک۔ مگر گذشتہ خلفاے بنی اُمیہ مین سے تو ایک بھی ایسا نہین گذرا جس نے کہا ہو مین احکام نبوت کو نہ مانونگا یا سنت رسول اللہ پر عمل نہ کرونگا اصل حقیقت یہ ہو کہ شقاوت اُن پر غالب تھی۔ اور جن امور کو حرام جانتے تھے جان بوجھ کے اُن کے مرتکب ہوے۔"

عاصم "اچھا لعنت بھیجنے مین آپ کو تامل ہو تو اُن کے افعال پر تبرا کیجیے جو آپ کے عمل کے خلاف ہین۔ اور اُن خلفا کے احکام کی تردید کیجیے۔"

عمر۔ ’’اچھا بتاؤ تم ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو کیا سمجھتے ہو؟ حق پر تھے یا باطل پر؟‘‘

عاصم۔ ’’وہ حق پر تھے۔ اُن کے افعال کو کون باطل کہہ سکتا ہے!‘‘

عمر۔ ’’تمھین اس کی خبر ہے کہ ابوبکر نے جب مرتدوں پہ حملہ کیا تھا تو اُن کا قتل و قمع کیا۔ ان کے اہل و عیال کو لونڈی غلام بنایا۔ اور ان کی جائداد پر قبضہ کر لیا!‘‘

عاصم۔ ’’ہان معلوم ہے‘‘

عمر۔ ’’اور یہ بھی جانتے ہو کہ ابوبکر کے بعد عمر نے مرتدون کے اہل عیال کو فدیہ لیکے چھوڑ دیا تھا؟‘‘

عاصم۔ ’’یہ بھی جانتے ہین‘‘

عمر۔ ’’تو کیا عمر نے ابوبکر کے اس فعل سے تبرا کیا تھا؟‘‘

عاصم۔ ’’نہین‘‘

عمر۔ ’’انھون نے نہ کیا سہی۔ خود تم ان دونون خلیفون مین سے کسی ایک کے فعل سے تبرا کرتے ہو؟‘‘

عاصم۔ ’’ہم بھی نہین کرتے‘‘

عمر۔ ’’اچھا اب ایک اور بات بتاؤ۔ غالباً تمھین معلوم ہوگا کہ تمھارے بزرگان نہروان (سب سے پہلے خوارج جو حضرت علی سے لڑے تھے) مین سے کوفہ والے جو لوگ سرکشی پر آمادہ تھے نہ خونریزی کی اور نہ کسی کا مال لوٹا۔ بخلاف اس کے بصرے والے نہروانیون نے یہانتک بیرحمی اختیار کی کہ عبداللہ بن خباب اور اُن کی لونڈی کو بھی نہ چھوڑا جو حاملہ تھی؟‘‘

عاصم۔ ’’ہان یہ تو ہوا تھا‘‘

عمر۔ ’’تو کیا جن خوارج نے خونریزی کی تھی خونریزی نہ کرنے والون سے یا جن لوگون نے خونریزی نہین کی تھی خونریزی کرنے والون سے تبرا کرتے تھے؟‘‘

عاصم۔ ’’نہین‘‘

عمر۔ ’’انھون نے نہ کیا تو مضائقہ نہین تم اُن دونون فریقون مین سے کسی ایک سے تبرا کرتے ہو؟‘‘

عاصم۔ ’’نہین۔ ہم بھی نہین کرتے‘‘

عمر۔ ’’تو پھر تمھارے لیے تو اسقدر گنجایش ہے کہ ابوبکر و عمر اور اپنے کوفے اور بصرے والے دونون گروہون کیساتھ باوجود انکے باہمی اختلاف اعمال کے تولا کرتے ہو مگر مجھے اپنے اُن عزیزون سے جو مسلمان اور دیندار تھے تبرا کیے بغیر مفر نہین!‘‘

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے انھین لاجواب دیکھ کے سمجھانا شروع کیا کہ خدا سے ڈرو

سچ یہ ہے کہ تم لوگ جاہل ہو۔ اور سمجھ سے کام نہین لیتے۔ جن باتون کو رسول اللہ صلعم نے منع کیا تھا انھین تو جائز کر لیتے ہو اور جن باتون کو جائز بتایا ہو اُن سے لوگون کو منع کرتے ہو۔ جس شخص کے لیے رسول اللہ صلعم سے خوف تھا اُسے تمھارے یہان امان ملتی ہو اور جسے آپ نے امان دی تھی اُس کے تم جانی دشمن ہو۔ کلمہ گو کو تمھارے یہان امان نہین ملتی حالانکہ آنحضرت اُسے امان دیتے تھے۔ اور اُس کی جان و مال پر دست درازی کرنا حرام بتاتے تھے۔ تمام مذاہب کے پیرون کا خون تم اپنے اوپر حرام سمجھتے ہو۔ تمھارے یہان ایک حلال ہو تو کلمہ گو کا خون!"

یہ تقریر سن کے بسطام کے وہ دونون سفیر عاجز اور لاجواب تھے۔ اور سر جھکائے ہوئے سوچ رہے تھے۔ آخر وہ یشکری شخص سر اٹھا کے بولا "اچھا ایک بات بتائیے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کسی قوم کی جان و مال کا مالک ہوا۔ اُن لوگون کے ساتھ انصاف اور نیکی کرتا رہا۔ لیکن آخر مین اپنی وہ حکومت اُسنے ایک شخص کو دے دی جو اُس کا اہل نہ تھا۔ آپ ایسے شخص کی نسبت کیا کہتے ہین؟ اُسنے خداترسی کا حق ادا کیا یا نہین؟"

عمر "ہرگز نہین۔ ایسے شخص کی نسبت کون کہہ سکتا ہو کہ اُس نے خداترسی کا حق ادا کر دیا؟"

یشکری "ایسا ہو تو پھر آپ یہ خلافت یزید بن عبدالملک[۵] کو کیون دیے جاتے ہین جس کی نسبت آپ جانتے ہین کہ حق پر نہ رہے گا؟"

عمر "مگر اُسے مین نے اپنا ولی عہد نہین قرار دیا ہو بلکہ اُس کے بارے مین عبدالملک اور سلیمان مجھ سے پہلے وصیت کر گئے ہین مین اس بارے مین کچھ نہین کہتا۔ جب اُس کا زمانہ آئیگا تو مسلمانون کو اختیار ہوگا کہ اُس کی اطاعت کرین یا نہ کرین"

یشکری "یہ مین نے مانا کہ آپنے اُسے ولی عہد نہین بنایا۔ مگر جس کسی نے بنایا اُس کے اس فعل کو آپ کیسا خیال کرتے ہین جائز یا ناجائز؟"

یہ الفاظ سُن کے عمر بن عبدالعزیز کی آنکھون سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر ضبط کرکے کہا "اِس کے جواب کے لیے مجھے تین دن کی مہلت دو" بسطام کے دونون سفیرون نے قبول کیا یہ صحبت اسی پر ختم ہوئی۔ اور وہ دونون رخصت ہو کے اپنی فرودگاہ کو گئے۔

---

[۵] آل مروان کا سب سے زبردست خلیفہ عبدالملک بن مروان وصیت کر گیا تھا کہ اُس کے بیٹے ولید سلیمان اور یزید ایک دوسرے کے بعد اورنگ نشین خلافت ہون۔ عمر بن عبدالعزیز عبدالملک کا بھتیجا تھا سلیمان نے وصیت کر دی کہ اُس کے بعد اس کا ابن عم عمر اور پھر اُس کے بعد سگا بھائی یزید خلیفہ ہو۔

اس کے بعد جب وہ دونوں آ کے عمر بن عبدالعزیز سے ملے تو عاصم نے صورت دیکھتے ہی کہا "میں تو اعتراف کرتا ہوں کہ آپ بالکل برسر حق ہیں" عمر نے یشکری سے پوچھا اور تم کیا کہتے ہو؟ بولا "آپ نے جو کچھ تعریف کی گئی ٹھیک ہے مگر میرا ابھی اطمینان نہیں ہوا اپنے جو کچھ کہا ہے اسے عام لوگوں کے سامنے پیش کیجیے اور دیکھیے کیا کہتے ہیں"

یہ کہہ کے وہ یشکری واپس گیا اور عاصم عمر ہی کے پاس رہ گیا۔ عمر نے اسے انعام دیا اور اچھی طرح رکھا مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ آنے کے پندرھویں ہی دن مر گیا لیکن اس واقعہ کے بعد سے عمر بن عبدالعزیز کی یہ حالت تھی کہ بار بار زبان سے نکل جاتا "یزید بن عبدالملک کے معاملہ نے مجھے خاک میں ملا دیا" یہ سن کے بنی امیہ کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو عمر بن عبدالعزیز دینداری کے جوش میں آ کے کسی غیر کو ولی عہد مقرر کر دے۔ یہ ہوا تو غضب ہی ہو جائیگا اور پھر خلافت بنی امیہ کے گھرانے میں نہ آئے گی۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے لوگوں نے سازش کر کے عمر بن عبدالعزیز کو ایک شخص کے ہاتھ سے زہر دلوا دیا۔ اور چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس کی وفات سے پہلے ہی اس کی باتوں سے متاثر ہو کے بسطام سرکشی سے باز آ گیا۔ اور جو خلافت کی فوج اس کی روک تھام کے لیے گئی تھی واپس آئی۔

سعی بے حاصل

کچھ کرو۔ اور کیے جاؤ۔ کیونکہ تم کرنے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تم اسی وقت تک زندہ ہو جب تک کچھ کرتے ہو۔ تمھارا کچھ کرنا رکا اور سمجھ لو کہ تم نہیں ہو" کام تمھاری زندگی کا شعار۔ اور انسانی ہستی کے علم کا مارکہ ہے۔ کوئی ترقی کا آسمان کوئی بلند ہمتی کا عرش اوپر دکھائی دے اور تم اس کی طرف اڑو۔ کوئی اولوالعزمی کا شہ نشین۔ اور کوئی عالی حوصلگی کی مسند نظر آئے اور تم اس کی طرف دوڑو۔ کوئی ہزار روکے نہ رکو۔ ہزار منع کرے نہ مانو۔ دلیری و استقلال کے ساتھ بڑھتے ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ ناکامیاں نہ چلنے ہی میں ہیں۔ چلے اور پہونچے تمھارا ہمت بندھانے والا کرکیت کہہ رہا ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ" یہی نعرہ لگاتے

ہوئے بڑھو اور منزل مقصود مین پہونچ جاؤ۔ اسی طلسمی عمل کو تعویذ کی طرح بازو پر باندھ کے ہاتھ بڑھاؤ۔ اور جو کچھ چاہتے ہو لو۔ مگر ہان شرط یہ ہے کہ ہمت پوری اور جستجو سچی ہو۔ تمھارے کام مین سچی سعی کی شان پیدا ہوئی اور دشواریون۔ ناکامیون۔ مزاحمتون اور مصیبتون کی یہ خطرناک گھاٹی سی جو سامنے نظر آ رہی ہے اُسے "مَن طلب وجد" کے دو کلمون فرشتون نے ایک تھیٹر کے پردے کی طرح ہٹا کے تمھین شاہد آرزو کا جلوہ دکھا دیا۔

جب کبھی ہم کسی دشوار اور اپنی حیثیت سے بڑھی ہوئی آرزو کے حصول کے لیے قدم مارتے ہین۔ یا کسی ایسے کام کو شروع کرتے ہین جس مین کامیابی مشکل نظر آتی ہو تو اکثر احباب کی ناصحانہ زبان سے سنتے ہین "بیکار محنت سے کیا حاصل؟" اور "اس سعی بے حاصل کا کیا نتیجہ ہے"۔ مگر آہ وہ یہ نہین جانتے کہ حرکت ہی مین برکت ہے۔ اور "لاحاصل" "بے نتیجہ" "دشوار" "مشکل" بلکہ "محال" "غیر ممکن" اور اسی طرح کے تمام پست ہمتی کے الفاظ سب انھین لوگون کے لیے ہین جو ان الفاظ کو اُن کے متعارف معنون مین لیتے ہین۔ ساری مشکل تمھارے مشکل جاننے سے ہے۔ اور تم محال نہ جانو تو سچ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز محال نہین ہے۔ کیا تم نے نہین سنا کہ بعض اعلی درجہ کے اولوالعزمون[عه] نے محال کا لفظ اپنی لغت مین سے نکال ڈالا تھا؟ اور اس کے تمام عالی ہمت لوگون کے نزدیک محال و غیر ممکن کوئی چیز نہ تھی؟

اصل یہ ہے کہ فائدہ اور نتیجہ ہو یا نہ ہو کوشش کرتا رہنا ہماری فطرت ہے۔ اور بے کچھ کیے ہم رہ ہی نہین سکتے۔ تم نے کسی صوفی کو حالت وجد و حال آتے دیکھا ہے؟ مستی کے ایک دو اثر شعر اور معنی خیز کلام پر وہ کس طرح بیخود ہو کے ناچنے لگتا ہے؟ اسی طرح ہمارے دل مین جس وقت کوئی جوش یا خیال پیدا ہوتا ہے ہم ایسے بے خود ہو جاتے ہین کہ وہ جوش جس رخ سے کہے ہاتھ ہلانے اور اسی کی گت پر ناچنے لگین۔ لہذا ہمارا کام ہے کہ بلا لحاظ اس کے کہ کامیابی ہوگی یا ناکامی ہاتھ پاؤن مارین اور کوشش کا دامن پکڑ لین چاہے وہ پھٹ کے ہمارے ہاتھ ہی مین رہ جائے۔ فلسفہ اسباب و علل کا گرویدہ ہمارے کامون کا محاسبہ کرتا اور ہمارے تمام افعال کی علت و غایت پوچھتا ہے۔ ہم اگر جواب مین یہ کہین کہ کوئی غرض نہین تو ہمین

عه: واقعہ نپولین بونا پارٹ کا ہے۔

جنون بتلاتا ہی اور اگرچہ جواب دیتے ہین کہ ہمارے تمام افعال کسی دوسری
قوت کے تابع اور بجائے خود اضطراری ہین تو ہمین جبریت کا لزوم ٹھہراکر
وہ ہماری نسبت بے دینی والا مذہبی کا فتوی دیتا ہی۔ وہ چاہتے ہین پکڑے اور
کیسے ہی الزام دے مگر ہم اپنی فطرت سے مجبور ہین۔

اے پرستاران عقل! ہر شخص سے اُس کے حرکات وسکنات کا سبب نہ
پوچھا کرو۔ کیونکہ جنون و پراگا میدان بہت تنگ ہی۔ اور علت ومعلوم کا سلسلہ چلکر
نہین چلتا۔ دیکھو پہاڑ کی چوٹی پر سے اُس بدنصیب کے قدم کو لغزش ہوگئی۔ آہ وہ
گرا۔ اور لڑھکتا۔ قلابازیان کھاتا۔ چٹانون سے ٹکراتا۔ اور سنگلاخ سلون کی
رگڑین کھاتا ہوا نیچے چلا آتا ہی۔ اس قعر فنا مین جاتے وقت اگرچہ اُسے یقین ہی
کہ ساری کوششین بے سود ہین۔ مگر دل نہین مانتا۔ کبھی کسی پتھر کو پکڑ لیتا ہی۔ اور کبھی
کسی گھاس پر ہاتھ مارتا ہی۔ پتھر ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہی۔ اور گھاس کی
پتیان ٹوٹ کے مٹھی مین رہ جاتی ہین۔ مگر وہ اپنی سعی لاحاصل سے باز نہین
آتا۔ اُس سے نہ پوچھو کہ یہ بےنتیجہ کوششین کیون کر رہے ہو؟

اُس شکستہ بخت کشتی شکستہ کو دیکھتے ہو جسے عدم آباد کے پُرخطر سفر مین
سہارا دینے کے لیے کوئی ٹوٹا تختہ بھی نہین نصیب ہوا؟ ناپیدا کنار سمندر مین
زور وشور سے ہاتھ پاؤن مارتا۔ اور اُس سیاہ چٹان کی طرف جا رہا ہی جو
کوسون کی مسافت پر ایک دیوزاد کی طرح سطح آب پر کھڑی ہوئی اُسے اپنی طرف
بلا رہی ہی۔ جانتا ہی کہ وہان تک پہونچنا انسان کی امکانی کوشش سے
باہر ہی۔ اور بفرض محال پہونچے بھی تو وہان کسی قسم کا سامان زندگی
نہین موجود ہی۔ مگر اُسے ان انجامون کا مطلق خیال نہین۔ زیست کی
کوئی امید نہین ہی؟ مگر دیکھو اُس ٹہنی پر جو کہین سے بہتی ہوئی آگئی ہی
ہاتھ مارتا ہی کہ اُسے پکڑ کے ڈوبنے سے بچ جائے۔ اُس تنکے کا سہارا چاہتا
ہی جسے موجین خدا جانے کہان سے بہا لائی ہین۔ تم ہی نہین کہتے خود اُسے
بھی معلوم ہی کہ یہ سعی بےحاصل ہی مگر اپنی سی کر گذرتا ہی۔ اور
بے کیے نہین رہا جاتا۔

ان دونون انتہا درجے کے مایوسان زلیست کو تم نے دیکھ لیا کہ گو انھین یقین واثق تھا کہ کوشش بے فائدہ اور ہاتھ پاؤن مارنا بے سود ہو مگر اپنی سی کیے گئے۔ اور مرتے دم تک کچھ کرتے ہی رہے۔ یونہین تم بھی دم واپسین تک اپنا کام کرتے رہو۔ شہید اور پڑکے مرنے والے مین یہی فرق ہو کہ پہلا مرتے دم تک کوشش کا دامن نہین چھوڑتا اور دوسرا ہاتھ پاؤن ڈال کے پڑجاتا ہو۔ اگرچہ دوا درمن اور تدابیر صحت سے یہ بھی باز نہین آتا مگر شہید کی کوشش زیادہ جان بازی کی ہو اور اسی لیے اُس کو ابدی زندگی نصیب ہوگئی اس سے تم اس نتیجہ کو بہ آسانی پہونچ سکتے ہو کہ جو آخر تک اپنا کام کرتا رہے اور کوشش کیے جانے وہ اصل مرتا ہی نہین۔ اس کی موت صرف ظاہر مین نظر آتی ہو حقیقت مین اُسے ابدی زندگی حاصل ہوگئی۔ کیونکہ اُس کی سعی وکوشش ہی اُس کے حق مین آب حیات بن جاتی ہو۔

اسباب و علل کا سلسلہ کوششون کے عالم مین چلتا بھی ہو تو اسی حد تک جہان تک کہ ہم پر یاس و نا امیدی کا غلبہ نہ ہو۔ مایوسی کے بعد ہم جو کچھ کرتے ہین وہ ہمارا ایک اضطراری فعل ہوتا ہو جب چڑیا بلّی کے منھ مین جاکے پھڑ پھڑاتی اور بکری شیر کے پنجے مین پھنس کے چلاتی اور ہاتھ پاؤن مارتی ہو اُس وقت اُسے حس نہین ہوتی کہ ہم یہ کیون کر رہے ہین۔ اسی طرح ہمارے عالم یاس کے مضطربانہ حرکات کے متعلق اگر ہم سے سوال کیا جائے کہ "یہ کیون کیا؟" اور "یہ کیون نہ کیا؟" تو اول تو ہمین جواب دینے کی فرصت ہی نہین ہوتی۔ جو سراپا مصروف سعی لاحاصل ہو اُس کے کان سب طرف سے بہرے ہو جاتے ہین۔ اور اگر توجہ کرنے کی فرصت مل بھی جائے تو اس وقت ہمارا دماغ چون وچرا کا بار اٹھا ہی نہین سکتا۔ ہم خود ہی نہین جانتے کہ یہ کیون کر رہے ہین تمھین کیا جواب دین؟ بس اتنا ہو کہ اپنے ان مضطربانہ افعال اور اپنی اُن بے نتیجہ کوششون سے ہم اپنے جوش غم کی آگ پر پانی ڈالتے اور اپنے بیتاب دل کو گونہ تسکین دیتے ہین۔ ہم یہ ہرگز نہین سمجھتے کہ اس ہاتھ پاؤن مارنے سے مطلب حاصل ہو جائیگا مگر ان یہ

بے بسی کی حرکتیں ہمارے دل کو ایک طرح کی تسکین دیتی اور اُس تسکین میں کچھ ایسی لذت ہے کہ تم ہزار روکو لاکھ منع کرو۔ زبردستی پکڑ دو۔ اور ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ تک دو مگر ہم نہ باز آئیں گے۔ خدا غریق رحمت کرے ہمارے فطرت شناس شاعر کو جو کہتا ہے۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی   وہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

غالب مرحوم سے پہلے سعی بے حاصل کی لذتوں سے کوئی شاعر نہیں آشنا تھا اور نہ کسی نے بتایا تھا کہ ان مضطربانہ حرکات باس میں کیا مزہ ہے؟ اور رقص بسمل کن جذبات کا نتیجہ ہے؟

ریویو

اسلامک ریویو یہ انگریزی زبان میں وہ ماہانہ رسالہ ہے جسے خواجہ کمال الدین نے تبلیغ اسلام کیلئے انگلستان سے نکالا۔ خواجہ صاحب کی کوششوں سے حقیقت اسلام کے جو معجزات ظاہر ہو رہے ہیں محتاج بیان نہیں ہیں۔ اُن کی جوانمردی اور سچی محبت دین نے انگلستان میں۔ انگلستان ہی نہیں ساری مسیحی دنیا میں۔ بلکہ مسیحیت کے آغوش میں اسلام کی بنیاد قائم کر دی۔ جو کام لاکھوں کروڑوں روپیہ اور صدہا علما کی کوشش سے نہ ہوتا اُسے خواجہ صاحب نے اپنے قناعت کے سرمایے اور اپنی تنہا کوشش سے کر دکھایا۔ اب وقت ہے کہ اُنکی مدد کی جائے اور اُن کا کام بڑے پیمانے پر جاری کیا جائے۔ اگر اب بھی مسلمان نہ چونکیں اور اُن کی اعانت میں جوش نہ دکھائیں تو سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہ کرینگے اور اُن سے کسی قسم کی امید نہیں۔ ایک افسوسناک خیال پیدا کیا گیا تھا کہ خواجہ صاحب احمدی گروہ کے ایک رکن رکین ہیں اور انکی کوششوں کا مآل مرزا صاحب کی امامت و نبوت کا اثبات ہوگا۔ لیکن آج تک خواجہ صاحب نے اپنی ساری تبلیغ میں کبھی کسی ایسے مسئلہ کو نہیں چھیڑا جو عام مسلمانوں میں اور احمدیان میں مختلف فیہ ہو۔ قطع نظر اس کے اب کھل گیا کہ وہ احمدیوں کے اعتدال پسند گروہ میں ہیں جو عام اہل سنت سے زیادہ اختلاف نہیں رکھتا اور ان قادیانی اکسٹریمسٹ لوگوں سے الگ ہیں جن کا خوفناک اصول یہ ہے کہ اپنی مسجد کے سوا ساری دنیا کی مسجدیں ڈھا دو۔ اور اگر فرض کیجیے کہ خواجہ صاحب کی معتدل احمدیت بھی

مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہو تو ہم انھیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتے کہ اصلی اصول اسلام اور اُس کی حقیقی خوبیوں کو چھوڑ کے وہ یورپ کے سامنے ہمارے فریقی اختلافات کو پیش کر کے دین اسلام کو بدنام ہے تمام مسلمانوں کو ناراض۔ اور اپنی تبلیغ کی قوت کو خود ہی کمزور کر دیں گے۔ اور اتنے دنوں میں جو کچھ کیا ہو اُسے اپنی بے عقلی پر قربان کر کے رکھ دیں گے۔

یہ تو اُن مسلمانوں کے لحاظ سے تھا جو احمدیت سے تعصب رکھتے ہیں۔ رہا خود ہمارا خیال وہ تو یہ ہو کہ یورپ کے لوگوں میں خالص دین اسلام کی تبلیغ ہونی چاہیے بلا لحاظ اس کے کہ فرق اسلام کی اندرونی جزئی بحثوں کا خیال کیا جائے۔ اور اگر بالفرض خواجہ صاحب کی طرف سے اس کا اطمینان نہیں ہو تو بھی کوئی مضایقہ نہیں۔ اسلیے کہ ہمارے نزدیک یورپ والوں کا احمدی مسلمان بن جانا لاکھ درجہ بہتر ہو بمقابلہ اس کے کہ وہ تثلیث پرست رہیں۔

اس لیے اسلام کے امرا اور دولت مندوں کا تو یہ فرض ہو کہ خواجہ صاحب کے مشن کی کامیابی کے لیے دریا دلی سے چندہ اور بھاری رقمیں دیں مگر عام تعلیم یافتہ مسلمانوں پر وہ واجب ہو کہ ہر شخص اپنا قومی و مذہبی فرض خیال کر کے ان کے اسلامک انگریزی رسالے اسلامک ریویو کی خریداری کرے جو نہایت ہی عمدہ کاغذ پر چھپتا ہو اور تبلیغی مباحث و مضامین کے ساتھ خواجہ صاحب کی ماہانہ کارگزاریوں کے نتائج سے مطلع کر دیا کرتا ہو۔ قیمت سالانہ صرف ۵ روپیہ ہو۔ اس لیے کہ جتنے رسالے فروخت ہوتے ہیں ان سے زیادہ یورپ کے عیسائیوں میں مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ درخواستیں ماسک (مسجد) ووکنگ۔ انگلینڈ کے پتہ پر خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ یا مولوی محمد صدر الدین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی خدمت میں بھیجی جائیں

دلگداز نمبر جلد
(۱)
اگست
اسرار دربار حرام پور
ناول حسن کا ڈاکو کے سلسلے میں اسرار دربار حرام پور جناب مولانا شرر صاحب تصنیف
فرما رہے ہیں اسکا ایک نیا حصہ ہر دوسرے تیسرے مہینہ شائع ہوجایا کرے گا جو نہایت عجیب
پُر لطف اور مقبول عام ہوگا۔ بالفعل پہلا اور دوسرا نمبر تیار ہے جو دفتر دلگداز سے بحساب فی
نمبر ۸؍ کو مل سکتا ہے۔ شائقین فوراً منگوائیں اور اپنا نام درج رجسٹر کرادیں تاکہ ہر نمبر آیندہ تیار
ہوتے ہی بھیجا جائیں۔ فوراً بعد اطلاع بذریعہ وی پی بھیج دئے جایا کریں
ملتمس منیجر دفتر دلگداز لکھنؤ
موسم آگیا ہے
آپ جاڑے کا سامان تجارت یا اپنے استعمال کیلئے منگانا چاہتے ہیں تو ایک چھوٹا آڈر بھیجکر دیکھیے کیسا
عمدہ کسطرح کفایت سے پہونچتا ہے۔ رضائی لحاف کی فردیں جو شال کو مات کردیں عمدہ کپڑے پر مختلف بیل
بوٹے دار پختہ رنگ لحاف طول ۳ گز عرض ۲ گز ہے عہ معہ رو ہے رضائی کی فردیں نہایت صوفیانہ وضع
طول ۳ گز عرض ۱ گز قیمت عا ہے للعہ صہ فی عدد بچوں کیلئے عہ و عا پلنگ پوش چھار بیدار بوٹیدار طول ۳
گز عرض ۲ گز للعہ و معہ رو عہ چھینٹ مثل جامہ وار کشمیری پختہ رنگ جو سوا لکھنؤ کے دوسری جگہ نہیں
بنتی ایک شیروانی یا کوٹ کو ضرور منگوائیے فی گز عہ صہ تک اونی نگاہ وبند نہایت عمدہ رنگین قیمت عہ عہ
بچوں کے قابل ۸ و ۶ موزے مختلف قسم کام ریشمی فی جوڑ عہ رعہ سوتی موزے ۴ ، ۶ ، ۸ بنیائن مردانہ زنانہ
گلو کھلا دامن دار ہر قسم رنگین و سادہ اونی سوتی عہ سے معہ تک دستانے گرم اونی سوتی رنگین و سادہ ہر قسم
سے ہے تک ریشمی و سوتی ازاربند مردانہ و زنانہ ہدایت کیلئے اس سے زیادہ کوئی سوغات نہیں فی عدد سوتی ریشمی
منیجر برادرس کنول ہار انجنسی ملیح آباد ضلع لکھنؤ
کشمیر جنت نظیر
ایک نئے انداز کا سفرنامہ
مصنفہ مسٹر محمد ظریف ایم۔ اے۔
ملنے کا پتہ۔ راجہ رام دفتری ۲۵ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شررؔ

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس میں چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹڑہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

انگریزی حکومت سے پہلے جب دہلی کا دربار مغلیہ برقرار تھا۔ پھر اس کے بعد لکھنؤ میں جب اودھ کی چند روزہ سلطنت قائم تھی ہمیں بانکوں کا ایک عجیب وغریب گروہ نظر آتا ہے جن کا انجام یہ ہے کہ اب اُن کا کہیں پتہ نہیں اور آغاز یہ تھا کہ تاریخ سے کہیں سراغ نہیں لگتا کہ یہ گروہ کب پیدا ہوا۔ اور اس کی بنیاد کیونکر پڑی۔

ہمارے یہ قومی سپاہی جو "بانکے" کہلاتے تھے اپنی زندگی سپہگری کی نذر کر دیتے۔ سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ ہر وقت پورے اسلحۂ جنگ سے آراستہ اور اوڈی بنے رہتے۔ یکرنگی و یک وضعی کو اپنا شعار جانتے۔ اور اس بات کی دھن تھی کہ ہماری ہی بات سب پر بالا رہے۔ باوجودیکہ وہی مروج و متداول اسلحہ سب کے پاس ہوتے مگر ساتھ ہی ہر ایک اپنی کوئی خاص دھج اور اپنا کوئی مخصوص بانا رکھتا جس کو مرتے دم تک نہ چھوڑتا۔ اور اس کی تاب نہ لا سکتا کہ اس دھج یا شعار کو کوئی اور بھی اختیار کرے۔

پہلے پہل اِن بانکوں کا نام محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سُنا جاتا ہے جو بڑے لفنگ ہراری اور یادگار زمانہ بڑھے بیان کرتے ہیں کہ محمد شاہ کے پاس ایک لشکر بانکوں کا تھا اور ایک زنانوں کا۔ اور نادر شاہ کے مقابلے میں اگر کچھ لڑے تو یہی لوگ لڑے

بانکے جانین دینے پر تلے ہوئے تھے - اور زنانے عورتون کی طرح اوچھی آنکھ کے
کلوار مارتے تھے - اُس زمانے کے بعد جب دہلی اپنے باکمالون اور ہنرمندون کے [illegible]
کی قدر کرنے کے قابل نہ رہی تو اُن کا رخ اودھ کی طرف پھر گیا - اور قدردانی کی
امیدین ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو دہلی چھوڑ چھوڑ کے یہان لانے لگین - اب یہ لوگ فیض آباد
اور لکھنؤ کی سڑکون پر ٹہلتے نظر آتے تھے - مگر یہان زنانے سپہگرون کا تو پتہ نہ تھا
اِن بانکے تھے جن کی روز بروز کثرت ہوتی جاتی تھی -

بادی النظر مین خیال ہوتا ہو کہ تمام بانکون کی ایک سی وضع ہوگی - مگر ایسا
نہ تھا - ان مین سے ہر فرد اپنے بانکپن کو ایک نئے عنوان اور نئی شان سے ظاہر کرتا -
پہلے تمام وضع یہ تھی کہ سر کو چندیا سے گُدی تک مُنڈاتے - اور دونون طرف کے پٹون
مین سے ایک تو کانون تک رہتا - اور دوسرا شانون تک لٹکتا - بلکہ کبھی اُس کی چوٹی
گوندھ کے ایک طرف سینے پر ڈال لی جاتی - اس کے بعد جدتین ہونا شروع ہوئین
اور ہر بانکے نے اپنے لیے کوئی نئی دھج ایجاد کی - کسی صاحب نے ایک طرف کی مونچھ
اس قدر بڑھائی کہ وہ بڑھتے بڑھتے چوٹی سے بوس و کنار کرنے لگی - کسی صاحب نے
پگڑی کا شملہ بجائے پیٹھ کے ایک طرف شانے پر ڈال لیا - کسی صاحب نے پائجامہ کا ایک
پائنچا اس قدر نیچا کر لیا کہ زمین بوس ہو رہا ہو اور دوسرا پائنچا اس قدر اُٹھنگا رکھا کہ آدھی
پنڈلی کھلی ہوئی ہو - کسی صاحب نے لوہے کی ایک بیڑی پاؤن مین ڈال کے
اس کی زنجیر کمر مین اٹکائی - اور اُسے کھڑکاتے ہوئے پھرنے لگے - کسی صاحب نے یہ
ترقی کی کہ بہت سے روپیون مین دونون طرف کنڈے لگا کے اور اُنھین باہم جوڑ کے
ایک نئی قطع کی نقرئی زنجیر بنائی پھر اُس کے دونون سرون پر چاندی کے دو حلقے لگائے -
ایک حلقہ کو ایک طرف کے پاؤن مین ڈال لیا اور دوسرے کو اسی طرف کے بازو مین
پہن کے شانے پر اٹکا لیا - اور نہایت غرور و تمکنت کے ساتھ زنجیر بجاتے ہوئے گھر سے
نکل کھڑے ہوئے - غرض جتنے بانکے تھے اُتنی ہی دھجین تھین - اسی قسم کی جدت
طرازیان اسلحہ کے متعلق تھین - کوئی صاحب دو دھارا تیغا ہاتھ مین رکھتے جو ہر
وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا - کوئی صاحب رستم و نریمان کے زمانے کا
وزنی سلاح گُرز لیے پھرتے - کوئی صاحب تبر کاندھے پر رکھے نظر آتے - اور ساری

دنیا کو اپنی نظر مین ہیچ خیال کرتے۔

اِن لوگون کے باہر نکلنے کی یہ شان تھی کہ تبختر و نخوت کے ٹھاٹھ سے اینٹھتے اور ناز کرتے ہوے چلتے۔ ہر ایک پر کڑوے تیور ڈالتے۔ اور اگر کہین کسی کو دیکھ لیتے کہ اُنھین کا بانا اور شعار اس نے بھی اختیار کر لیا ہے تو بلا تامل ٹوک بیٹھتے۔ اور کہتے "اچھے ہمت آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائین۔ بانا یا تو ہمارا ہی ہو گا یا آپ ہی کا ہو گا"

اس سے زیادہ قیامت یہ تھی کہ ان لوگون کا تبختر ان کا غرور و ناز۔ ان کی چال ڈھال۔ ان کی وضع قطع۔ اور ان کے خط و خال سب چیزون کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آجائے۔ مگر کس کی مجال تھی کہ ان کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے۔ انھون نے کسی کو جھوٹون بھی مسکراتے دیکھا اور فوراً منھ پر ہاتھ جا پڑا۔ پھر اس وقت اگر کوئی ایسے ہی بردبار بانکے ہوے تو اسے خوشامد و آمد کر کے عفو تقصیر کا موقع بھی ملا۔ ورنہ بلا تامل تلوار کھینچ کے جھونک دیا اور اپنی راہ لی۔

یہ مجال نہ تھی کہ کوئی بانکے صاحب کسی صحبت مین ہون اور کوئی اُن کی بات ٹوکے یا اُن پر اعتراض کرے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بڑھ بڑھ کے باتین بناتے۔ لاف زنی کرتے زٹلین اُڑاتے۔ اور جھوٹ کے پُل باندھتے مگر کسی کو جرأت نہ ہو سکتی کہ چون کرے یا مسکرا دے۔ مشہور ہے کہ ایک بانکے صاحب چند مہذب لوگون کی محفل مین کہنے لگے "اُف فلان راجہ کی گڑھی پر جب ہم نے سو آدمیون سے دھاوا کیا ہے تو ہر سپاہی کے گلے مین پانچ پانچ ڈھولین تھین۔ اور ہمارے سو آدمی پان سو ڈھولین بجاتے ہوے چڑھ گئے" اور تو کس کی مجال تھی کہ ایک بانکے کی زبان پکڑے سب خاموش بیٹھے رہے مگر ایک نوجوان کی زبان سے نکل گیا "خیر پانچ ڈھولین تو گلے مین ڈال کے شاید ادوان بے سیدھی طرح چارون طرف پھیلائی ہون۔ مگر ہر آدمی پانچ پانچ ڈھولین کن ہاتھون سے بجاتا ہو گا؟" سنتے ہی بانکے حضرت آگ بگولا ہو گئے تلوار سیدھی کی اور ڈانٹ کے کہا "اون! یہ ہم پہ اعتراض! تو ہم جھوٹے ہوے؟" سب نے کہا "آپ کو جو جھوٹا کہے وہ خود جھوٹا۔ یہ لڑکا بزرگون کی کیا قدر جانے؟ آپ اپنی طرف دیکھین۔"

دُھن کے اس قدر پکے تھے کہ کسی کا دباؤ ہی نہ مانتے۔ یہان تک کہ بعض بعض بہت اعلیٰ درجے کے بانکے بادشاہون اور حکام وقت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

نواب سعادت علی خان کے زمانے مین دہلی کے آئے ہوئے مشہور بانکون مین ایک میرزا جہانگیر بیگ تھے۔ اُن کا نوعمری کا زمانہ تھا۔ باپ نواب صاحب کے درباریون مین تھے۔ جہانگیر بیگ کی شورہ پشتی کی خبر کبھی بارہا سُن کے نواب سعادت علیخان خاموش ہو رہے۔ مگر آخرکار ایک دن بہت برہم ہوئے۔ اور اُن کے والد سے کہا "آپ کے صاحبزادے کی شورہ پشتیان حد سے گزرتی جاتی ہین اور انھون نے سارے شہر مین اُودھم مچا رکھا ہے۔ اُن سے کہہ دیجیے گا کہ اپنے اِس بانکپن پر نہ بھولین۔ ناک نہ کٹوائی ہو تو مین سعادت علی خان نہین" باپ خود ہی بیٹے کی حرکتون سے عاجز تھے عرض کیا "خداوند۔ اُس کی شرارتون سے غلام کا ناک مین دم ہے۔ ہزار سمجھاتا ہون نہین مانتا۔ شاید حضور کی یہ دھمکی سن کے سیدھا ہو جائے" یہ کہہ کے گھر آئے اور بی بی سے کہا "تمھارے صاحبزادے کے ہاتھون زندگی سے عاجز آگیا ہون۔ دیکھئے اُس نالایق کی حرکتون سے ہماری کیا گت بنتی ہے؟ جی چاہتا ہے نوکری چھوڑ دون۔ اور کسی طرف منھ چھپا کے نکل جاؤن" بی بی نے کہا "اے تو کچھ کہو گے بھی؟ آخر ہوا کیا؟" کہا "ہوا یہ کہ آج نواب صاحب بہت ہی برہم بیٹھے تھے میری صورت دیکھتے ہی کہنے لگے اپنے بیٹے سے کہہ دینا کہ مین سعادت علی خان نہین جو ناک نہ کٹوائی ہو" اتنے مین میرزا جہانگیر بیگ جو کہین باہر گئے ہوے تھے گھر مین آگئے۔ مان نے کہا "بیٹا خدا کے لیے اپنی یہ حرکتین چھوڑ دو۔ تمھارے ابا بہت ہی پریشان ہین" میرزا صاحب نے کہا "میرا کچھ قصور بھی بتائیے گا یا خالی الزام ہی دیجیے گا؟" باپ نے کہا "کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے؟ تم نے وہ سر اُٹھا رکھا ہے کہ سارے شہر مین آفت مچ گئی۔ آج نواب صاحب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا مین سعادت علی خان نہین جو ناک نہ کٹوائی ہو" باپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے پیش قبض نکال لی۔ اور خود ہی اپنی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینکدی۔ اور بولے "بس؟ اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہین؟ لیجیے یہ ناک لیجا کے اُنھین دے دیجیے" یہ دیکھتے ہی مان باپ دونون سناٹے مین آگئے۔ اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طریقہ سے نواب صاحب کے سامنے پیش کی اور واقعہ بیان کیا تو وہ بھی دم بخود رہ گئے۔ اور معذرت کرنے لگے کہ

بھی میرا یہ منشا نہ تھا - مین تو سمجھا تھا کہ اس دھمکی سے انھین تنبیہ ہو جائے گی " باپ نے کہا " خداوند ایسا نالائق اور اپنی دُھن کا پکا ہی کہ کسی کا زور ہی نہین چلتا - جیسے جان کا وبال ہیہ عزت آبرو کا اُس کے کون منھ لگے ؟ "

اس واقعہ کے بعد میرزا جہانگیر بیگ ایسے مشہور ہو گئے - اور اب اتنے بڑے زبردست اور سند یافتہ بانکے تھے کہ شہر کے سارے بانکے اُن سے دبتے تھے سیکڑون بانکے اُن کے شاگرد اُن کے حکم کے تابع بے عذر جان بردار اور ان کے جتھے مین بھی شریک تھے جن سے سارا شہر کانپتا تھا - یہان تک کہ ایک مشہور بھانڈ نے نواب سعادت علی خان کے سامنے کوئی گستاخانہ نقل کی تو انھون نے ہنس کے کہا " میرے سامنے تو جو چاہتا ہو کہہ جاتا ہو جب جانون کہ تو میرزا جہانگیر بیگ نکلتے پر کوئی فقرہ تیز کرے " اُس نے عرض کی " خداوند کہہ تو جاؤن گا مگر حضور بچا لینے کا اقرار فرمائین " نواب نے وعدہ کیا - اور اُس کے دو چار روز بعد ایک دن میرزا جہانگیر بیگ پورے اسلحہ لگائے دریا کنارے اپنی نشست مین مونڈھے پر بیٹھے تھے - پچاس ساٹھ شاگردون اور بانکون کا گرد مجمع تھا - کہ وہ بھانڈ ایک لنگ باندھے ہوے دریا سے نکل کے آیا - اس کی صورت دیکھتے ہی میرزا جہانگیر بیگ نے کہا " اخاہ تم ہو ! اچھے تو رہے " یہ سنتے ہی وہ آداب بجا لایا - سامنے آکے زمین پر بیٹھ گیا - اور اُن کے چہرے کی طرف ہاتھ اُٹھا کے کہنے لگا " خداوند - اتنی کٹ گئی - اور یہ جو رہی ہو یہ بھی کٹ جائیگی ! " بھانڈ کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی میرزا جہانگیر بیگ کو ایسا طیش آیا کہ مارے غصہ کے اس قدر کانپے کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ پڑی - اور وہ بے تحاشا بھاگ کے پانی مین کود پڑا - دو چار غوطے لگائے - اور پانی ہی پانی کسی طرف نکل گیا - اب میرزا صاحب کے جتھے کے لوگ ڈھونڈھتے پھرتے تھے کہ کہین ملے تو حرامزادے کو مار ڈالین - آخر ایک دن نواب سعادت علی خان نے اُسے میرزا جہانگیر بیگ کے قدمون پر گرا کے کہا بھئی اس کی بات کا بُرا ماننا ہی کیا ؟ یہ تو مجھے بھی کہہ جاتا ہی " اور اُس کا قصور معاف کروا دیا -

شاہی کے آخر زمانے تک اِن لوگون کا بڑا زور رہا - اور بانکپن مین کچھ ایسی امتیاز کی صورتین تھین کہ اکثر شریف زادے خصوصاً وہ جنھین سپہ گری کا شوق ہوتا بانکے بن جاتے - اور اپنی کوئی خاص دھج بنا لیتے - اگر قاعدے اور سلطنت کی

قوت کے ساتھ کوئی ایسا گروہ موجود ہوتا تو در اصل یہ لوگ سلطنت کے قوت بازو ثابت
ہوتے۔ اور اُن کی ذات سے قوم و ملک کو بڑا نفع پہونچتا۔ لیکن بدنصیبی سے جن دنون
بانکون کا گروہ پیدا ہوا ہے دہلی و لکھنؤ کی دونون سلطنتین نہایت کمزور اور عجیب غیر
منتظم حالت مین تھین۔ اور یہی بانکے جو مایہ ناز اور ذریعہ عروج ہو سکتے تھے اُن
کے لیے باعث زوال بن گئے۔ سلطنت اُن کو دبا سکتی تھی۔ اور اُن کی خود
سری و سرکشی سے آئے دن شہر کے گلی کوچون مین خانہ جنگیان ہوا کرتی
تھین جن لوگون کو اُن کے ہاتھ سے آزار پہونچتا سلطنت اُن کی دادرسی نہ کر سکتی
اور انھون نے اپنے ایسے ایسے جتھے بنا لیے تھے کہ بڑے بڑے رسالدارون کو بھی
اُن سے دب جانا پڑتا تھا۔

ان مین باوجود احمقانہ تہور و غرور کے یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان کے بلکہ
شاید ساری اگلی دنیا کے کج خلق سپہگرون کے خلاف یہ نہایت ہی مہذب سپاہی
تھے۔ اور اُن لوازم اخلاق کو جو دو مہذب و شائستہ دوستون مین ہوا کرتے
ہین اپنے حریف کے ساتھ برتتے تھے۔ کسی ادنی درجے کے سپاہی سے لڑنا اور
مقابلہ کرنا اپنی شان و وضع کے خلاف اور موجب توہین تصور کرتے۔ شریف حریف
سے لڑتے اور پھر اُس کے ساتھ شرفا کا سا برتاؤ بھی کرتے۔ اکثر یہ ہوا کہ دو بانکون مین
لڑائی ہوئی۔ اور لڑائی مین بھی دونون کو اس کا لحاظ ہے کہ کوئی بات حریف کی عزت
و حرمت یا مرضی و شان کے خلاف نہ ہونے پائے۔ ایک کہتا دوسرے آپ
وار کرین۔ دوسرا کہتا وہ نہین پہلے آپ۔ یہ نہین ہو سکتا۔ اور جب کوئی کمزور
ہو جاتا تو فوراً لڑائی سے ہاتھ روک لیتے۔ اور پھر اُس کے حق مین ان سے زیادہ کوئی
ہمدرد نہ تھا۔ دنیا مین اس کے نہایت ہی سچے ہمدرد ہوتے تھے۔ اگر وہ اپنے پاؤن سے
جانے کے قابل ہوتا تو اُس کے گھر تک اُس کی مشایعت کرتے۔ راستے مین بسا اوقات یہ
واقعہ پیش آتا کہ یہ کہتے آپ آگے چلیے اور وہ کہتا آپ آگے چلیے۔ بعض بانکون
کے واقعات مین مشہور ہے کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اس کے گھر تک پہونچانے گئے
اور وہان سے چلے تو حریف دوست نے کہا تو کیا آپ تنہا جائین گے؟ یہ نہین ہو سکتا
وہ انھین ان کے گھر تک پہونچانے کو آیا۔ اور جب وہ پہونچا کے چلا تو اخلاقاً

پھر اُن کے ساتھ ہو لیے۔ اسی اخلاق میں ترقی ہو گئی کہ جب اُس کے گھر پہونچتے ہیں تو وہ اِن کی مشایعت کے لیے اِن کے ساتھ ہو لیتا ہے اور جب وہ اِن کے گھر پہونچتا ہے تو یہ اُس کی مشایعت کے لیے اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔

اکثر بانکوں کی یہ وضع تھی کہ شربتی کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بزدلی اور نامردی خیال کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا پڑتا تو اُس کی تلوار گویا ننگے سینے پر لیتے۔ چرکے پہ چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔ اسی طرح جاڑوں کا جاڑا اُسی شربتی کے انگرکھے پر گزرتا اور مجال کیا کہ کانپیں تھرتھرائیں یا زبان سے "سو سو" کی آواز نکلے۔ بعض اس پر بھی یہ قیامت کرتے کہ اُس باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جو جو سردی معلوم ہوتی اور اکڑتے جاتے۔

اِن کی آخر زمانے کی عام وضع قطع دکھانے کے لیے ہم ایک بانکے صاحب کی صورت اپنے ناظرین کو دکھائے دیتے ہیں جنھیں خوش نصیبی سے ہم نے اپنے بچپن میں غدر کے تیرہ چودہ برس بعد مٹیا برج (کلکتہ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ صاحب عہد شاہی کے باقیات الصالحات میں سے تھے۔ غدر میں جا بجا لڑے۔ جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو ہتھیار پھینک کے بہت دنوں تک اِدھر اُدھر چھپتے پھرے۔ اور آخر جب پریشان ہوئے تو کلکتہ میں آئے کہ واجد علی شاہ کے ظل عاطفت میں باقی ماندہ زندگی بسر کریں۔ ان سے اگرچہ ہتھیار چھین گئے تھے مگر وضع نہیں بدلی تھی۔ یہ ایک کشیدہ قامت دُبلے چھریرے آدمی تھے پیشانی سے گُدّی تک بیچ میں سر منڈا ہوا تھا۔ ایک پٹا بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اور دونوں دو پلڑی ٹوپی اور پگڑی کے نیچے نکلے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی چڑھی تھی۔ اور مونچھیں ہمیشہ کھڑی رہتیں۔ بدن میں کھنچا ہوا چست نیچے دامنوں کا انگرکھا تھا۔ ٹانگوں میں عورتوں کا سا لمبے پائنچوں کا کلیوں دار پائجامہ پیٹھ پر مثلث وضع کا رومال اوڑھے رہتے۔ ہاتھ میں ہر وقت ایک پنکھا رہتا۔ اور لکھنؤ کا خوردنوکا جوتا پاؤں میں تھا۔ مگر یکرنگی کا سب سے زیادہ نمایاں ثبوت یہ تھا کہ یہ سب کپڑے چھینٹ کے۔ اور ایک ہی قسم کی چھینٹ کے تھے جس چھینٹ کا انگرکھا تھا اُسی کی ٹوپی تھی اُسی کی پگڑی تھی۔ اُسی کا رومال پیٹھ پر تھا۔ اُسی کا پائجامہ تھا

اُسی کا پنکھا تھا - اور وہی چھینٹ جوتے کے بیرونی رُخ پر بھی منڈھی ہوئی تھی - ہم یہ نہین کہہ سکتے کہ سارے بانکون کی یہی وضع تھی - ممکن ہو کہ انھین بزرگ نے خاص اپنی یہ دھج رکھی ہو -

مٹیا برج مین چند روز یہ اسی وضع مین رہے - جدھر سے نکل جاتے اُنگلیان اُٹھنے لگتین - اور لوگ گھبرا گھبرا کے اِن کی صورت دیکھتے - اور ہنستے - اب انگریزی مین یہ تو مجال نہ تھی کہ کسی کو ہنسنے پر ٹوکین - وہ جو مثل مشہور ہو کہ "دبی بلی چوہون سے کان کٹاتی ہو" یہ بیچارے خود ہی نظر نیچی کر لیتے - اور کوئی چاہے کچھ کہے یا کچھ کرے یہ اپنی آنکھین جھکائے چلے جاتے - مگر باوجود اس کے اکڑ اور تیور دن کا وہی حال تھا - کسی محفل مین بیٹھ کے باتین کرتے تو معلوم ہوتا کہ ساری صحبت پر حکومت کر رہے ہین اور کسی کی اپنے سامنے کچھ ہستی نہین سمجھتے - جب واجد علی شاہ کا سامنا ہوا تو بادشاہ نے کہا بھئی چھوٹے خان (یہی اِن بانکے صاحب کا نام تھا) اب زمانہ بدل گیا دنیا بدل گئی - نہ وہ ہم رہے - نہ وہ تم رہے - اس لیے جس طرح ہماری وضع بدل گئی ویسے ہی اب تم بھی اپنی وضع بدل دو" عرض کیا "خداوندا اب تھوڑی سی رہ گئی ہو اسے اسی وضع مین گزر جانے دیجیے" بادشاہ نے کہا "نہین تمھین میرے سر کی قسم اب وضع بدل دو - اور سمجھو کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا" یہ کہہ کے بادشاہ نے ایک خواص کو اشارہ کیا جس نے ایک دوشالہ لا کے اُڑھا دیا - جب دوسری وضع کا کپڑا اُڑھا ہی دیا گیا تو مجبور ہو گئے - آداب بجا لا کے وہ دوشالہ لے لیا - اور گھر آئے - پھر اس کے بعد جو گھر سے نکلے تو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے -

چند سال کے بعد انھون نے مٹیا برج ہی مین انتقال کیا - اور ہم سمجھا ہون کہ اُن کی موت پر نہین بلکہ اُن کے وضع بدلنے ہی پر پرانے بانکون کا خاتمہ ہو گیا -

اس مین شک نہین کہ جب شریف زادون اور عام سپہ گرون مین بانکے بننے کا شوق بڑھا - ادنی واعلی ہر گروہ مین بانکے پیدا ہونے لگے - اور شہر مین بانکون کی کثرت ہوئی تو بہت سے ایسے بانکے بھی نظر آنے لگے جن مین نہ ویسی شرافت تھی اور نہ ویسی شجاعت - اور جب موقع پڑتا اُن کی کمزوری کھل جاتی - لیکن اصلی بانکپن ملک وقوم کا ایک بہت ہی اعلی درجے کا شریفانہ جوہر تھا - مسلمانون کے

سوا آخر ایام مین بہت سے ہندوؤن سے بھی ظاہر ہوا۔ اس اصلی جوہر کا ہندوستان سے مٹ جانا اُس کی تاریخ کا ایک حسرتناک ورق ہو۔

ہمین اس سے انکار نہین ہو کہ بانکون کی کثرت اور ہتھیارون کے بے روک اور بے ضرورت استعمال نے ملک کے امن و امان مین فرق ڈال دیا تھا۔ شہر مین روز خانہ جنگیان ہوتین۔ اور اکثر رہ گذرون پر لاشین پھڑکتی نظر آتین۔ یہی نہین بلکہ روز بروز ثابت ہوتا جاتا کہ بانکے سپہگر خانہ جنگیون اور باہمی جدال و قتال مین جس قدر زیادہ باکمال اور شجاع ہین اُسی قدر غنیم کے حملے روکنے اور میدان جنگ مین ابناے وطن کے ساتھ شریک ہو کے لڑنے مین ناقص و ناکارہ ہین۔ لیکن اس پر بھی ہم کہتے ہین کہ یہ گروہ مٹنے کے قابل نہ تھا۔ اور مٹانے کی نہین بلکہ اُنھین کے باضابطہ بنانے کی ضرورت تھی۔

یورپ مین بھی ہمین قدیم الایام مین بانکون کا ایک گروہ نظر آتا ہو جو نائٹ کہلاتے تھے۔ موجودہ یورپ کے اعلیٰ دربارون سے فی الحال معزز لوگون کو جو نائٹ کا خطاب ملا کرتا ہے یہ اُسی پرانے فنا شدہ گروہ کی یادگار ہی۔ ہم ان مغرب کے بانکون کا حال آیندہ نمبر مین بیان کرین گے۔

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر ۱۲۷۲ھ ہجری (۱۸۵۶ء) مین لکھنؤ چھوڑ کے کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے معاملہ مین باضابطہ پیروی کرین۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہونچ کے مقدمہ کو پارلیمنٹ اور ملکۂ انگلستان کے سامنے پیش کر دین۔ چنانچہ جب کلکتہ مین کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصد کیا۔ مگر اطبا نے بحری سفر کو بادشاہ کے لیے مضر تجویز کیا۔ اور مشیرون نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتہ ہی مین ٹھہر گیے۔ مگر اپنی مان اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر

مین میرے نانا منشی قمرالدین صاحب مرحوم بھی اس خانمان برباد شاہی قافلہ کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ تنخواہ لینے سے انکار تھا۔ اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تخت وتاج ہی لین گے جو بے قصور چھینا گیا ہے۔

بادشاہ کلکتہ مین تھے۔ اُن کا خاندان لندن مین تھا۔ اور معاملہ زیر غور تھا کہ یکایک کارتوسون کے جھگڑے اور گورنمنٹ کی ضد نے سنہ ۱۲۷۳ ہجری (سنہ ۱۸۵۷ء) مین غدر پیدا کرا دیا۔ اور میرٹھ سے بنگالہ تک ایک ایسی آگ لگی کہ اپنے پرائے سب کے گھر جل اُٹھے۔ اور ایسا فتنۂ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان مین برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی۔ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی مین جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی سنہ ۱۸۵۷ء مین جوش وخروش کے ساتھ لکھنؤ پہونچے اُن کے آتے ہی یہان کے بھی بہت سے بیفکرے اُٹھ کھڑے ہوے۔ اور شاہی خاندان اودھ کا اور کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُن کی ماں نواب حضرت محل سلطنت کی مختار کل بنین۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہان موجود تھی اور اُس کے ساتھ یہان کے تمام یوروپین عہدہ داران مملکت جو باغیون کے ہاتھ سے جان بر ہو سکے بیلی گارد مین قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیون کے پہونچنے سے پہلے ہی دھس بنا لیے گئے تھے۔ اور حفاظت و بسر کا کافی بند وبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا یا یہ کہیے قسمت اچھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ اور اُن کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا اور اودھ کے پریشان بختون کو ذرا پنپنے کے لیے مٹیا برج کے دربار کا جو ایک عارضی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔

اب لکھنؤ مین انگریزون کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقدار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے۔ اور اُن مین شہر کے بہت سے اوباشون اور ہر طبقہ کے لوگون کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزون پر ایک خدائی کا نرغہ ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کنندون مین سوا اوباش اہل شہر اور بے اصول وخود سر مدعیان شجاعت کے

ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصول جنگ سے واقف ہو۔ اور تمام منتشر قوتون کو یکجا کرکے ایک باضابطہ فوج بنا سکے۔ بخلاف اس کے انگریز اپنی جان پر کھیل کے اپنی حفاظت کرتے۔ اور سر ہتھیلی پر رکھ کے حملہ آورون کو روکتے تھے۔ اور جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ مین برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ عہدہ داران سلطنت مقرر ہوئے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی۔ اور صرف تفنن طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہین۔ وہ سپاہیون کی نہایت قدر کرتی اور اُن کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھین۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کرین۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور مین تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہورا ہے۔ اصلی حاکم ہم ہین۔ اور جس کے سر پر ہم تاج رکھ دین وہی بادشاہ ہو جائے۔ احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیون کے ساتھ آئے تھے۔ اور کئی معرکون مین لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے۔ بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی مین ایک اُن کا دربار الگ قائم تھا اور دونون دربارون مین پولٹیکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایان ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب مین رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے مین برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ ہی سات مہینہ ہوئے تھے کہ انگریزی فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کیلیے آ گئی۔ جس کے ساتھ پنجاب کے سکھ اور ہندوستان کے پہاڑی بھی تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اُنھین لوگون نے زیادہ مظالم کیے۔ دو ہی تین دن کی گولہ باری مین نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا کاغذ کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا۔ ہزارہا مفرورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگے۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ کے اگرچہ برجیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے

شکست کھا کے بھاگے۔ باڑی اور محمدی ہوتے ہوئے پوائین مین پہونچے۔ وہان کسی نے گولی مار دی۔ پوائین کے راجہ نے سرکاٹ کے انگریزون کے پاس بھیجا اور صلہ مین انعام و جاگیر پائی۔

آبادی کو باغیون سے صاف کرنے کے لیے انگریزون نے شہر مین سخت گولہ باری کی۔ ساری رعایا گھبرا اُٹھی۔ زن و مرد گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے۔ اور ایک ایسی قیامت بپا ہوگئی کہ جن لوگون نے دیکھا ہے آج تک یاد کرکے کانپ اُٹھتے ہین۔ محلون کی بیٹھنے والیان جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی برہنہ پا جنگلون کی خاک چھانتی پھرتی تھین۔ بیکسی مین ایک ایک کا دامن پکڑتی تھین۔ اور جو ملتا تھا دشمن ہی ملتا تھا۔ اور سعدی کا یہ مصرع پوری طرح صادق آرہا تھا کہ "یاران فراموش کردند عشق"۔ اِسی حالت مین فتح یاب فوج نے شہر کو لُوٹا۔ اور بعد خرابی بصرہ خدا خدا کرکے لوگون کو پھر اپنے گھرون مین آنے کی اجازت ملی۔ اب ایک تہلکہ کے بعد جو امن قائم ہوا تھا وہ بفضلہ تعالی آج تک قائم اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ لیکن پُرانی دولت کے وابستگان دامن اور امرا اے شاہی جو انقلاب سلطنت کے بعد بالکل بیکار ہوگئے اور نئی سلطنت سے فائدہ اُٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے مٹتے ہی چلے گئے۔ چنانچہ بڑے بڑے دولت مند اور معزز گھرانون کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا۔ محلے کے محلے اُجڑتے چلے جاتے تھے۔ اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا۔ اور اکثر کو یقین ہوگیا تھا کہ چندروز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی نہ باقی رہے گا۔ لیکن انجام مین سرکار انگریزی کی وہ تدبیرین جنھون نے ساری دنیا مین انگریزون کی نو آبادیان قائم کرادی ہین غالب آئین اور لکھنؤ حوادث زمانہ کی دست برد سے بچ کے پنپا۔ جن کو مٹنا تھا مٹ گئے۔ اور جو باقی رہے سنبھلنے کے قابل ہوگئے۔ اور اگر مسٹر بٹلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو امید ہے کہ آیندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اِسی سلسلۂ واقعات مین ہم واجد علیشاہ کی باقیماندہ زندگی اور اُن کے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے

سامنے پیش کر دین - کیونکہ بغیر اس کے اس تاریخ کا تکملہ نہین ہو سکتا - کلکتہ مین خود ہمارا بچپن بادشاہ کے ظل حمایت مین بسر ہوا ہے - اور گذشتہ واقعات کے حالات اگر ہم نے لوگون سے سُن کے اور اوراق تاریخ مین پڑھ کے بیان کیے ہین تو آئندہ چشم دید حالات بیان کرین گے -

کلکتہ سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف دریاے بھاگا رتی (ہوگلی) کے کنارے گارڈن ریچ نام ایک خاموش محلہ ہے اور چونکہ وہان ایک مٹی کا تودہ سا تھا اس لیے عام لوگ اُسے مٹیا برج کہتے تھے یہان کئی عالیشان کوٹھیان تھین جن کی زمین دریا کے کنارے کنارے تقریبًا دو ڈھائی میل تک چلی گئی تھی - جب واجد علیشاہ کلکتہ مین پہونچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیان اُنھین دے دین - دو خاص بادشاہ کے رہنے کے لیے ایک نواب خاص محل کے واسطے اور ایک علی نقی خان کی سکونت کے لیے جو بادشاہ کے ساتھ تھے - اور اُن کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض مین دریا کنارے سے تقریبًا میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہوگا بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا میونسپلٹی کی سڑک اِس رقبہ کو طولاً قطع کرتی تھی - وہ دو کوٹھیان جو بادشاہ کو دی گئی تھین اُن کے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور اسد منزل قرار دیے - اور نواب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام مرصع منزل رکھا - اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک اُنھین کے قبضہ مین اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصًا نواب اختر محل کے قبضہ مین رہی جو علی نقی خان کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش بخت بہادر کی ماں تھین -

غدر کے زمانے مین انگریزی فوج کے بعض باغی افسرون نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ اُن کے حکمران بنین تو وہ کلکتہ مین بھی غدر کر دین - مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے معاملہ مین جو روش نہ تخت و تاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی اور نہ اب پسند کی - بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگون کے ارادے کی اطلاع کر دی - جس پر اُن کا شکریہ ادا کیا گیا - مگر دو ہی چار روز بعد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو قلعۂ فورٹ ولیم مین رکھا جائے تاکہ پھر کبھی باغیون کی اُن تک

رسائی نہ ہو سکے۔ لندن مین اُن کی جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعوی ہے وہ اب ہمارے قبضہ ہی مین نہین جب اُس پر ہم دولت برطانیہ کا قبضہ ہو لے گا تب دیکھا جائے گا۔

بادشاہ اس حراست ہی مین تھے کہ لکھنؤ کا غدر فرو ہو گیا۔ اور مسیح الدین خان نے جو لندن مین بادشاہ کے مختار عام تھے پھر اپنا دعوی پیش کیا۔ اُنھین بادی النظر مین کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی۔ مگر بدقسمتی سے اُن لوگون مین جو قلعہ مین بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے خواہ کسی بیرونی تحریک سے یا خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی اُن لوگون نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خان مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائین گے۔ لہذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ ”جہان پناہ بھلا کبھی کسی نے ملک لے کے دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے مین ڈال رکھا ہے۔ ہونا ہوانا کچھ نہین ہے۔ اور جہان پناہ مفت مین تکلیف اُٹھا رہے ہین۔ ڈیڑھ دو سال سے تنخواہ نہین لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے۔ اور ہم ملازمان دولت بھی پیسہ پیسہ کو محتاج ہین۔ مناسب یہی ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویزون کو قبول کر لین۔ اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات اور آستان بوسان دولت کے ساتھ بسر فرمائین“۔ بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی۔ اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ مصاحبون نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو بلا تکلف حضور ویسرائے کی خدمت مین لکھ بھیجا ”مجھے سرکار انگریزی کی مجوّزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے۔ اور مقدمہ جو لندن مین دائر ہے خارج کیا جائے“۔ جواب ملا ”اب آپ کو اول تو گذشتہ ایام کی ماہو[illegible] نہ دی جائے گی۔ صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہو گی۔ دوسرے فقط بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیے جائین گے۔ اور جو تین لاکھ روپیہ سال آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے اب اُن کے دینے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی“۔

بظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے مگر مصاحبون نے

اس پر بھی راضی کر دیا - اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان مین اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا - لہذا اُن کا مقدمہ خارج کیا جائے - یہ واقعات مین نے خود اپنے نانا منشی قمرالدین صاحب کی زبان سے سُنے ہین جو جناب عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میر منشی اور مولوی مسیح الدین خان کے نائب خاص تھے - اور کل کارروائیان انھین کے ہاتھ سے عمل مین آتی تھین - بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن مین پہونچی مسیح الدین خان سخت بدحواس ہو جانے رہے - بادشاہ کی مان - اُن کے بھائی اور ولیعہد نے سر پیٹ لیا اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا - افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک مین ملا جاتا ہے - آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی - اور پارلیمنٹ مین یہ قانونی عذر پیش کیا کہ "بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست مین ہین اور ایسی حالت مین اُن کی کوئی تحریر پایۂ اعتبار کو نہین پہونچ سکتی" عذر معقول تھا تسلیم کیا گیا - اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذر داری سے مطلع کر دیا گیا - ساتھ مین مسیح الدین خان اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ "یہ آپ کیا غضب کر رہے ہین - ہمین ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری اُمید ہے" اب عذر فرو ہو چکا تھا - گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا - اور وہ خوشی خوشی قلعہ سے نکل کے مٹیا برج مین آ گئے - اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبون نے عرض کیا "حضور مسیح الدین خان لندن مین کہہ رہے ہین کہ جہان پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ نے برافروختہ ہو کے اُسی وقت لکھ بھیجا کہ "ہم نے آزادی سے برضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کیا ہے - اور مسیح الدین خان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید مین ہونے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے - لہذا آیندہ کے لیے ہم اُس مختار نامے ہی کو منسوخ کیے دیتے ہین جس کی رُو سے وہ ہمارے مختار عام بنائے گئے ہین"

اب کیا تھا؟ ساری کاروائی ختم ہو گئی - بادشاہ مٹیا برج مین رنگ رلیان منانے لگے - مصاحبون کے گھر مین ہُن برسنے لگا - اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو

انگلستان مین پڑا ہوا تھا۔قریب قریب وہین تباہ ہوگیا۔اکثر ہمراہیون نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی ماں جناب عالیہ اس صدمے سے بیمار ہوگئین۔اور اُسی بیماری مین چلیں کہ ملک فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ مین جائین۔اور اُن کی زیارت سے شرفیاب ہوکے کلکتہ پہونچین۔مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ بڑھانے دیا۔وہین انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانۂ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانون کا ایک قبرستان ہی اُسی مین دفن ہوئین۔مرزا اسکندر حشمت کو ماں کے مرنے کا اِس قدر صدمہ ہوا کہ ماں کے مرتے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔اور ماں کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی ماں کے برابر یوم جزا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔اکیلے مرزا ولی عہد بہادر کلکتہ واپس آکے ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہین کہ ابتدائے مٹیا برج مین بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی تھی۔یہ حالت دیکھ کے گرد و پیش کے لوگون نے چند آلات موسیقی فراہم کر دیے۔اور سرود مستان یاد دہانیدن کا پورا پورا مضمون صادق آگیا۔اور ارباب نشاط کا گروہ وہان بھی جمع ہونے لگا۔ہندوستان کے اچھے اچھے گوّیے آکے ملازم ہوئے۔اور مٹیا برج مین موسیقی دانون کا ایسا مجمع ہوگیا تھا کہ اور کسی جگہ نہ تھا۔

خوبصورت عورتون کے جمع کرنے اور حسن و عشق کے کرشمون مین پھنسے رہنے کا وہان بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا کہ لکھنؤ مین سُنا جاتا ہے۔مگر مٹیا برج مین اس شوق مین مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔بادشاہ شیعہ تھے۔اور شیعون کی شرع مین متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔اِس مذہبی آزادی سے فائدہ اُٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے اور قاعدہ تھا کہ غیر ممتوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے۔یہ احتیاط اِس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان بہشتن جو بادشاہ کے سامنے زنانے مین پانی لاتی اُس سے بھی متعہ کر کے اُسے نواب آبرسان بیگم کا خطاب دے دیا۔ ایک جوان خاکروبن جس کی حضوری مین آمد و رفت رہتی وہ بھی ممتوعات مین داخل ہو کے نواب مصفا بیگم کے خطاب سے سرفراز ہوئی۔اِسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا۔شاید شاذ و نادر ہی اِس کا اتفاق ہوا ہوگا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا مجرا دیکھا ہو۔خود ممتوعات کی مختلف

پارٹیان بنا دی گئی تھین جن کو مختلف طرز پر رقص و سرود کی تعلیمین دی جاتین - ایک رادھا منزل والیان - ایک سارادھا منزل والیان - ایک جھومر والیان - ایک نکھٹ والیان ایک تھر والیان - ایک گھونگھٹ والیان - ایک رہس والیان - ایک نقل والیان - اور اسی طرح کے بیسیون گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی - اور انھین کے ناچ گانے مین اُن کا دل بہلتا اِن سب سے متعہ ہو گیا تھا - بیگمین کہلاتی تھین اور دو ایک گروہون مین اگرچند کمسن و نابالغ لڑکیان غیر ممتوعہ تھین تو اس لیے تھین کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کر لی جائین گی - ان مین سے اکثر خود بادشاہ کے قریب خاص سلطان خانہ مین رہتین - اور بعض کو دوسری کوٹھیون مین جدا محلسرائین ملی تھین - اِن ممتوعات مین سے جو صاحب اولاد ہو جاتین اُن کو محل کا خطاب دیا جاتا - رہنے کو جداگانہ محلسرا ملتی - اور اُن کی تنخواہ اور عزت بڑھ جاتی -

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتون سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے - نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی - تیسون روزے رکھتے تھے - افیون - شراب - فلک سیر - یا اور کسی قسم کے نشہ سے زندگی بھر احتراز رہا - اور محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے -

تیسرا شوق اُنھین عمارت کا تھا - سلطانخانہ کے گرد بیسیون محلسرائین تعمیر ہو گئین اور بہت سی کوٹھیان اور اُن مین محلسرائین نہین - گورنمنٹ سے صرف سلطانخانہ اسد منزل اور مرصع منزل ملی تھین - مگر بادشاہ کے شوق نے چند ہی روز مین بیسیون کوٹھیان تعمیر کرا دین جن کے گرد نہایت ہی پُر فضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے - جس وقت مین نے دیکھا ہی بادشاہ کے قبضہ مین مندرجۂ ذیل عالیشان کوٹھیان تھین جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی تھین - سلطان خانہ - قیصر البیضا - گوشۂ سلطانی - شہنشاہ منزل - مرصع منزل - اسد منزل - شاہ منزل - نور منزل - تفریح بخش - بادامی - آسمانی - تہنیت منزل - حد سلطانی - سد سلطانی - عدالت منزل ان کے علاوہ اور بھی کئی کوٹھیان تھین جن کے مجھے نام نہین یاد رہے -

ان کے اسوا باغون کے اندر اور تالابون کے کنارے بہت سے کمرے بنگلے

اور چھوٹی چھوٹی کوٹھیان تھین۔ ان تمام کوٹھیون۔ متفرق کمرون بنگلون اور کوٹھون
مین صاف ستھرا پرتکلف فرش بچھا رہتا۔ چاندی کے پلنگ چھپرکھٹون اور تکیون
سے مکمل لگے رہتے۔ تصویرین اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا اور [illegible]
کے خیال سے ضرورت سے زیادہ مکاندار مقرر تھے جو ہر روز جھاڑتے اور
ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے۔ غرض ہر کوٹھی بجائے خود
اِس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان عش عش کر جاتا۔ کوٹھیون کے
گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبون اور اقلیدسی شکلون کے مطابق
بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والون کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا۔

لکھنؤ مین تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اُس کے پاس کی چند
عمارتین یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا۔ مگر مٹیا برج
مین نفیس اور اعلی عمارتون کا ایک خوبصورت شہر بسا دیا تھا۔ دریا کے
اُس پار مٹیا برج کے عین مقابل کلکتہ کا مشہور بوٹینکل گارڈن ہے۔ مگر وہ
مٹیا برج کی دنیوی جنت اور اُس کے دلکش نباتات کے سامنے مات کیا
تھا۔ ان تمام عمارتون۔ چمنون۔ کنجون۔ اور دلکش تر و تازہ مرغزارون کے
گرد بلند دیوارون کا احاطہ تھا۔ مگر میونسپلٹی کی شاہراہ عام کے کنارے
کنارے تقریباً ایک میل تک شاندار دکانین بنی ہوئی تھین اور اُن سے ایک بہت بڑا
بارونق بازار قائم ہو گیا تھا۔ اُن کی پشت پر اندر بھی دکانین تھین مگر اُن مین
وہی ادنے درجے کے ملازم رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ
سے وہان رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر اندر جانے کا راستہ سوا پھاٹکون کے
جن پر پہرہ رہتا کسی دکان مین سے نہین رکھا گیا تھا۔ خاص سلطان خانے کے
پھاٹک پر نہایت عالیشان نوبت خانہ تھا۔ نقارچی نوبت بجاتے۔ اور پرانے
پہرون اور گھڑیون ہی کے حساب سے شب و روز گھڑیال بجا کرتا۔

دنیا مین عمارت کے شوقین ہزارون بادشاہ گزرے ہین۔ مگر
غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتین اور اتنے باغ نہ بنوائے
ہون گے جتنے کہ واجد علی شاہ نے اپنی ایام زندگی اور برائے نام شاہی

کے مختصر زمانے مین بنائے۔ شاہجہان کے بعد اس بارہ خاص مین اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہو تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہو کہ کسی کی کوئی خاص عمارت سیکڑون ہزار ون سال تک باقی رہی اور کسی کی صدہا عمارتین زمانے نے چند ہی روز مین مٹا کے رکھ دین۔

عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانورون کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی اُنھون نے اِس درجہ تک پہونچا دیا کہ دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخص کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہونچ سکی ہوگی۔

نور منزل کے سامنے خوشنما آہنی کٹھرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا جس مین صدہا چیتل۔ ہرن۔ اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگ مرمر کا ایک پختہ تالاب تھا جو ہر وقت ملبّب رہتا۔ اور اُس مین۔ شترمرغ۔ کشوری۔ فیل مرغ۔ سارس۔ قازین۔ بگلے قرقرے۔ ہنس۔ مور۔ چکور۔ اور صدہا قسم کے طیور اور کچھوے چھوڑ دیے گئے تھے صفائی کا اِس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا ہو کہین ذرا کسی جانور کا پر بھی نظر آ جائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کٹھرون مین شیر تھے۔ اور اس رمنہ کے پاس ہی سے لکڑی کے سلاخون دار بڑے بڑے خانون کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس مین بیسیون طرح کے اور خدا جانے کہان کہان کے بندر لا کے جمع کیے گئے تھے جو عجیب عجیب حرکتین کرتے اور انسان کو بغیر اپنا تماشا دکھائے آگے نہ بڑھنے دیتے۔

مختلف جگہ حوضون مین مچھلیان پالی گئی تھین جو اشارے پر جمع ہو جاتین اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اچھل کود سے خوب بہار دکھاتین۔ سب پر طرہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گہرا حوض قائم کر کے اور اُس کے کنارون کو چارون طرف سے خوب چکنا کر کے اور آگے کی طرف جھکا کے اُس کے بیچ مین ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑون نالیان ڈالی گئی تھین۔ اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ مین ہزارون بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے۔

جو برابر دوڑتے اور رینگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے۔ اور پھر نیچے اُتر آتے مینڈکین چھوڑی جاتین۔ اُنھین دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گرداگرد نہر کی شکل سے ایک نالی تھی۔ اُس مین سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکون کا تعاقب کرتے اور لوگ بغیر کسی خوف کے پاس کھڑے سیر دیکھا کرتے۔ اِس پہاڑ کے نیچے بھی دو کٹہرے تھے جن مین دو بڑی بڑی چیتین رکھی گئی تھین۔ یون تو خاموش پڑی رہتین۔ لیکن جس وقت مرغ لا کے چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتین اور مسلم نگل جاتین۔ سانپون کے رکھنے کا انتظام اِس سے پہلے شاید کہین نہ کیا گیا ہوگا۔ اور یہ خاص واجد علیشاہ کی ایجاد تھی۔ جس کو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے اور اِس کی تصویرین بہ مشرح کیفیت قلم بند کر لے جاتے تھے۔

مذکورہ جانورون کے علاوہ ہزارہا طیور کے چہکتے ہوئے پنجرے بھی جو خاص سلطان خانے کے اندر تھے۔ بیسیون بڑے بڑے ہال تھے جو لوہے کے جال سے محفوظ کر دیے گئے تھے۔ اور گنج کہلاتے تھے اُن مین قسم قسم کے طیور کثرت سے لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُن کے رہنے اور نشو و نما پانے کا پورا سامان فراہم کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرند و پرند مین سے جتنے قسم کے جانور دستیاب ہو سکین سب جمع کر لیے جائین۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید روے زمین پر کہین موجود نہ ہوگا۔ اِن جانورون کی فراہمی مین بے روک روپیہ صرف کیا جاتا۔ اور کوئی شخص کوئی نیا جانور لائے تو مُنہ مانگے دام پاتا۔ کہتے ہین کہ بادشاہ نے ریشم پرے کبوترون کا جوڑا چوبیس ہزار روپیہ کو اور سفید مور کا جوڑا گیارہ ہزار روپیہ کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور ہے اُس کا ایک جوڑا بھی موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان مین کہین نہین نظر آتے۔ اور بادشاہ کے وہان تھے۔ کلکتہ مین ہاتھی مطلق نہین ہین۔ مگر بادشاہ کے اِس زندہ نیچرل ہسٹری میوزیم مین ایک ہاتھی بھی تھا محض اِس خیال سے کہ کوئی جانور رہ نہ جائے دو گدھے بھی رمنہ مین لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔ درندون مین سے شیر ببر۔ دیسی شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ ریچھ۔ سیاہ گوش۔ چرغ۔ بھیڑیے۔ سب کٹہرون مین بند تھے۔ اور بڑی خاطر داشت سے رکھے جاتے۔

کبوتروں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا - بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں مین سب ملا کے چوبیس پچیس ہزار کبوتر تھے - جن کے اڑانے مین کبوتر بازون نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے -

جانوروں پر جو صرف ہو رہا تھا اُس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانور باز تھے - تین سو کے قریب کبوتر باز تھے - اسی کے قریب ماہی پرور تھے - اور تیس چالیس مار پرور تھے - جن کو دس روپیہ ماہوار سے لے کے چھ روپیہ ماہوار تک تنخواہین ملتی تھین - افسرون کی تنخواہین تیس سے بیس روپیہ تک تھین - اور کبوترون سانپون اور مچھلیون کے علاوہ دیگر جانورون کی خوراک مین کچھ کم نو ہزار روپیہ ماہوار صرف ہوتے تھے -

عمارت کا کام زیادہ تر مونس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا جن کو عمارت کی مد مین تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے -

ہزار کے قریب پہرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہین عموماً چھ روپیہ ماہوار تھین - بعض بعض آٹھ یا دس روپیہ بھی پاتے - یہی تنخواہ مکاندارون کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا - مالیون کی بھی یہی تنخواہ تھی اور اُن کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا - تقریباً اسی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے - معزز مصاحبون اور اعلیٰ عہدہ دارون کا شمار چالیس پچاس سے کم نہ ہوگا جو اٹھاسی روپیہ ماہوار پاتے تھے - سو سے زیادہ کہار تھے -

ان کے علاوہ بیسیون چھوٹے چھوٹے محکمہ تھے - باورچی خانہ آبدار خانہ - ٹھنڈی خانہ - خس خانہ - اور خدا جانے کیا کیا تھا - پھر ایک بڑا لواحق بیگمات یعنی ممتوعات کے رشتہ دارون اور بھائی بندون کی تھی جنھین حسب حیثیت تنخواہین ملتی تھین -

ان سب لوگون نے کوٹھیون کے رقبہ سے باہر زیادہ تر اُسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتون نے پاس کی دوسری زمینون پر مکان بنا لیے تھے - اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی - ان سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے

وابستہ تھی - اور کسی کی سمجھ مین نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اِس تھوڑی سی رقم مین کیونکر زندگی بسر کر لیتی تھی - بنگالہ کے عوام مین مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے - جب ضرورت ہوتی ہے لوہے یا تانبے کو اُس مین رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہین -

حقیقت حال یہ ہی کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتہ کے پڑوس مین ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا - اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا - اور اُس کی منتخب صحبت مٹیا برج مین چلی گئی تھی - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُن دنون لکھنؤ لکھنؤ نہین رہا تھا مٹیا برج لکھنؤ تھا - یہی چہل پہل تھی - یہی زبان تھی - یہی شاعری تھی - یہی صحبتین اور بذلہ سنجیان تھین - یہین کے علما و اتقیا تھے - یہین کے امرا و رؤسا تھے - اور یہین کے عوام تھے - کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے مین ہین - یہی تینگ بازیان تھین - یہی مرغ بازیان تھین - یہی بٹیر بازیان تھین - یہی افیونی تھے - یہی داستان گوئی تھی - یہی تعزیہ داری تھی - یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی یہی امام باڑے تھے - اور یہی کربلا تھی - بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی ضریح اُٹھتی تھی لکھنؤ مین عہد شاہی مین شاید اُٹھ سکی ہو غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیہ نہین اُٹھ سکا - کلکتہ کی ہزارہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیا برج مین آجاتے تھے -

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج مین تعصب مطلق نہ تھا - اُن کا پیارا مقولہ تھا کہ "میری دو آنکھون مین سے ایک شیعہ ہو اور ایک سنی ہی" ایک بار دو شخصون مین مذہبی اختلاف پر مار پیٹ ہو گئی - بادشاہ نے دونون کی معزولی کا حکم دیا - بلکہ اپنے وہان ممنوع الملازمت کر دیا اور فرمایا "ایسے لوگون کا میرے یہان گذر نہین ہو سکتا ہا" - آخر آخر مین بادشاہ کی ایک کتاب مین بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتہ کے سنیون مین بڑی شورش ہوئی - مگر اس سے لوگ واقف نہین ہین کہ وہ الفاظ اصل کتاب مین نہین بلکہ دوسرون کی تاریخ یا تقریظ مین تھے - اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہو گئے - بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا

کہ سارا انتظامی کاروبار سنیون ہی کے ہاتھ مین تھا۔ وزیر اعظم منصرم الدولہ بہادر سُنّی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے مین سب سے زیادہ مقرب اور سارے جالوز رھا نے کل اہل قلم اور کئی اور محکمون کے افسر اعلیٰ سنّی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کل ملازمون حتیٰ کہ محلون اور شاہزادون تک کو تنخواہ ملتی تھی سنّی تھے۔ عطار الدولہ اور داروغہ معتبر علی خان جو آخر مین سب سے بڑے عہدہ دار اور کل کاروبار کے مالک تھے وہ بھی سنّی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسون اور مذہبی مراسمون کے بجا لانے کا انصرام بھی سنیون ہی کے ہاتھ مین تھا۔ وہان کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہین کیا کہ کون سنّی ہے اور کون شیعہ ہے۔

مٹیابرج کے دکاندار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت مین وہان موجود نہ ہو۔ جدھر گذر جائیے ایک عجب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اُس لطف مین لوگ اس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور مسند وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنین مٹیابرج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغون مین پھرئیے تو اُس سے زیادہ پر فضا مقام کہین نصیب نہ ہوسکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف نظر آتا۔ کلکتہ کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گذرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے یہین سے اپنی جھنڈیان اُتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہین۔

محلات کی ڈیوڑھیون اور محلسراؤن کے دروازون پر کھڑے ہو جائیے تو عجب لطف کی دھوم دھام مین کبھی کبھی ایسی صورتین نظر آ جاتین اور ایسی فصیح و دلکش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتین سننے مین آ جاتین کہ انسان مدتون بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوبصورت اور دلفریب نقش توڑنے کے قابل نہ تھا! مگر ہائے

زمانے نے مٹا ہی دیا - اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہین ۱۳۱۶ھ عیسوی (۱۸۵۸ء) مین یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ خواب تھا جو دیکھا جو سُنا افسانہ تھا - سب باتین خواب و خیال تھین - ایک طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا - اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سیاحین اور ہندوستان کے والیان ملک تک کو رہا کرتی تھی آج ایک وحشتستان فنا اور عبرت کدہ ہے - جہان کچھ بھی نہین - جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہان کے سناٹے کو دیکھ کے سوا اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے "رہے نام اللہ کا!" اور کیا کر سکتا ہے؟

قدردانان دلگداز

دلگداز کی اشاعت مین اب کی سال بھی بدنظمی رہی - لیکن الحمد للہ کہ سب پرچے تیار ہو گئے - اور اپنے قدردانون کے پُرشوق ہاتھون مین پہونچتے جاتے ہین - لیکن اس امر کو غالباً ہمارے احباب قدر کی نگاہ سے دیکھین گے کہ اگر اشاعت مین پابندی وقت کی کمی ہی تو چھپائی اور کاغذ مین نمایان ترقی ہو گئی ہے -

ہم اس زمانہ مین قدردانون کی نذر کرنے کے لیے نیا تاریخی ناول بھی تیار کر لیا ہے جو ڈیڑھ سو صفحون سے زیادہ کی ضخامت پر تکمیل کو پہونچا ہی اس ناول کا نام "مفتوح فاتح" ہے قیمت غیرون سے ایک روپیہ مگر انون یعنی ۱۹۱۵ء کے خریداران دلگداز کو مفت - اس مین اسپین پر عربون کے قبضہ کر لینے کے بعد ہسپانیہ سے نکل کے فرانس پر حملہ آور ہونے کے واقعات دکھائے گئے ہین - یہ سب واقعات اُسی عہد کے ایک سچے تاریخی قصہ مین منسلک کر دیے گئے ہین جن کا خاتمہ عربون کی اُس شکست پر ہوا ہے جو مسلمانان اندلس کو چارلس مارٹل کے مقابلہ مین ہوئی تھی پیرے نیز کی وادیون اور فرانس اور اسپین کی اُس وقت کی حالت اتنی تاریخ سے نہ معلوم ہو گی جتنی کہ اس ناول کے پڑھنے سے نظر کے سامنے ہو جاتی ہی - ہمین امید ہی کہ اس سال ہم جنوری ۱۹۱۵ء ہی مین اس ناول کے وی پی جن مین سے ہر ایک ایک روپیہ دس آنہ کا ہو گا روانہ کر سکین گے - **مینیجر دلگداز**

تمام تصانیف مولانا شرر اور مطبع دلگداز کی دوسری کتابیں

تصنیفات مولانا عبدالحلیم صاحب شرر

تاریخ و سیر وغیرہ

(۱) جنید بغدادی۔ حضرت جنید کے حالات

(۲) ابوبکر شبلی۔ حضرت شیخ شبلی کے حالات

(۳) تاریخ سندھ۔ سندھ کی مکمل تاریخ دو جلد قیمت۔ جلد اول ... جلد دوم ...

(۴) حروب صلیبیہ۔ مصنفہ اسٹاکس کا ترجمہ نوش

(۵) تاریخ بغداد۔ مرکز خلافت عباسیہ۔ قیمت

(۶) ملکہ زنوبیہ۔ ایک عربی تدمر کی ملکہ ...

(۷) خواجہ معین الدین چشتی ...

(۸) الحکم الرفاعیہ۔ مصنفہ شیخ احمد رفاعی کا ترجمہ

(۹) آغا علی صاحب رئیس لکھنؤ مرحوم کے حالات

(۱۰) سکینہ بنت حسین۔ جناب سکینہ کے حالات

(۱۱) سرسید کی دینی برکتیں ...

ناول

(۱۲) روضۃ الکبریٰ۔ سب سے نیا تاریخی ناول ...

(۱۳) حسن کا ڈاکو۔ سب سے نیا اخلاقی ناول حصہ اول، حصہ دوم

(۱۴) اسرار دربار حرام پور نمبر ۱ ... نمبر ۲ ... ۵

(۱۵) زوال بغداد۔ شیعہ و سنیوں کا جھگڑا اور نسل عباسیہ کا استیصال

(۱۶) غیب دان دلہن۔ پاکدامن اور عفیفہ اور نیک بی بی کی برکتیں اور اسکی حیرت انگیز غیب دانی ...

(۱۷) ماہ ملک۔ مولانا کا نیا اور اچھوتا ناول ...

(۱۸) یوسف نجمہ کامل۔ جگ بیتی نہیں آپ بیتی

(۱۹) شوقین ملکہ۔ پہلی اور دوسری جلدیں اکٹھا ...

(۲۰) فتح اندلس۔ اسپین پر بربروں کا حملہ ...

(۲۱) مقدس نازنین۔ ایک لڑکی کا چپ چاپ بن جانا۔

(۲۲) ملک العزیز ورجنا تیسری جلد چھپ گئی۔

(۲۳) ایام عرب۔ جاہلیت عرب کے حالات مع قصص

(۲۴) فردوس بریں۔ جیتے جی جنت کی سیر

جلدہائے دلگداز

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۰ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۱ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۵ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۶ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۹ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۰ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۱ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۲ء
جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۳ء

دیگر اعلیٰ مطبوعات دلگداز پریس

معاشرت۔ ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی کتاب انگریزی کی گلستان سرجان لبک کی "یوز آف لائف" کا ترجمہ

رفع النقاب۔ مروجہ پردہ کے خلاف ایک مدلل رسالہ

جمیلہ۔ ایک اعلیٰ درجے کا اخلاقی ناول مصنفہ مولوی برکت اللہ صاحب

بیوفا ... ۱۲

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

اس دربار کے فرمانرواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جیسے موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں۔ شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ بننے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہان پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُن کے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہٰذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی۔ مگر اُن کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائین۔ ورنہ جائین تو مار کے نکال دیے جائین۔ نیپال کی قلمرو فوراً اِن سے خالی کرالی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب وہان سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال مین جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے

اُن کے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ اور کہتے ہین اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا سب دولت نیپال کی نذر ہوا۔ آخر حضرت محل وہین پیوند زمین ہوئین۔ اور اُن کی بعد ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ اُنھین واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتہ آ پہونچے۔ یہان واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بہ حیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعوی کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹون سے زیادہ معزز و مستحق مین ہون۔ از روے قانون پنشن بادشاہ کی پنشن مین سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔ اور اُن کے تمام ورثہ اور وابستگان دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی مین وہ انگلستان جانے کی تیاریان کر ہی رہے تھے کہ اُن کے خاندان والون ہی مین سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو تے و دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن مین وہ اُن کی بی بی اور اُن کے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور دنیا اس خاندان کی اُن تمام یادگارون سے خالی ہو گئی جنھون نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اُس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگر چشم زخم حوادث سے بچ جاتا تو مدتون تک یاد دلاتا رہتا کہ اِس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی۔ اور اُن کا کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے ورثا کی دادرسی مین یہ شان عدالت دکھائی کہ ساری جائداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب مین تقسیم کر دیا جائے اور جو کچھ ہے نقد روپیہ کی صورت مین کر لیا جائے۔ اِس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لاکھون کا سامان کوڑیون کو بک گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز مین باغ ارم بن

گیا تھا حضیض ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہاں جا کے خاک اڑاؤ کچھ پتہ نظر آئے گا۔ اگر آنکھیں اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امراؤ القیس کو بلاؤ جو آنسو بہاتا جائے اور تمھیں بتاتا جائے کہ یہاں مرصع منزل تھی۔ یہاں نور منزل تھی۔ یہاں سلطان خانہ تھا۔ اور یہاں اسد منزل تھی۔ وہاں مشاعرے ہوتے تھے۔ وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی۔ وہاں ندیمان باصفا کی بذلہ سنجیاں تھیں۔ اور وہاں فصحائے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں۔ اس مقام پر منتخب حسینان جہان کا جھرمٹ تھا۔ اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ اس مقام پر خورشید مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اس مقام پر جہاں پناہ ناز آفرین معشوقوں کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے۔ اس جگہ قیدیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی۔ اس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی تھیں۔ اس جگہ کبوتر اڑتے تھے۔ اور اس جگہ کنکوے کے میدان بدے جاتے تھے۔ اس ڈیوڑھی پر ماہ وشِ جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے جھانکتی نظر آتی تھیں۔ اس ڈیوڑھی پر ماما اصیلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب جوش و خروش نمایاں رہتا تھا۔ اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعرا حاضر رہتے اس لیے کہ محل سرا والی کو فن شعر سے دلچسپی تھی۔ اور اس ڈیوڑھی پر دو رنگین عبارت لکھنے والے جوان مزاج آدمیوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں سے ایک نئے رنگ کا تورود نامہ[عہ] جا کے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہوتا۔

لیکن مٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں باقی ہیں۔ خود شہر لکھنؤ اور اس کی سوسائٹی اس دربار دُربار کو یاد دلا رہی ہے اور دہلی کی سرزمین کا چپہ چپہ اس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اس لیے کہ اُس پر جا بجا سلطنت ماضیہ کے مزار کھنچے ہوئے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکان دربار کی زندہ تاریخ ہے۔ اور ان کی چال ڈھال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے ع اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری ۔ لہذا ان دیریا آثار سلف کی یاد تازہ

عہ جواہت شاعرہ کا ایک نہایت مشہور شاعر نے اپنے قدیم حسرت کدہ کی ویرانی اور تباہی کی تصویر نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے۔

عہ تورود نامہ اُن خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلات عالیات جہان پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے [illegible]

کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ میں جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیا تھی کیسی تھی۔ اور اس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان میں اُن دنوں فارسی زبان کورٹ لینگویج (درباری زبان) تھی۔ اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی۔ دولت صفویہ کے عہد میں ایرانیوں کا عام مذہب شیعہ اثنا عشری ہو گیا تھا۔ اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیہ چغتائیہ مذہب اہل سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے جو بھی یہاں آجاتے ادب کے ہاتھوں سے لیے جاتے تھے۔ اسی اخلاقی رجحان نے نور جہاں بیگم کو جہانگیر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔ اسی کی بدولت دہلی کے اکثر معزز عہدہ دار آخر عہد میں شیعہ تھے۔ اور اسی کی وجہ سے امین الدین خاں نیشاپوری یہاں پہونچتے ہی نواب برہان الملک بن کے وادی گنگا کے ساری وسیع علاقے کے مالک ہو گئے۔ برہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا اسی قدر زیادہ وہ باکمالان دہلی کے مرجع و ماوی بنتے گئے۔ باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چونکہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئی اس وجہ سے سواے بہادر سپہ گروں کی قدردانی کے اُنھیں قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کی بہت ہی کم مہلت ملی۔ کیونکہ ان باتوں کو بمقابل فوج کشی و فتحمندی کے امن و امان کے پرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے۔

لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی میں ہمت ہارنے کے بعد انگریزوں سے نیا معاہدہ کیا۔ اور مجبور ہو کے فیض آباد میں خاموش بیٹھے تو سرزمین اودھ میں ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ اس مضمون کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں کس کثرت

سے باکمالان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگے تھے۔ دہلی سے فیض آباد تک جو چیونٹیوں کی رہ چلتے لوگوں کے آنے کا کیسا تانتا بندھ گیا تھا۔ اور صرف نو سال کی مدت میں فیض آباد کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا جما جمایا کارخانہ یکبارگی فیض آباد سے اکھڑ کے لکھنؤ میں آ گیا۔ اور دہلی کے اعلیٰ خاندانوں اور باکمالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں رک لیا گیا۔ یہیں سرراہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شرفا و صاحب ہنر جو فیض آباد میں بیگموں کی سرکاروں میں الجھے رہ گئے تھے رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار دوڑ پڑتا۔

ان دنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو خود معترف تھے کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالم۔ شاعر۔ یا سپاہی مسلمان امرا سے برخاستہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقہ میں پہونچ جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار ان دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار مغلیہ تھا۔ اور اس کی قدامت اور گزشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے باکمالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اسی سرزمین کے منتشر روڑے تھے جنھوں نے دور و دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے۔ جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دہلی سے چلیے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر خوانین کی قلمرو ملتی۔ اس کے

بعد یا اودھ کا دربار تھا۔ پھر اُس سے آگے مرشد آباد مین نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دُور رہتے تھے۔ اُن کا راستہ اول تو جنگلوں اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گزار تھا۔ اور اس پر بھی جرأت کرکے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو جو سارے ملک مین پھیلے ہوے تھے راستہ ہی مین اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدر آباد کی مملکت تک پہونچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اسلیے جب دہلی بگڑنا شروع ہوئی اور تاجداران مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدردانی کا بازار وہان سرد پڑا تو لوگون نے عمومًا شمالی ہندوستان کے دربارون کا رخ کیا۔ اِس مین شک نہین کہ روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہان کے خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہین حاصل تھا۔ مگر اُن مین دینداری تھی شجاعت بھی اور بہت سی خوبیان تھین مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیون سے وہ لوگ بالکل معرا تھے۔ ان کی حالت کا اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے جنھین اپنے ہم وطنون کے جمع کرنے اور اپنے جرگون کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو ان کی حالت بالکل وحشی گنوارون کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعرون ادیبون اور دیگر قسم کے باکمالون کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہذا اُن کی سرزمین مین جو داخل ہوا قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلین طے کرکے لکھنؤ مین پہونچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادنے طبقہ والے تک استقبال مین آنکھین بچھا رہے ہین۔ اور ہر طرح خدمتگذاری کو طیار ہین۔ ایسی جگہ پہونچ کے پھر بھلا کون واپس جا سکتا ہے؟ جو گیا وہین کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر خانمان برباد یہان آتے ہی پاؤن توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل مین باقی رہی۔ چند لوگ یہان سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہونچ گئے

گروہ وہی تھے جن کی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے سب لکھنؤ ہی مین کھپتے چلے گئے۔ تھوڑے ہی زمانہ کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ مین اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی اور وہ عربی کا علم و فضل تھا جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ ملا صاحب ممدوح اور اُن کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز مین فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی مین بھی کوئی نمود کا عالم نہین پیدا ہو سکا تھا۔ آخر مین شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا مگر اُن کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہین اِن سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنون لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بن جانا کہ ہندوستان در کنار بخارا خوارزم اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکا دین بہت ہی حیرت کے قابل ہے۔ ساری اسلامی دنیا یہین کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہین کے منتخب کیے ہوئے نصاب تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علمائے فرنگی محل کی بدولت اس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ منطق و کلام فقہ و اصول فقہ اور دیگر مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ غرض ایک اس چیز مین تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہین ہے باقی اور تمام ترقیان اس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئین۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہین کہ دہلی سے لکھنؤ مین کون کون سی چیزین آئین۔ اور یہان آ کے اُنھون نے کیا رنگ پکڑا۔ سب سے مقدم اردو

زبان ہی جو دہلی کے اُن شرفا اور سرداران فوج کی زبان تھی جو ابو برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ مین آئے تھے - یہ زبان دہلی مین پیدا ہوئی اور اُس کی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا - ولی گجراتی نے دہلی مین آکے اپنا دیوان پیش کیا - اور اپنے نغمۂ دلکش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے جگا یا - اس نغمہ مین کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا - اور دہلی مین اردو شاعری شروع ہو گئی -

ابتدائً چند ہی بزرگ تھے جنھون نے اُستادی کی شان سے دہلی مین داد سخن دینا شروع کی مگر اس زمانہ کو اگر اردو زبان کی طفلی نہین تو اردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے - دنیا سے اردو کے ان سابقین اولین مین سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے - جنھین مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دور شاعری مین رکھا ہے - زمانہ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن مین سودا - میر - مرزا مظہر جان جانان اور خواجہ میر درد شامل ہین سب ان کے شاگرد تھے - شاعری اور کمال زباندانی کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد انھین اُستاد اول خان آرزو سے پڑی - نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے اُنھین لکھنؤ مین بلوا یا اور ایک زمانے تک اودھ مین اقامت گزین رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد ۱۱۶۹ھ (مطابق ۱۷۵۵ء) مین خاص لکھنؤ کے اندر رہ کر راہی آخرت ہوئے - وہی پہلے اُستاد اردو شاعری تھے - اور اُنھین سے اردو شعر و سخن کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد پڑی - مگر افسوس کہ اُن کی ہڈیان سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپی گئین -

اس کے بعد اسی دور کے دوسرے نامی اُستاد سخن اشرف علی خان فغان نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے قدردانی کی تلاش مین لکھنؤ کی راہ لی - شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی - ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار مین رکھا مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ

نازک دماغ ہوا کرتے ہیں کسی خفیف سی بات پر اٹھ کے عظیم آباد چلے گئے اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہیں پیوند زمین ہو گئے۔

اب مولانا آزاد کا عذر کیا ہوا تیسرا دور شاعری شروع ہوا جب کہ خان آرزو کے شاگرد نظم اردو پر حکومت کر رہے تھے۔ اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالوں کو اپنے آغوش میں سنبھال نہیں سکتی۔ ہر طرح کے صاحبان کمال اس کی سواد سے نکلے چلے جاتے ہیں اور جو جاتا ہے پھر نہیں آتا۔ اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب کمال آتا ہے یہیں کا ہو جاتا ہے۔ مرزا رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ سید محمد میر سوز جو اس تیسرے دور کے ہیرو ارکان سخن ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ آ گئے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔

ان کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے میں وارد لکھنؤ ہوئے اور یہیں کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسن۔ مرزا فاخر مکین۔ میر ضاحک۔ انشاء اللہ خان انشا۔ میر حسن دہلوی میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور انھیں کے ایسے بیسیوں شعرا ہیں۔ میر قمر الدین منت۔ میر ضیاء الدین ضیا۔ اشرف علی خان فغان۔ دہلی سے لکھنؤ میں آ کے ایک مدت تک رہے اور یہیں چمکے مگر آخر میں بیرونی قدردانوں کی کشش سے کلکتہ اور عظیم آباد میں جا کے نذر اجل ہوئے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ ان کے وطن نگینہ میں ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک ایکٹر تھے۔

صرف میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی میں پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا۔ اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی۔ اور لکھنؤ میں ایک پرجوش قدر دانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی واکبر آباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوئے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی مین چمکی۔ یہین سے اِن کا نام مشہور ہوا۔ یہین کے مشاعرون کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہین سے نکلے۔ یہین رہے۔ یہین عروج پایا۔ اور یہین مر کھپ گئے۔ اس دور کے رکن رکین جرات۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد مین زبان پر حکومت کر رہے تھے۔ اور اِن کی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیان کہان ہین؟ لکھنؤ کی خاک مین۔

اِس زمانے مین دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ مین آرہے تھے اُس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہی جس مین اُنھون نے اُس عہد کے ایک شریف وضعدار بڈھے اور نورًا نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہی وہ بزرگ اور کسبی دونون دہلی کے ہین مگر دونون لکھنؤ مین باتین کر رہے ہین۔ بی نورًا کہتی ہین "اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہوگئے۔ دہلی مین آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ مین تمھین کیا ہوگیا کہ کبھی صورت بھی نہین دکھاتے۔ آپ کی کربلا مین کتنا مین نے ڈھونڈھا کہین تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہ آٹھون مین بھی نہ چلو۔ تمھین علی کی قسم آٹھون مین مقرر چلیو" اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہی وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہی مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہین۔ اُنھون نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہین۔ اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیان کی ہین جس سے ہمین بحث نہین۔ ہمین صرف یہ بتانا ہی کہ اِس زمانے مین شرفا و کملا درکنار رنڈیان تک لکھنؤ مین آآکے بستی جاتی تھین۔ اور جو لوگ دہلی مین پھول والون کی سیر کے رسیا تھے اب کربلا اور آٹھون کے میلے مین اپنا دل بہلاتے تھے۔

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعراے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابین کھینچ کے پانچوان دور بنا دیا ہے۔ لیکن یہ نا انصافی ہے۔ اصلی پانچوان دور صرف ناسخ و آتش کا تھا۔ جس مین زبان نے نئی وضع اختیار کی۔ بہت سے پرانے محاورات ترک ہو گئے۔ نئی بندشین پیدا ہوئین۔ اور اُس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعراے دہلی و لکھنؤ مین یکسان طور پر مقبول ہوئی۔ اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندستان مین مستند ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلمرو مین پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا۔

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ مین وزیر۔ صبا۔ رند۔ گویا۔ رشک۔ نسیم دہلوی۔ اسیر۔ نواب مرزا شوق اور پنڈت دیاشنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ اور دہلی مین مومن۔ ذوق۔ اور غالب نغمہ شاعرانہ سنا رہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بہ لحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہونچا دیا۔

اس کے بعد ساتوان دور امیر۔ داغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال لطافت۔ افضل۔ اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دورون پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ مین کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز مین شعر کہنا لکھنؤ مین ایک وضعداری بن گیا۔ اور شعرا کی یہان اس قدر کثرت ہو گئی کہ شاید کہین کسی زبان مین نہ ہوئی ہو گی۔ عورتون تک مین شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام مین بھی شاعرانہ خیال آفرینیون تشبیہون اور استعارون کی جھلک نظر آنے لگی۔

یورپ کے بانکے یا نائٹ ٹمپلرز

ہم ہندوستان کے بانکون کا حال ناظرین دلگداز کے سامنے پیش

کر چکے ہین - اب اُن کے بڑے بھائی یورپ کے قدیم بانکون کا حال بھی سُن لیجیے - یورپ کے اِن انوکھے سپاہیون نے جو سپہگر ہونے کے ساتھ بانکے رسیلے چھیلا بھی ہوتے تھے اپنے لیے "نائٹ" کا لقب اختیار کیا تھا۔

محققین یورپ کا بیان ہے کہ وہان سپہگری کے پیشہ کو خاص معاہدون اور کسی خاص طرز سے اختیار کرنا اہل جرمنی سے شروع ہوا جو رومیون کی عروج کے زمانے مین وحشی و جاہل مگر اس کے ساتھ بڑے جنگجو اور نہایت ہی شجاع خیال کیے جاتے تھے - کہتے ہین کہ اُنھین دنون جرمانیا کے جنگلون اور پہاڑون مین بانکے سپاہی بننے کا یہ سادہ اور بھونڈا طریقہ مروج تھا کہ جو نوجوان اس گروہ مین شامل ہونا چاہتا کسی میدان جنگ مین بہادری دکھا چکنے کے بعد اُس کے قبیلہ کے تمام لوگ ایک میدان مین جمع ہوتے۔ بہادران قوم اُن لوگون سے اس نوجوان کی بہادری اور اخلاقی حالت دریافت کرتے - اور جب وہ سب مذکورہ صفات کو اُس مین تسلیم کرتے اور ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا تو بزرگون مین سے کوئی شخص اُس کے گال یا شانے پر ایک تھپڑ مارتا - جس کے یہ معنی تھے کہ اس ضرب کے بعد وہ پھر کبھی چوٹ نہ کھائے گا - وہی بزرگ قوم اُسے ایک ڈھال اور ایک برچھا دیتا - اور اُسے اجازت ہوتی کہ اُن اسلحہ کو لیے کے میدان جنگ مین جایا کرے - جن نوجوان کو یہ عزت دی جاتی وہ "نیخت" کہلاتے اسی نیخت سے بگڑ کے "نائٹ" کا لفظ نکلا ہے جس کی اگلی شان تو بالکل مفقود ہو گئی مگر تمام یورپ کے خطابون مین داخل ہونے کی وجہ سے اس وسعت کے ساتھ دنیا مین پھیلا کہ آج ہمارے راجہ صاحبان جہانگیر آباد و محمود آباد ہی نہین ہندوستان کے اکثر والیان ملک اور سارے مقدس ارض عرب تک کے بعض فرمان روا نائٹ ہین -

رومیون مین اِس کے ہم وزن "میلس" کا لفظ تھا - اِن مہذب لوگون مین اگرچہ اصلی قوت غریبون ہی کی تھی جو "پلے بین" کہلاتے - مگر امرا و ملوک گھوڑون پر سوار ہو کے لڑتے اور "بطریق" کہلاتے - اور وہ بطارقہ ہی اکثر "میلس" کے لقب سے یاد کیے جاتے -

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب جرمنی اور رومی دونون قومین بُت پرست تھین اور دین عیسوی ابھی دنیا مین نہین آیا تھا۔ حضرت مسیح کا دین ابتداءً صرف واعظون سے شروع ہوا تھا اور سپہگری سے بالکل مخالف تھا۔ مگر چونکہ مظلوم رہنے کی وجہ سے مسیحیون کے سینون مین ایک انتقام کی آگ مدت سے دبی چلی آتی تھی جسے قسطنطین اعظم نے اپنی پولیٹکل مصلحتون سے بھڑکا دیا۔ حضرت مسیح کی مصلوبیت کی بنا پر اُس نے صلیب کو مسیحیون کا شعار قرار دیا۔ یہ صلیبی علم ہاتھون مین لیا۔ اور جوش انتقام مین ڈوبے ہوے تھے وہ دفعۃً ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس بے جوش قوت سے اپنے بت پرست حریف کو شکست دے کے وہ پوری قلمرو روم پر قابض ہو گیا۔ لیکن یہ ایک وقتی اُبال تھا۔ جب مسیحیت دولت روم کا مذہب بن گئی تو پھر اُسے سپہگری سے کوئی سروکار نہ رہا۔ اس لیے کہ مسیحیت خونریزی کے مخالف تھی اور لڑنے بھڑنے سے متنفر تھی۔ چنانچہ رومی سلطنت ایک مسیحی دولت بنتے ہی ایسی کمزور ہو گئی کہ گوتھ اور وحشی قومون نے اُسے خوب پامال کیا۔ اور آخر عرب لوگ اُٹھے جنھون نے مشرق مین ایشیاے کوچک و شام کو اور افریقہ مین تمام شمالی ممالک کو رومیون سے چھین لیا۔ جزیرۂ صقلیہ اور خود اٹلی کا کسی قدر جنوبی حصہ عربون کے قبضہ مین چلا آیا۔ اور آبنائے جبرالٹر سے اتر کے اُنھون نے پورا ملک اسپین بھی اپنے قبضہ مین کر لیا۔

ان دنون یورپ مین فیوڈل سسٹم (حکومت امرا) کا طریقہ جاری تھا سارے ملک کی یہ حالت تھی کہ ہر زمیندار اپنے علاقے اور اپنے گاؤن یا شہر کا خودسر حاکم اور بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اُس کے زیر علم حسب حیثیت سپاہی ہوتے۔ اور اُنھین کے اندازہ سے اُس کی قوت ہوتی۔ متعدد زمیندارون کے باہم ملنے اور حلیف ہو جانے سے ایک بڑی قوت بن جاتی۔ اور زبردست دشمنون کے مقابلے مین اکثر یہی ہوا کرتا۔

اصلی قوت ان دنون بھی پیدل سپاہیون ہی کی تھی مگر چونکہ وہ ادنی طبقے کے لوگ ہوتے اس لیے اُن کی قدر نہ ہوتی۔ قدر سوارون کی تھی جو عموماً امیرون اور رئیسون کے اعزا و اقارب اور شرفاے قوم ہوتے۔ اور وہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا میلس کہلاتے تھے۔ جن ڈیوکون (شہزادون) اور کاؤنٹون (نوابون) نے شاہی سطوت حاصل کر لی ہوتی وہ اپنی قلمرو کے صوبون کو جن لوگون کے ہاتھ مین

دیتے وہ بائرن کہلاتے۔ اور بائرن اپنے صوبے کو جن عہدہ دارون مین تقسیم کرتے وہ "فائف" کے لقب سے یاد کیے جاتے۔ اور یہ فائف عموماً "ہیو" کہلاتے تھے۔ اس تفصیل کے ملاحظہ سے ہمارے دوستون کو یورپ کے موجودہ خطابون اور انگریزی معززین کے لقبون کی اصلیت بخوبی معلوم ہو جائے گی۔

بیرونٹ کے اوپر تک کے جتنے معززین تھے گھوڑون پہ سوار ہو کے لڑتے اور کسی ادنے شخص کو یہ حق نہ تھا کہ بجز پا پیادہ لڑنے کے گھوڑے کی پیٹھ پہ سوار ہو کے میدان جنگ مین آئے۔ اور یہی لوگ "میلس" خیال کیے جاتے تھے۔ جب عربون نے اسپین کو لے لیا۔ پھر کوہسار پیرینیز سے نکل کے فرانس پر حملہ آور ہوئے۔ اور اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو یہ لوگ ساری مغربی مسیحی دنیا کو فتح کر لین تو نظر آیا کہ بغیر سپہ گری کو زندہ کیے اور اُسے مذہب کا مقدس لباس پہنائے اپنی وطنی اور قومی عزت کا بچانا دشوار ہے۔ ابتداءً تو کلیسیا نے اس ضرورت کو محسوس کر کے "خاموشی نیم رضا" کا اصول اختیار کیا۔ یعنی اس کا یہ طرز عمل کہ زبان سے تو کچھ نہ کہا جائے مگر سپہگری کی ترقی کو بہ ظاہر استحسان کی نظر سے دیکھا جائے۔ لیکن رومی سپہ گری بوسیدہ و از کار رفتہ ہو چکی تھی اسلیے جرمنی کا آئین اختیار کر لیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے لقب نیخت کو بھی لایا۔ جو انگریزی مین آکے "نائٹ" بن گیا۔ یہ لفظ انگریزی تلفظ مین تو "نائٹ" ہے لیکن اُس کا املا آج تک ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر بولنے مین اُس کی پابندی کی جائے تو تلفظ نائٹ نہ ہو گا بلکہ "کنیغت" ہو گا غرض اب جو بہادر میدان جنگ مین کوئی کار نمایان کرتے اور شجاعت ظاہر کرتے نائٹ مشہور ہو کے ہم وطنون مین معزز و ممتاز ہو جاتے۔ حصول عزت نے لوگون کو زیادہ شوق دلایا۔ اور نائٹون کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ اور چند ہی روز مین یہ حالت ہو گئی کہ عوام نائٹون کی بیحد تعظیم و تکریم کرتے اور سلاطین حامی ملک و ملت خیال کر کے اُنھین اپنا سرمایۂ ناز بتاتے۔

اب یورپ مین یہ طریقہ تھا کہ صرف "فائف" اور اُن سے مافوق مرتبون کے لوگ نائٹ بن سکتے۔ کسی عامی کی مجال نہ تھی کہ نائٹ ہونے کا دعوی کرے جو فائف اپنے خاندان کو بے داغ و بے عیب ثابت کر سکتا اور چار ہم مرتبہ

خاندانون سے قرابت رکھنے کا مدعی ہو سکتا اُس کے نوجوان لڑکے خاص طریقہ اور خاص رسوم کے ساتھ نائٹ بنائے جا سکتے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ کوئی ادنے طبقہ کا آدمی سپہگری کا کمال دکھائے اور بڑے بڑے میدانون مین ناموری حاصل کر کے نائٹ کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اور ایک نیا پیر پیدا ہو جاتا۔

فرانس کے بادشاہ شارلمین کے عہد سے جو سنہ ۲۲۳ ہجری (سنہ ۸۱۴ء) مین دنیا سے رخصت ہوا حروب صلیبیہ کے چھڑنے کے مابین جو زمانہ گزرا اُس مین اہل اسپین فرانس اور نارمن لوگون کے اوضاع و اطوار مین ایک انقلاب عظیم ہو گیا تھا جو چند روز کے اندر سارے یورپ مین پھیل گیا۔ اسی انقلاب کا ایک نمونہ یہ بھی تھا کہ سپاہی پیشہ سے نائٹ بن گئے۔ ابتدا ہی سے نائٹ ہونے والون کو سلاح جنگ کے ساتھ دو ذمہ داریان اپنے سر لینی پڑتین۔ ایک تو یہ کہ سپہ گری کو اپنا پیشہ سمجھین گے اور دوسری یہ کہ حسین عورتون کی خاطر داشت اور خدمت گذاری کرین گے۔ اس کا پتہ نہین چلتا کہ نائٹون کو عورتون کے ساتھ کیون زیادہ خصوصیت تھی؟ اور نازنینان ملک سے خاص تعلقات رکھنا نائٹ ہونے کی ذمہ داریون مین کب اور کیونکر داخل ہوا؟ مگر اس سے یورپ کی اُس وقت کی اخلاقی حالت عالم آشکارا ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان نائٹ ہوتے ہی کسی نہ کسی حسینہ کے عاشقون مین شامل ہو جاتا بلالحاظ اس کے کہ وہ کس کی بیٹی کس کی بہن اور کس کی جورو ہے۔ اُس خاتون کو وہ "اپنی خاتون" کہتے۔ اور اُس کے لیے لڑنے بھڑنے۔ اور کٹنے مرنے پر ہر وقت تیار رہتے۔ اس قسم کے بہت سے نائٹ اُن دنون ہسپانیہ اور فرانس مین پھیلے ہوے تھے۔ جو مسلمانون سے لڑتے۔ اور اکثر ناکام و نامراد میدان جنگ سے واپس جاتے اور یہی تھے جنھون نے ہسپانیہ کے علاقہ قسطلہ اور مملکت فرانس کو عربون کے ہاتھ سے بچا لیا۔

نائٹون کی یہی حالت چلی آتی تھی کہ حروب صلیبیہ کا زمانہ شروع ہوا۔ اور راہبون کے شور و غوغا اور پوپ کے فتوے سے مذہب عیسوی کو سپاہیون کی ضرورت پیش آئی جو چیز اس وقت تک از روے دین ناجائز تصور کی جاتی تھی یعنی سپہ گری اب وہ عبادات مین داخل ہو گئی۔ اور نائٹ ہونے مین ایک دینی

تقدس پیدا ہوگیا - لہذا اب بجاے اسکے کہ خود نائٹ کسی کو اپنے زمرے مین شامل کرین مقتدایان ملت ملک کے بانکے ترچھے نوجوانون کو نائٹ بنانے لگے - ادھر پادریون اور اسقفون نے اِن مقدس زن پرستون کے زمرے مین شامل کرنے کا یہ طریقہ جاری کیا کہ جسے شوق ہو پہلے چند روز تک روزے رکھے شب زندہ داری و ریاضت کرے - پھر غسل کرکے سفید کپڑے پہنے (جس مین پتسما کا اشارہ تھا) اور سب سے بڑے محترم مقتداے دین کے ہاتھ سے تلوار لے جس مین بزرگان دین کی برکت شامل بتائی جاتی - اس رسم کے ادا ہونے کے بعد وہ "خدا کا - سینٹ جارج کا - اور سینٹ میکائیل کا نائٹ" کہا جاتا - اُس سے حلف لی جاتی کہ اپنے بانکپن کے فرائض کو سرگرمی سے ادا کرے گا - اپنے آپ کو خدا کا اور حسینون خاتونون کا سپاہی تصور کرے گا - سچ بولے گا - حق کا ساتھ دے گا - مصیبت زدہ کی مدد کرے گا - ہر ایک کے ساتھ خُلق و مروت سے پیش آئے گا - دشمنان دین سے لڑے گا - سہل انگاری - غفلت اور اپنی جان بچانے کے جذبات کو حقیر سمجھ کے دل سے نکال ڈالے گا - اور اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے سخت سے سخت خطرون کو برداشت کرے گا -

سپہگری کے کامون اور عشق بازی مین ان لوگون کا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض بعض جہلا مین خیال پیدا ہوگیا کہ سوا سپہگری کے اور کوئی پیشہ اختیار کرنا نائٹون کے لیے حرام ہے - اور نائٹون کو دین کی برکتون اور قربانیون سے یہ حق مل گیا ہی کہ مضرت سے بچنے کے لیے جس کسی سے جب انتقام چاہین لے لین - یہان تک کہ قوانین تمدن اور فوجی باضابطگی کے کیودستے وہ آزاد تھے چنانچہ کسی قانون کا پابند ہونا وہ اپنی ذلت تصور کرتے -

برچھا نائٹ کا خاص سلاح تھا - اُس کا گھوڑا اور دون کے جانورون سے قد آور بھاری بھر کم اور طاقت ور ہوتا - ایک خاص ملازم گھوڑے کا دہانہ پکڑے ہوے ہمیشہ اُسکے ساتھ ساتھ رہتا - اور جب جنگ کرنے کا وقت آجاتا نائٹ صاحب اُس پر سوار ہوتے - وہ کسی اور تیز قدم یا بڑ یا سمولی گھوڑے پر سوار رہتے - نائٹ کا خود - زرہ موزے اور تلوار خاص شان اور آن بان

سے ہوتے۔ میدان جنگ میں اُن کا قاعدہ تھا کہ برچھے کو دشمن کی طرف جھکا کے آڑا کر لیتے۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کے آگے ریل دیتے۔ میدان جنگ میں نائٹ کے ساتھ اُس کا ایک وفادار رفیق رہتا جو "اسکوائر" کہلاتا۔ اسکوائر عموماً اپنے نائٹ کا ہمسن اور شریف النسل ہوا کرتا۔ اور در اصل وہ نائٹ ہونے کا امیدوار ہوتا۔ تیر کمان۔ شمشیر و خنجر۔ یا اور حربے جن سے نائٹ صاحب کو ساتھ ساتھ رہتے۔ اور صرف نیزے ہی کا اتنا سامان ہوتا جو پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں پر لدا ہوتا۔ اور وہ سب لڑائی میں سایے کی طرح اس کے ساتھ رہتے۔ عرصۂ جنگ میں اُن کا بانا اور اُن کا شعار ہر ایک میں کوئی جدت اور خصوصیت ہوتی۔

اس گروہ کے پیدا ہو جانے سے یورپ کے زمینداروں اور سر آوردہ لوگوں کو یہ آسانی ہو گئی تھی کہ اپنے ذاتی جھگڑوں میں اُن سے مدد لیتے۔ اور اُن کی کارگذاریوں کا معاوضہ کرتے گویا خدائی فوجداروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کو معقول رقم دے کے جو چاہتا بلا لیتا۔ اور اپنے جھنڈے کے نیچے آسانی سے ایک زبردست لشکر جمع کر لیتا۔ باقی آیندہ

لطیفۂ حدانیہ

ہم حسن کی کرشمہ سازیوں کے بہت سے نمونے ناظرین دلگداز کی پر شوق نگاہوں کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ لیکن عفت و محبت کا ایک کرشمہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ہارون رشید کے زمانے میں قبیلۂ حدان کا ایک شریف عرب اپنی ایک پری وش اکلوتی بیٹی کو بچپن ہی میں یتیم چھوڑ کے مر گیا۔ یہ معصوم اور الھڑ لڑکی حسن و جمال میں جواب نہ رکھتی تھی اور "لطیفہ" اس کا نام تھا۔ چچا نے اپنے گھر میں رکھ کے ناز و نعم سے پالا۔

اس کے چچا کا واصف نام ایک خوش رو و گل اندام فرزند لطیفہ کا

ہم سن اور ہم مکتب تھا۔ دونون ایک ساتھ رہتے اور ایک ساتھ پرورش پاتے تھے۔ بچپن سے دونون موسم بہار کے نوشگفتہ پھول بنے ہوے تھے۔ اور جو جو بڑے ہوتے شگفتگی اور خوبصورتی بھی ترقی کرتی جاتی تھی۔ یہان تک کہ دونون کے عنفوان شباب کا زمانہ آ گیا۔

اس مختصر عہد زندگی کے شروع ہوتے ہی کا یک لطیفہ کی زندگی مین ایک تغیر شروع ہوا۔ چہرے کی بشاشت اور شگفتگی رخصت ہوئی۔ لالۂ نوشگفتہ کے سے گال مرجھا گئے۔ آنکھون سے حسرت ٹپکنے لگی۔ چہرہ اداس ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چمن حسن کے پھولون پر اوس پڑ گئی۔ چچا جو اُسے پھول کی طرح رکھتا تھا بہت متردد ہوا۔ اس انقلاب کا سبب پوچھا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دل کا حال کھلتا ہی نہ تھا۔ آخر سب نے بیماری تجویز کی اور علاج کے لیے اطبا کی طرف رجوع کی گئی۔ مگر چند روز مین تجربہ ہو گیا کہ مرض پر حکیمون کا بھی کچھ زور نہین چلتا۔

چچی ایک زیرک اور ہوشیار و زمانہ شناس خاتون تھی اُس نے کئی دفعہ دیکھا کہ واصف کے حرکات و سکنات کو لطیفہ حسرت کی آنکھون سے دیکھتی ہے۔ اور بار بار اُس کی صورت دیکھ کے اندر ہی اندر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی ہے۔ یہ دیکھ اُس نے دل مین کہا اس لڑکی کی یہ ساری بیماری اس وجہ سے تو نہین ہے؟ اور کوشش کی کہ زیادہ آزمالے تو اس مرض کے دفعیہ کی کوئی تدبیر نکالے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی کو بار بار غش سا آجاتا ہے۔ اور بے اختیار بیہوش ہو کے گر پڑتی ہے۔ چچی نے اِس غش کے اوقات پر غور کرنا شروع کیا تو یہ کھلا کہ جب واصف گھر مین اور لطیفہ کی آنکھون کے سامنے ہوتا ہے تو وہ ہوش مین رہتی ہے۔ اور حسرت و اندوہ کے ساتھ اُسکی طرف نگران پائی جاتی ہے۔ مگر جب واصف کہین باہر چلا جاتا ہے تو بیہوش اور آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔ یہ حالات دیکھ کے اُسے یقین آگیا کہ لطیفہ کا مرض یقیناً مرض عشق ہے۔ شرافت اور عصمت کے جوش سے دل مین دبائی ہے۔ جس سے پُر آتش تنور سینہ

میں اس بلا کی اُنس پیدا ہوتی ہی کہ ہوش و حواس نہیں بجا رہتے۔

اس امر کا پورا پورا یقین کر لینے کے بعد اُس خاتون نے اپنے شوہر سے ذکر کیا۔ اس نے کہا اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہی؟ غنیمت سمجھو کہ اور کسی کو ابھی خبر نہیں ہی۔ ورنہ یہ کہنے کو ہوتا کہ بیٹی کی شادی اُس نوجوان سے کر دی جو پہلے سے اُس پر عاشق تھا۔ اور ہم قبیلہ میں کسی سے چار آنکھیں کرنے کے قابل نہ رہتے۔ اور میرا تو پہلے سے یہی ارادہ تھا۔ خیر خدا مبارک کرے اور وہ ہی چار روز کے اندر قاضی صاحب کو بلوا کے دونوں کا نکاح پڑھوا دیا غرض بڑی خوشی سے دونوں کی شادی ہو گئی۔ اور لطیفہ کا مرض دور ہو گیا اُس کے گل رخسار اب پہلے سے زیادہ شگفتہ تھے۔ نرگسیں آنکھوں میں بے نظیر رسیلا پن پیدا ہو گیا۔ اور دونوں طالبان وصال عیش و کامرانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جو ایسے عاشقوں کو بہت کم نصیب ہوا کرتی ہے۔ واصف بھی طبیعت کا شوقین واقع ہوا تھا۔ پری جمال و ناز آفرین دولھن کو تاکید کر دی کہ ہمیشہ آراستہ و پیراستہ رہا کرو۔ بناؤ سنگھار کبھی ناغہ نہ ہو۔ اور اچھا اچھا عطر لگاتی رہا کرو۔ لطیفہ نے معشوق شوہر کا یہ مذاق دیکھ کے ایسا بننا سنورنا اور نکھرنا شروع کیا کہ جنت کی حور اور کوہ قاف کی پری معلوم ہوتی۔ جس نے معشوق شوہر کو عاشق صادق بنا دیا۔

مگر افسوس عشق دنیا میں ناکامی و نامرادی ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ماں باپ اعزہ و اقارب دوست احباب سب موافق ہوں تو قدرت آپ ہی سامان حسرت و ناکامی پیدا کر دیا کرتی ہے۔ اس مقصد وری و آرزومندی کی زندگی کو چند ہی برس گزرے تھے کہ واصف بیمار پڑا۔ چند روز میں سوکھ کے کانٹا ہو گیا۔ اور تھوڑے دنوں بعد عین عالم شباب میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس جوانا مرگ کا صدمہ ماں باپ کو اور قبیلہ کے ادنے و اعلیٰ کو ہوا مگر اُس مایوس تمنا لطیفہ کے دل پر جو کچھ گزری بیان سے باہر ہے۔ عاشق شوہر کی یاد تو اس کو کسی

طرح بھولتی ہی نہ تھی۔ مگر بے مثال حسن پر خاک ڈالنا اور لٹانا اس نے اپنے حد سے زیادہ
زینت کو ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا۔ صبح و شام شوہر کی یاد میں ماتم کرتی۔
ان بھر آہ جگر دوز کھینچتی۔ اور روزانہ حسن کے رواصف کی قبر پر بیٹھ کر گھنٹوں آنسو
بہاتی۔ رخسار کے پھولوں کو آنسوؤں کے گرم پانی سے دھو دھو کے۔ ور کھنا تی
جب دیکھتی کہ رات زیادہ گئی ہو تو خاک اڑاتی ہوئی گھر واپس آتی۔ نیز اس کا
یہ معمول تھا کہ بہاری جوڑے پہن کے۔ سارے زیور سے سج کے۔ خوشبو
مَل کے اور عطر لگا کے قبر پہ آیا کرتی۔

اسی معمول کے مطابق ایک دن وہ بناؤ سنگار کر کے تربت شوہر پر بیٹھی۔
اشک تربت کے پھول چڑھا رہی تھی کہ عرب کے مشہور شاعر اور امام عرب کے نامی
مورخ اصمعی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ ایک خوش فکر شاعر اس کے ساتھ تھا۔ دونوں
نے دور سے جو ایک بنی سنوری نازنین کو ایک قبر پر خاموش بیٹھے دیکھا تو متحیر ہو کے
قریب گئے کہ اس کی عجیب و غریب سوگواری کی داستان سنیں۔ لطیفہ نے جو دو
مردوں کو قریب آتے دیکھا چادر اوڑھ کے گھونگھٹ نکال لیا۔ سارا بدن اسمیٹ
کے چادر میں ڈھانک لیا۔ اور چہرہ سرنگون کر لیا۔

اصمعی نے جب دیکھا کہ وہ متوجہ ہی نہیں ہوتی تو پوچھا "آخر اس رنج
والم کا کوئی سبب ہی؟ اور گو ہم اجنبی ہیں مگر درد دل کا اظہار خوبصورت چہرے
کا دکھانا نہیں ہی کہ آپ کو اس میں تامل ہو" جواب میں بجائے اس کے کہ بات
کرے اس نے یہ دو شعر پڑھ دیے۔

فَاِن تَسلَانِی فِیمَ حُزنِی فَاِنَّنِی　　رَہِینَۃُ ہٰذَا القَبرِ یَا فِتیَان

اگر تم دونوں یہ پوچھتے ہو کہ میرا غم کیوں ہی تو اے نوجوانو میں اس قبر کے ہاتھ گرو ہوں

وَاِنِّی لَاَستَحیِیہِ وَالتُّربُ بَینَنَا　　کَمَا کُنتُ اَستَحیِیہِ حِینَ یَرَانِی

گو کہ ہمارے اُس کے درمیان مٹی کا ڈھیر حاجب ہی مگر میں اس سے اب بھی ویسی
ہی شرماتی ہوں جس طرح کہ اس کی آنکھوں کے سامنے شرمایا کرتی تھی۔

اصمعی کہتا ہی اس نازنین کا یہ برجستہ جواب سن کے ہم دونوں مبہوت
و ششدر رہ گئے۔ مگر وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ پاس سے

سے آئے اور اُس کی نظر بچا کے قریب ہی درختوں کی آڑ میں چھپ رہے تاکہ
دیکھیں یہ نازنین یہاں اکیلی بیٹھ کے کیا کرتی ہی۔ مگر اتنے قریب پہنچے تھے کہ
اُس کی آواز بخوبی ہمارے کانوں میں آ سکتی تھی۔ اب جب ان تماشائی دیکھنے
اُس نے یہ اشعار سوز و گداز کے لہجے میں گانا شروع کیے۔

یا صاحب القبر یا من کان یونسنی   وکان یکثر فی الدنیا مواساتی

اے قبر والے! اے وہ جو میرا انیس تھا اور جس سے ہمیشہ سامان محبت بڑھتا ہی جاتا ہے۔

قد زرت قبرک فی حلی وفی حللی   کانی لست من اہل المصیبات

اس نے بھاری بھاری جوڑے پہن کے اور گہنے سے آراستہ ہو کے تیری قبر کی زیارت کی جیسے مجھ پر کوئی مصیبت پڑی ہی نہیں۔

رضیت ما کنت تہوی ان تراہ وما   قد کنت تالفہ من اہل ہیئات

میں تو اپنے اوپر فرض کر لیا ہو کہ جیسا تم مجھے دیکھنا چاہتے تھے ویسا ہی دکھاؤں اور جتنی وضعیں تمھیں پسند تھیں تمھارے سامنے رہیں۔

یہ اشعار سُن کے اصمعی پر بے انتہا اثر پڑا۔ وہ اور اس کا رفیق شام تک وہیں چھپے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہوئی اور حضرت نصیب لطیفہ قبر سے اُٹھ کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ جذبات انسانی کے یہ دونوں جاسوس بھی اندھیرے میں اُس کے پیچھے ہو لیے۔ اور جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اُنھوں نے اُس کا پیچھا چھوڑا اور واپس آ کے یہ سرگذشت ہارون رشید سے بیان کی۔

رشید نے سنتے ہی ایک آہ کھینچی اور کہا واہ! دنیا میں سب نعمتیں مل جاتی ہیں مگر ایسی وفادار بی بی نہیں نصیب ہو سکتی۔ کاش وہ میری بی بی ہوتی مگر جو کچھ ہو کوشش ضرور کروں گا۔ اور فوراً اپنے عامل حیرہ کو فرمان بھیجا کہ فلاں مقام اور فلاں بستی میں فلاں مکان میں ایک کمسن بیوہ ہی۔ اس کے ولیوں کو دس ہزار درہم میری طرف سے بطریق مہر دو اور اُس حسین لڑکی کو نہایت ہی عزت و آبرو سے میرے پاس بھیجو۔

افسوس رشید نے اس نازنین کی قدردانی تو کی مگر اس کا خیال
نہ کیا کہ ایسی محبت وعصمت والی بی بی جس کی ہو چکی اُسکی ہو چکی۔ پھر اُسکے بعد
کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دوسرے کی ہو جائے تو پھر محبت ہی
کیا ہے؟ ذوالرمہ نے لطیفہ کے چچا کو روپیہ دیا۔ اور بلا لحاظ رضامندی
حاکمانہ انداز سے اُس کو رخصت کرا کے بڑے کر و فر اور نہایت ہی اہتمام
کے ساتھ بغداد کی طرف روانہ کیا۔ ادھر حسرت نصیب لطیفہ سے وہ پیاری قبر
بھی چھوٹ گئی جو اُس کے جینے کا سہارا تھی۔ جس کے سامنے جا بیٹھنے کی اور سیکڑوں
طرح کے جناو کر کے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی اور دنیا کو اپنے حسن کی
بہار دکھایا کرتی تھی۔ اب شاہی جلوس اُسے ملکۂ عالم بنا کے بغداد کی طرف
لیے جاتا تھا۔ مگر اُس کا دل مرحوم محبوب کی قبر ہی سے لپٹا ہوا تھا۔ اسی کشمکش
میں مدائن کے کھنڈر دن تک پہونچی تھی کہ فراق تربت دلدار کے صدمے سے ناگہان
روح پرواز کر گئی۔ سب [illegible] کر کے رہ گئے۔ اور اصمعی اور رشید دونوں
[illegible] افسوس ملنے لگے۔ اُس کے اس جان دینے
کا رشید کے دل پر اس قدر اثر ہوا تھا کہ اصمعی کہتا ہے۔ اُس کی
یاد زندگی بھر [illegible] مسند خلیفہ کی آنکھوں
میں آنسو [illegible]

ریویو

مقالات سرسید۔ شیخ ضیاء الحق صاحب نے بہت ہی اعلیٰ درجہ کا کام کیا ہے۔
سرسید مرحوم کے تمام اقوال [illegible] قسموں میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے
دینی و دنیوی ہر قسم کی ہدایتیں بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور ہدایت کے
بعد اُس کے ماخذ [illegible] کا حوالہ دیا ہے۔ سید صاحب مرحوم کے
ہر معتقد کو اس کتاب کا ایک نسخہ لازمی طور پر اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ پوری
کتاب ۲۰/۲۲ پیمانے کے ۲۴۴ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ چھپائی

بھی بڑی نہیں - اور قیمت فی جلد ایک روپیہ ہے - ہمیں یقین ہے کہ سید صاحب کے دلدادہ اُن جواہر بے بہا کی خریداری میں جو اس دُرج میں جمع کر دیے گئے ہیں نقد جان نذر کرنے میں تامل نہ کرینگے -

درخواست - جناب شیخ ضیاء الحق صاحب سابق ایڈیٹر ہندوستانی کے پاس آنا ناگزیر ہے چونکہ ہمیں اُنکے پتہ بھیجی جائیں -

قواعد اردو - مولوی محمد عبد الحق صاحب بی اے مہتمم تعلیمات اورنگ آباد (ریاست نظام) اور سکرٹری انجمن ترقی اردو کی وہ بے مثل تصنیف جس کا مدت سے انتظار تھا آخر شائع ہوگئی - ہماری امید کے مطابق مولانا نے اردو زبان کی نحو و صرف کو نہایت ہی صحیح اصول پر مرتب فرما دیا ہے اور تمام مروجہ قواعد کو منسوخ کر دیا ہے - گو کہ ہمیں اس سے بعض مقامات میں جزئی اختلاف ہے مگر کلیۃً اس کو اپنی زبان کی قابل فخر تصنیف تسلیم کرتے ہیں - اب اِن اصول کو پیش نظر رکھ کے جو کتابیں لکھی جائینگی زبان کی بیجد اصلاح کرینگی - نظام گورنمنٹ اور نیز برٹش گورنمنٹ کے محکمہائے تعلیم کو بلا تامل اسے نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہیے - پنجاب اور صوبہ جات متحدہ کو ایسی تصنیف کی بیحد ضرورت تھی - اب اگر وہ قدردانی نہ کریں تو سمجھنا چاہیے کہ زبان اردو کے متعلق وہ اپنے فرائض کو کبھی ادا نہ کر سکینگے - قیمت صرف ایک روپیہ ہے - الناظر پریس - لکھنؤ فلاورل سے یا خود سکرٹری صاحب انجمن اردو سے " اورنگ آباد - ریاست نظام " کے پتہ سے خط بھیجکے طلب کی جائے -

---

اطلاع

خریداران دلگداز کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ خط و کتابت میں اپنا خریداری کا نمبر لازمی طور پر بتا دیا کریں جو اُن کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے - رجسٹرڈ نمبر اے ۱۳۱ ڈاکخانہ کا نمبر ہے اُس کے حوالہ کی ضرورت نہیں -

"منیجر دلگداز"

نرخ نامہ اجرت اشتہار

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ دلگداز کی اشاعت دو ہزار سے زیادہ ہے اور ایک مشہور اور مستند رسالہ ہونے کی وجہ سے تمام خریدار اسکے پرچون اور اسکی جلدونکو محفوظ رکھتے ہین - اور اشتہارات کے لیے اشاعت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہین ہو سکتا - عام اخبارات پر صرف ایک دفعہ اشاعت کے وقت لوگونکی نظر پڑتی ہے اور دلگداز کے اشتہارون پر سالہا سال تک ہمیشہ نظرین پڑتی رہتی ہین مجھے یقین ہے کہ دلگداز مین اشتہارات کو شائع کرکے آپ جو فائدہ اٹھا سکتے ہین اور کسی طرح ممکن نہین - اس سے پہلے دلگداز مین اشاعت اشتہارات کی طرف بہت کم توجہ کیگئی لیکن اب خاص اہتمام کیا گیا ہے - دلگداز کی قیمت اسقدر کم ہے کہ قطعی امید ہے کہ سال کے اندر اندر اس کی اشاعت چار یا پنج ہزار ہو جائیگی - ڈیڑھ روپیہ سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور ختم سال پر ایک نیا ناول مفت - اس صورت مین کون خریدار نہ کرے گا -

نرخ نامہ حسب ذیل ہے

قسم کاغذ	مدت اشتہار	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
معمولی کاغذ	سالانہ	[illegible]	[illegible] ۳۵	[illegible] ۲۵
"	چھ ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible] ۱۵
"	تین ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
"	ایکبار	[illegible]	[illegible]	[illegible]

ٹائیٹل پیج - پورے صفحہ اور سال بھر سے کم کیلیے اشتہار نہ لیا جائیگا - اجرت فی صفحہ سالانہ - [illegible]

المشتہر منیجر دلگداز مرزا دولت بیگ خان لکھنو

دلگداز پریس

عمدہ اور اعلی درجہ کی چھپائی اور پھر اسکا وقت پر ہوجانا عنقا نہین تو مفقود کیا گیا ہے - اس کمی کو دیکھکے دلگداز پریس میں چھپائی کا نہایت اعلی درجہ کا انتظام کیا گیا ہے اور اس اہتمام سے ساتھ [illegible] کتاب کے مکمل چھپائی [illegible] اسی تاریخ دیدیجاتی ہے اس مطبع کو خاص فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ مولانا شرر [illegible] تصحیح وغیرہ [illegible] مدد مل سکتی ہے - جن صاحبون کو اپنی کتابین عمدہ [illegible] چھپوانا منظور [illegible] ہے - اگر خیال ہے کہ [illegible] اعلی درجہ کی چھپائی ہوتی ہے - چھپائی کا نرخ [illegible] سے طے ہو سکتا ہے [illegible] کاغذ اور چھپائی کی [illegible] پر ہے -

المشتہر منیجر دلگداز پریس لکھنو

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس میں چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

ہندوستان مین مشرقی تمدن کا آخری نمونہ

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنعت شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتداءً فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامہ سے ہوئی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانا ے روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور ہاتفی وغیرہ نے اس مین اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اردو مین میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویان دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے مین لکھی تھین مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہین کہ مثنویون کے تذکرے مین اُن کا ذکر بھی بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اردو مین میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی مین اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہین کی صحبت مین اُن کا نشو و نما ہوا تھا۔ یہین پرورش پائی تھی۔ اور یہین کی آب و ہوا کے آغوش مین اُن کی شاعری پلی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے اُن سے مثنوی "بے نظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانہ مین نواب مرزا محمد تقی خان ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنون لکھی۔ اور لکھنؤ مین مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش اور ناسخ کے زمانے مین تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق اُبھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق زہر عشق اور فریب عشق لکھین۔ اور انھین اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنے و اعلےٰ کی زبان پر ان مثنویون کے اشعار چڑھ گئے۔ اس سے پیشتر کے زمانے مین کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب مین لذت عشق

نام ایک مثنوی لکھی تھی وہ نواب مرزا شوق کی مثنویون کے ساتھ شائع ہونے کی وجہ سے اُنھین کی جانب منسوب ہو گئی۔ لیکن حقیقت مین نہ وہ اُن کی ہی اور نہ اُن کے زمانے کی ہی۔

ان سب مثنویون کے دیکھتے مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیون سے مملو ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیان اپنے کلام مین پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہونے سے قدم قدم پر ٹھوکرین کھاتا ہی۔ اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہین حاصل کر سکتا۔ اِس کے جواب مین آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر مین ایک مثنوی لکھی تھی۔ جس مین غلطیون سے پاک رہ کے تشبیہات استعارات اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے۔ مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی۔ اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اُس پر غالب نہ آسکی۔ دہلی مین ان دنون مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویان لکھین جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئین۔

مومن خان کے مذاق شاعری مین نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی۔ خیالی تشبیہون اور استعارون پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے۔ مثنویون مین وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو مشخص کر کے اپنے کلام مین ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے۔ مومن خان کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ مین آئے۔ اور یہان کے مشاعرون مین اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہو گئے۔ نسیم دہلوی نے لکھنؤ مین اپنے اُستاد کے رنگ کو خوب چمکایا۔ اور اُن کے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اردو مثنویون مین نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیان دکھا دین۔ اور نظم اردو مین جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لا کے کھڑے کر دیے۔ ادھر آخر زمانے مین مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت مین ساقی نامہ شقشقیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اُس کا جواب نہین ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خان کی چند مختصر مثنویون سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ مین ہوا۔ اور ترقی بھی یہین ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کے ذریعہ سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہین - جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دیدی - لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبرآبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اُسے مثنوی میر حسن کے مقابلہ مین رکھنا اردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے - صحیح مقابلہ ہو سکتا ہی تو مثنوی میر حسن اور مثنوی طلسم الفت کا - اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہین بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانون کا مقابلہ ہی - اسلیے کہ مثنوی میر حسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا -

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے - قدیم عربی شاعری مین زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن مین اظہار کمال کا ذریعہ تھے - فارسی مین مرثیہ خوانی کم و بیش پڑ گئی تھی - لیکن جب بعہد سلاطین صفویہ ایران مین مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعرا کو مرثیہ خوانی کیطرف توجہ ہوئی - مولانا محتشم کاشی نے چند بندون کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا - اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسین مین دو ایک مرثیہ بھی موزون کر دیا کرتے - لیکن شعر و سخن کی دنیا مین مرثیہ گوئی کی وقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو" پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ مین مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدردانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا - اور در اصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اِسی تاریخی واقعہ مین مستتر ہے - ہندوستان مین مغلون کی سلطنت تھی جنھون نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا - اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی - نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان مین آتے ہی آنکھون پر بٹھایا جاتا - اور اُس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہون سے دیکھی جاتی - دہلی کی سلطنت مین بادشاہون کا مذہب سُنی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتون کو

چھپاتے - اور وہان کی محفلون مین اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل مین تھے - اودھ کا دربار شیعہ تھا - اور یہان کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا - اسلیے یہان ایرانی بالکل کھل گئے - اور اپنے اصلی رنگ مین نمایان ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوے اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہان کے اہل دربار نے اُن کے اوضاع واطوار کو حاصل کرنا شروع کیا - اور ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان وشوکت کے آغوش مین پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت مین سرایت کر گئی -

غرض سودا و میر کے زمانے مین میان سکندر - گدا - مسکین اور افسردہ مرثیہ گو تھے - جو چھوٹی چھوٹی نظمین شہادت امام حسین کے بیان مین تصنیف کر کے مجلسون مین سنادیا کرتے - اُن کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی - اور مرثیون کی موجودہ وضع انھین کے زمانے مین ایجاد ہوئی - یہان تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحبزادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا اور ان دونون بزرگون نے مرثیہ خوانی مین ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر وسخن کے آسمان پر آفتاب وماہتاب بن کے چمکے - وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ مین رہا تھا اب میر انیس اور مرزا دبیر مین قائم ہوا - مرزا دبیر مین شوکت الفاظ تھی - بلند خیالی تھی - اور علم وفضل کا زور تھا - میر انیس مین سادگی - بے تکلفی اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیان تھین جو سوا مبداء فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہین آسکتین - ان دونون بزرگون نے فن مرثیہ گوئی کو اور شاعری کی تمام اصناف سے بڑھا دیا - اور ادب اردو مین وہ نئی چیزین پیدا کر دین جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتین ڈھونڈھنے لگی تھین -

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہونچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی بجاے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی - تمام اہل لکھنؤ ان دونون بزرگون کے اس قدر معترف و مداح ہوے کہ سارا شہر دو گروہون پر بٹا ہوا تھا - اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا - اور ان دونون گروہون مین

ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیون کے بعض مقررون اور خطیبون کی نسبت سنا جاتا ہی کہ اُنھون نے اپنی تقریرون مین اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششین کی تھین۔ اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو مین اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر مین اِس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے جس کی ترقی مین اب تک کوششین جاری ہین۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی مین اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باکمالون کی شاگردی کرین تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہون۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہی اُس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا۔ اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اردو مین بھی اُس کی طرف کبھی توجہ نہین کی گئی۔ سنسکرت مین اعلے درجہ کے ڈراما تھے۔ مگر اُن سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل ناآشنا ہو چکی تھی۔ رام چندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوون مین مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے مگر اردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُلمپیا کی طرح کھلے میدانون مین رزمیہ نقالیون کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرایے مین مذہبی اسٹیجون پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے "جو رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس ہی کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے اُنھون نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس مین دو کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوے جوگی بن کے دھونی رماتے۔ اور بہت سی عورتین پریان اور عاشق مزاج گوپیان بن کے اُنھین ڈھونڈھتی پھرتین۔

پھر جب قیصر باغ کے میلون کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھل گیا تو سارے شہر کے شوقینون مین ڈراما کا مذاق پیدا ہو کے خود بخود ترقی کرنے لگا - اور چند ہی روز مین اِس شوق کو اِس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیان کرنے اور ڈراما لکھنے لگے - چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میان امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی اور موجودہ عہد کی کمپنیون کی طرح شہر مین جا بجا مختلف جماعتین اُن کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگین - جن مین کہین عورتین اور کہین کمسن لڑکے ایکٹ کرتے - اِس اندر سبھا مین اصول موسیقی کے مطابق دلکش دُھنین قائم کی گئین - اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسہ دیکھنے کا مشتاق تھا - میان امانت کی اندر سبھا کی کامیابیان دیکھ کے اور لوگون کو بھی شوق ہوا - اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے - اور سب کا نام "سبھا" قرار پا گیا - چنانچہ شہر مین مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائین قائم ہو گئین جن کے پلاٹ بدلے ہوے تھے -

سبھا کے نئے رنگ نے شہر مین ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے - ہر طرف سبھاؤن کی دھوم تھی - اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظمون مین اور دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائین - اس مین شک نہین کہ پارسی تھیٹرون نے اپنی انتظامی خوبیون اور نمائشی دلفریبیون کی وجہ سے سبھاؤن کا رنگ پھیکا کر دیا - لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پُرانا مذاق جو لکھنؤ مین ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا - اول تو پارسیون نے بھی اِس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے - اُن کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا - اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسون مین آج تک سپیرے - ہرکشن چندر - وغیرہ کے ایسے بیسیون پر فارمنس ہو رہے ہین اور اس مذاق کے ایکٹرون کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا مین سے قومی ڈراما کا مذاق اُٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے - بہر تقدیر اس مین شک نہین کیا جا سکتا کہ اردو

ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی مین پڑی۔ اور یہین سے سارے ہندوستان مین اس کا رواج ہوا۔

اردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہین۔ یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہین۔ اور اُن کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہی کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار اس کے بعد معشوق کا سراپا۔ اُس کی بے وفائیان۔ پھر اُس سے روٹھ کے اُسے یہ یاد کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہو گئے۔ اُس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کر کے معشوق کو جلانا چھیڑنا۔ جلی کٹی سنانا اور یون اُس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کر لینا۔ نظم اردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی۔ اور زمانۂ وسط کے قریب قریب تمام شاعرون نے واسوخت لکھے ہین۔ اور اُن مین بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہین۔ دہلی مین بھی بعد کے زمانے مین مختلف واسوخت لکھے گئے۔ خصوصاً مومن خان نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے۔ مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا۔

اُمرا کی عیاشانہ طبیعتون نے شاعری کی کئی اور صنفون کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا۔ ان مین سب سے زیادہ مہمل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پر لطف ریختی ہی۔ ہزل گوئی کا آغاز دہلی مین جعفر زٹلی سے ہوا۔ جو غالباً محمد شاہ کے زمانے مین تھے۔ اُن کے کلام کو مین نے اول سے آخر تک دیکھا ہی۔ سوا فحش گوئی اور حد سے گذری ہوئی بیحیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہی اور نہ زبان کا کوئی لطف ہی۔ اس کے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبقران کو پیدا کیا جن کا عروج غالباً لکھنؤ مین اور لکھنؤ کے درمیانی دور مین ہوا۔ اگرچہ ان کے حالات اور اُن کا زمانہ مجھے کسی معتبر ذریعہ سے نہین معلوم ہو سکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہی کہ لکھنؤ ہی کے مبتذل مذاق والے رئیس زادون مین اُن کا نشو و نما ہوا۔ اُن کا دیوان ملتا ہے۔ اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسون دور ہی مگر پھر بھی اُس مین ایک بات ہی۔ شاعرانہ خوبیون کے ساتھ زبان اور محاورون کا پورا لطف ہی۔ لیکن اِس فن کو لکھنؤ کے آخری دور مین میان مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہونچا دیا۔

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعون اور سنیون کے متعصبانہ

جذبات کا لحاظ کرون یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ مین جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہر اصول مین ترقی شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزون پر ہے۔ ایک تو لاّ یعنی اہلبیت کرام اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت۔ اور دوسرا تبرا یعنی اُس محترم خاندان کے دشمنون سے اپنی برات ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب وشتم کی صورت اختیار کر لی۔

اصولاً اس عقیدے مین سُنی بھی اُن کے ساتھ شریک ہین مگر فرق یہ آ پڑا کہ پہلے تینون جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیا و رسل اور سچے جانشینان رسالت مانتے ہین۔ اور شیعہ اُن کو غاصب و ظالم بتاتے ہین۔ اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقا مین خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی تبرا واجب ہوگیا۔ جس کو مہذب اور صاحب علم لوگون نے اگرچہ لفظ برات کے صحیح معنون کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق اُن پر زبان سب وشتم دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سنی شیعون کی باہمی تعصب کی بنا قرار پاگئی۔

ان دونون مذہبی چیزون نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تولاّ نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش مین لے کے جملہ اصناف شاعری سے بڑھا دیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پرانی ہجوگوئی کو اختیار کر کے اُسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد با کمال لکھنؤ مین مشہور ہوے مگر افسوس کہ یہ چیز بالتخصیص اہل سنت کو ناگوار گزرنے والی تھی عہد شاہی مین اس پر تلوارین نکل پڑا کرتی تھین۔ اور انگریزی مین بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریان اور مقدمہ بازیان ہو جایا کرتی ہین۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی و ہرزیہ خوانی کو مکانون کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور باعث النزاع نہ ہوتا تو نظر آتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گویون نے اپنی ہجوگوئیون اور فحاشیون مین بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہین۔

اس فن مین سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میان مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجو گوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر مشیر نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ نہذیما الفاظ۔ طرز ادا۔ اور استعمال تشبیہات مین جیسی مضحکہ خیزی پیدا کی۔ اور صحبت کو بارے ہنسی کے لٹا دینے۔ اور سامعین کے پیٹ مین بل ڈالدینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اُس کی خوبیان اور بیدتمین بیان سے باہر ہین۔ ابتذال مین پھر لطف پیدا کر کے اُسے شائستہ لوگون کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دینا اُن کا تمام جو ہر تھا جو اُن سے پہلے اور بعد کسی کو نہین نصیب ہوا۔

ہزل گوئی کے سلسلہ مین میان چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانہ وطن مین عاشور علی خان نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ اُن کے دربار کی صحبت اُس وقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل تہذیبی نمونہ تھی۔ انھین نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہین کہ انھین کی صحبت مین صاحبِ ان کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر مین پیشاب پیخانے کی رعایت رکھتے۔ اور اُن کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہون گے۔ مگر چونکہ ان کو ایک قسم کی خصوصیت تھی ہم نے اُن کا ذکر کر دیا۔ اُن کے کلام مین بعض شاعرانہ خوبیان اور اچھی تشبیہین بھی ہین مگر اُن کے مذاق نے اُن خوبیون کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رسان نہین۔ مردون اور عورتون کے محاورون اور لہجے مین تھوڑا بہت فرق ہر زبان مین ہوا کرتا ہے۔ مگر اتنا نہین جتنا کہ اردو مین ہے۔ یا شاید ہین دوسری زبانون میں اتنی قدرت نہ ہو کہ مردون اور عورتون کی زبان کا جتنا فرق اپنی زبان مین نظر آتا ہے اُن مین نہ نظر آتا ہو بہرحال ہمارے علم کی حد تک اردو اس خصوصیت مین بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا مذاق تھا کہ عورتین شعر کہتین تو اپنی زبان مین کہتین۔ اور اگر مرد کبھی عورتون کی زبان ... خیال کراتے تو زبان ... لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کی زبان اختیار کر لیتے۔ ... حال انگریزی کا ہے اردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردون کی زبان مین رہی۔ یہان ... اگر اس مین عورتین کہتی بھی ہین تو مرد بن کے کہتی ہین۔ مردون ہی کی زبان اختیار

کرتی ہین اور اپنے لیے ضمیرین تک مذکر استعمال کرتی ہین - اگر شاعر کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہین پہچان سکتا کہ یہ کسی عورت کا کلام ہی یا مرد کا -

اردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانون مین خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے - میر حسن نے اپنی مثنوی مین ضرورت کے موقعون پر یہ زبان موزون کی تھی - مگر وہ اِن تک مضائقہ نہ تھا - میان رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا - جو دہلی کے رہنے والے تھے - اور لکھنو کی صحبتون مین شریک رہا کرتے تھے - ابتداءً مہذب لوگون کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا - چنانچہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنو مین دہلی کے جن رندیون رسیدہ بزرگ اور وہین کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے اس مین وہ بہت رنگ فرماتے ہین - اور سب سے زیادہ ایک اور سنیے کہ سعادت یار طہماسب کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے - رنگین تخلص ہے - ایک قصہ کہا ہی - اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہی - رنڈیون کی بولی اُس مین باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے - ہر چند اُس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا - پر منیر کی مثنوی نہین کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین - بھلا اس کو شعر کیونکر کہیے؟ سارے لوگ دتی کے لکھنو کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہین -

چلی وہان سے دامن اُٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے - کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلم - لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا - تیغ کا چلانے والا تھا - تو ایسا قابل کہان سے ہوا؟ اور شہدپن بہت مزاج مین رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہی - اسواسطے کہ بھلے آدمیون کی بہو بیٹیان پڑھکر مشتاق ہون - اور اُن کے ساتھ اپنا مُنہ کالا کرے - بھلا یہ کلام کیا ہے -

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو یہان سے ہی کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہی ع کہین ایسا نہ ہو کمبخت مین ماری جاؤن - اور ایک کتاب بنائی ہی اُس مین رنڈیون کی بولی لکھی ہے - جس مین اوپر والیان چیلین - اوپر والا چاند -

اُجلی وسوبت - وغیرہ وغیرہ"

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانوں کی رنگینی نے رنگین کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اودھ کا ایک فن ہوگیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ میں ہوئی۔ اور یہیں اسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلہ میں اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجہ کمال کو پہونچا دیا تعریف نہیں ہو سکتی۔ صفحہ کے صفحہ پڑھتے چلے جایئے یہ نہیں پتہ چلتا کہ موزون کرنے میں شاعرانہ ضرور توں نے زنانی زبان پہ کہیں کچھ تصرف بھی کیا ہی یا نہیں ہے لیکن غزل گوئی میں رنگین کی جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خان کی خراد پر چڑھ کے تیار ہوئے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہوگیا۔ انھوں نے غزلیں کہیں۔ واسوختی کہی اور اور بھی کئی نظمیں کہیں۔

ریختی میں اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کرکے پاکدامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی اس لیے ریختی گویوں کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہوگیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو۔ مگر اخلاق کو نقصان پہونچا۔

اکرموا عزیز قوم ذل

یہ ایک فرمان رسالت ہی جس کا مطلب یہ ہی کہ کوئی معزز شخص ذلیل ہو جائے تو اُس کی عزت کرو۔ انقلابات عالم سے صدہا ایسے واقعات پیش آئے ہیں جو مایۂ عبرت ہیں۔ اور جن کو دیکھ کے بڑے بڑے سنگدل لوگوں کے دل تھرا اُٹھے ہیں۔ مگر افسوس ہمارے دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ ہمیں کسی چیز سے عبرت نہیں ہوتی۔ ہم خاندان تیموریہ کی [illegible] یادگاروں اور

اگلے دولت مند گھرانون کے بہت سے باقیات الصالحات کو حد سے زیادہ تباہی و مفلوک الحالی اور انتہا سے گزری ذلت و مسکنت مین دیکھتے ہین اور دل نہین پسیجتا۔

اگر سلطنت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور سطوت و جبروت نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا قوم مین بھی اتنی قوت نہین ہے کہ اپنی تاریخ کے اِن بوسیدہ و کرم خوردہ تبرکات کو عزت سے نہین تو حفاظت ہی سے رکھے؟ موجودہ گورنمنٹ کو الزام دینا یا اپنے سستم کشون کا بار برٹش گورنمنٹ کے سر ڈالنا حماقت ہی کیونکہ سلطنت پر اُن کی کوئی حقوق نہین۔ مگر ہم پر ان کے حقوق ہین۔ دراصل یہ ہماری قومی زندگی کی مُورتین ہین۔ اور ہماری قومی زندگی ہی فیصلہ کر سکتی ہی کہ اِن یادگار مورتون کو اچھی طرح رکھین یا بُری طرح۔ سچ یہ ہی کہ ہم مین ایسی نفسی نفسی پڑ گئی ہے کہ قومی زندگی باقی ہی نہین رہی۔ ورنہ کیا ممکن تھا کہ ہمارے تاجدار ان سلف کی نسل یون غارت ہو؟ اور آغوش سلطنت مین پلے ہوؤن کی اولاد در در دروازہ گری کرے؟ ہرگز نہین۔ ہم بدنظمی اور بے اصولی کے ساتھ صدہا فیاضیان کر رہی ہین۔ اور کسی ایسے قومی فنڈ کا قائم ہو جانا دشوار نہ تھا کہ ملوک سلف کی نسل عزت سے رکھی جائے۔ اور اسکی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دے کے سنبھالا جائے مگر اپنے ذاتی اغراض پر قومی مقاصد کو قربان کر دیا ہے۔ اور اپنی نفس پروری کے آگے اس کی مطلق پروا نہین کرتے کہ ہماری قومی عزت کس طرح خاک مین مل رہی ہے۔ اور ہمارے ناموران سلف کی نسل کا کیا حال ہی۔

مگر ہم ہمیشہ ایسے بے حس نہ تھے۔ عبرت ناک واقعات کا ہم پر اثر ہوتا تھا۔ اور قومی فلاح اور قومی وقار کو شخصی جذبات پر ہم قربان نہین کیا کرتے تھے۔

جب بنی امیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اُس بدنصیب خاندان کے تمام لوگ چُن چُن کے مار ڈالے گئے۔ نئی خلافت عباسیہ کے دو تاجدار کامرانی و اطمینان سے حکومت کر کے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ اور بنی امیہ کا مشرق مین کہین نام و نشان نہ تھا تو تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ اُس کی لونڈی خیزران (جسے خاص محل کا رتبہ حاصل تھا سارے حرم کی مالک اور ولی عہد سلطنت کی مان تھی) ایکدن محل مین شان و شوکت سے بیٹھی حکومت

کر رہی تھی کہ ایک لونڈی نے آکے ادب سے عرض کیا، خدا ملکۂ عالم کو سلامت رکھے ڈیوڑھی پر ایک حسین عورت کھڑی ہی اور باریابی کی امیدوار ہے۔ ہر چند پوچھا نہ اپنا نام و نشان بتاتی ہی نہ نسب و خاندان کا پتہ دیتی ہے۔ اور نہ یہ کہتی ہی کہ عرض کیا ہے" عبداللہ بن عباس کی پرپوتی زینب بنت سلیمان جو خاتونان بنی عباس مین صاحب ذہن رسا مانی جاتی تھین پاس بیٹھی تھین۔ خیزران نے اُن سے کہا، "تم اس عورت کے بارے مین کیا کہتی ہو؟ آنے دون یا نہ آنے دون؟" زینب نے کہا "بلوائیے۔ کوئی مفید ہی بات ہوگی" اس مشورے کے مطابق لونڈی کو حکم دیا گیا کہ جاؤ بلا لاؤ۔

چند منٹ گزرے ہون گے کہ اُس لونڈی کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و صاحب جمال مگر فلاکت زدہ اور شکستہ حال عورت شریفزادیون کے انداز سے آئی۔ مگر خیزران کا سامنا ہوتے ہی دروازے کے دونون بازوؤن کے درمیان ہی ٹھٹھک کے کھڑی ہوگئی۔ اور وہین سے کہا "اے ملکۂ عالم آپ کی خدمت مین آداب عرض کرکے التماس ہے کہ مین آخری تاجدار بنی امیہ مروان بن محمد کی بیٹی مزنہ ہون" یہ نام سنتے ہی جیسے خیزران کے تن بدن مین آگ لگ گئی۔ اور جھنجھلا کے کہا "تیرے لیئے نہ مرحبا ہے اور نہ سلام کا جواب۔ خدا تجھے غارت کرے۔ وہ گھڑی بھی تجھے یاد ہی جب ابراہیم بن محمد عباسی کی لاش بے گور و کفن پڑی تھی۔ اور بنی عباس کی بڈھی عورتون نے تیری خدمت مین حاضر ہوکے اتنی التجا کی تھی کہ اپنے باپ سے سفارش کرکے اُن کے دفن کی اجازت دلوا دے۔ لیکن بجائے ترس کھانے کے تو غصے سے اُنھین مارنے کو دوڑی۔ اُنھین گالیان دین۔ اور اپنے محل سے نکلوا دیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اُس نے اپنی نعمت تجھ سے چھین لی۔ اور تجھے ذلیل و خوار کرکے اِس درجے کو پہونچا دیا" خیزران کی زبان سے یہ طیش کا جواب اور یہ کلمات غیظ و غضب سن کے مزنہ نے بجائے اس کے کہ ڈرے یا کچھ مرعوب ہو زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور بولی۔ "بہن۔ آپے سے باہر نہ ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ میری اس بدسلوکی پر خدا نے مجھے جو جو ایذائین دی ہین اُن مین سے تمھین کون سی سزا پسند ہی جو میرا ہی سا سلوک تم بھی میرے ساتھ کر رہی ہو؟ تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہی۔ خدا کی قسم مین نے یہی کیا تھا۔ اور اُس کی سزا یہ ملی کہ خدا

مجھے ذلیل و خوار اور ننگا بھوکا کر کے تمہارے سامنے لایا ہے کہ جو سلوک چاہو کر و
اُسوقت تم نے میرے اُس سلوک پر جو صبر و شکر کیا تھا اُس کا انعام تمہیں یہ ملا
کہ ملکۂ عالم ہو اور میں تمہارے سامنے عاجز و خوار بنی کھڑی ہوں" اتنا کہتے ہی مزنہ
نے کہا "لو بہن خدا حافظ۔ جاتے ہیں" اور پیٹھ پھیر کے چلی کہ جھپٹ کے محل سے نکل جائے
اُس کی ان باتوں کا خیزران کے دل پر کچھ ایسا اثر پڑا تھا کہ بے تحاشا
دوڑی۔ لپک کے روکا اور چاہا کہ گلے لگا لے۔ مگر مزنہ نے دونوں ہاتھوں سے
الگ کر کے کہا "میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ تم سی ملکہ مجھے گلے لگائے۔
چیتھڑے لگائے ہوں۔ اور ان کپڑوں میں ایسی تعفن آ رہی ہے کہ آپ کا
دماغ خراب ہو جائے گا" یہ سُن کے خیزران نے لونڈیوں کو حکم دیا کہ فوراً
انھیں حمام میں لیجا کے غسل کراؤ۔ اسکے بعد پُرتکلف جوڑا پنھا کے اور عطر میں
بسا کے لے آؤ"

یہ کہہ کے خیزران چلی آئی۔ اور محل کی لونڈیوں نے نہایت ہی تعظیم و تکریم
سے مزنہ کو نہلایا۔ کپڑے پنھائے عطر لگایا۔ اور خوب بنا چنا کے لے آئیں۔ صورت
دیکھتے ہی خیزران اُس کے سینے سے لپٹ گئی۔ پھر اپنے برابر مسند پر جہاں
خود خلیفہ مہدی آ کے بیٹھا کرتا تھا بٹھایا۔ اور پوچھا "دسترخوان بچھواؤں؟"
مزنہ نے صاف صاف کہا "آپ پوچھتی کیا ہیں؟ شاید مجھ سے زیادہ بھوکا
سارے اس محل میں کوئی نہ ہوگا" فوراً دسترخوان بچھا۔ قسم قسم کے کھانے لا کے
چن دیے گئے۔ اور مزنہ نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ خواصوں نے ہاتھ دھلوائے
اور جب ہر طرح کی خاطرداریوں سے فراغت ہوئی تو خیزران نے کہا "اب
بہن بتاؤ تمہارا خبرگیراں کون ہے؟" بولی "خبرگیراں! جو کچھ قرابت ہی
اِسی گھر سے ہے۔ اِس کے سوا میں ساری دنیا میں کوئی عزیز قریب نہیں رکھتی"
یہ جواب سن کے خیزران بولی "تو پھر تم یہیں رہو۔ چلو میں اپنے محل تمھیں دکھاتی
ہوں۔ اُن میں سے جو محل پسند آئے لے لو اور اُس میں رہو"

اس تجویز کے مطابق خیزران نے اُسے اپنے سارے محل دکھائے۔
جن میں سے ایک خوبصورت وسیع اور پُر فضا قصر اُس نے پسند کیا۔ خیزران

نے وہیں کھڑے کھڑے فرنیچر سے اُسے خوب آراستہ کرایا۔ اور ہر طرح کا سامان زندگی فراہم کرا کے کہا "لو بی بی تم یہان آرام سے رہو سہو۔ اور آج سے مجھ مین تم مین بہناپا ہو گیا۔ جب تک جیتے ہین ساتھ نہ چھوڑین گے" مزنہ نے شکریہ ادا کیا۔ اور خیزران اُسے وہان چھوڑ کے اپنے محل مین آئی۔ پھر دل مین کہنے لگی "کبھی اس عورت کی جو کچھ شان و شوکت تھی تھی۔ لیکن زمانے نے سرد مہری کی۔ اور دل شکستہ ہو گئی۔ اب اس کے دل کی کلفت صرف دولت سے دور ہو سکتی ہے" یہ خیال کرتے ہی پانچ لاکھ درہم اُس کے پاس بھجوا دیے۔

خیزران ان کامون سے فارغ ہو کے بیٹھی ہی تھی کہ اُس کا صاحب تاج وتخت شوہر خلیفہ مہدی آ گیا۔ اور حالات پوچھنے لگا۔ خیزران نے مسکرا کے کہا "آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک لونڈی دوڑتی ہوئی آئی۔ اور کہا کہ کوئی عورت اندر آنا چاہتی ہے۔ مین نے بلوا لیا۔ کیا دیکھتی ہون کہ ایک جوان اور خوبرو مگر نہایت ہی شکستہ حال عورت ہے۔ آتے ہی اُس نے مجھے ملکۂ عالم کے لقب سے خطاب کر کے سلام کیا اور بتایا کہ مروان بن محمد کی بیٹی مزنہ ہے۔ نام سنتے ہی مین مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئی۔ خوب گالیان دین اور کہا "وہ وقت یاد کرو کہ ابراہیم بن محمد کی لاش پڑی تھی۔ اور عباسی گھرانے کی بڑھیون نے تجھ سے تجہیز و تکفین کی اجازت دلوانے کی درخواست کی تو تو اُنھین مارنے کو دوڑی۔ خوب ہوا جو خدا نے تجھے اِس درجے کو پہونچا دیا" یہ سن کے وہ قہقہہ مار کے ہنسی اور کہا "مین نے بے شک یہی کیا تھا اور خدا سے اِس کا بدلہ بھی پایا۔ اب کیا تم بھی خدا سے ایسا ہی بدلہ لینا چاہتی ہو جو میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو؟" یہ کہہ کے وہ واپس چلی۔"

خیزران یہین تک کہنے پائی تھی کہ مہدی کو زیادہ سننے کی تاب نہ رہی بات کاٹ کے بولا "افسوس۔ خدا نے تمھین ان نعمتون پر شکر گزار ہونے کا موقع دیا تھا مگر تم نے وہ موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ میرے دل مین تمھاری اس قدر جگہ نہ ہوتی تو قسم کھا کے کہتا ہون کہ تمھاری اِس حرکت پر پھر کبھی زندگی

پھر تم سے بات نہ کرتا۔"

خیزران نے کہا "امیرالمومنین۔ آپ سنیں تو سہی۔ میں نے یہ سُن کے اُس سے بے انتہا معذرت کی۔ روک کے اُسے حمام میں نہلوایا۔ اچھے کپڑے پہنائے عطر لگایا کھلایا پلایا۔ پھر راضی کر کے اس سے بہناپا کر لیا۔ اور اپنے سارے محل دکھا کے جس محل کو اُس نے پسند کیا اُس کے حوالہ کیا۔ اُسکو آراستہ اور ضروری سامان سے مرتب کر دیا۔ یہ وعدہ کر کے آئی کہ اب تا زندگی میں تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اور یہاں آتے ہی خرچ کے لیے اُس کے پاس پانچ لاکھ درہم بھیج دیے۔"

یہ سُن کے مہدی بہت خوش ہوا۔ خیزران کے حسن سلوک کی تعریف کی اور اپنے ایک خادم کو بلا کے حکم دیا کہ "اسی وقت جا کے اشرفیوں کے سو توڑے میری طرف سے بھی اُسے دے آؤ۔ میرا سلام کہو۔ اور کہو کہ تمھاری خدمت کرنے کی وجہ سے جس قدر خوش میں آج ہوا ہوں کبھی زندگی بھر نہ ہوا تھا کہنا۔ تمھاری قدر و منزلت کرنا امیرالمومنین پر واجب ہو گیا ہے۔ اور اگر تمھارے ناراض ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ خود تمھارے سلام کو حاضر ہوتے۔" یہ پیام سنتے ہی مزنہ خود چلی آئی۔ ادب سے سلام کیا۔ خیزران کے احسانات بیان کر کے اُس کی محبت و شرافت کی تعریف کی۔ اور بولی "میں بھلا حضور سے کیا ناراض ہوں گی؟ میری حیثیت ہی کیا ہے! محل کی لونڈیوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔" مہدی اس پر بہت خوش ہوا۔ اور مزنہ اپنے نئے قصر میں واپس گئی۔

اس کے بعد مزنہ ہمیشہ خیزران ہی کے ساتھ رہی۔ یہاں تک کہ مہدی کے سفر آخرت کے بعد اُس کے پہلے بیٹے ہادی کے عہد خلافت میں بھی اُسی سے وابستہ تھی پھر جب خیزران کے دوسرے اقبالمند فرزند ہارون رشید کا عہد شروع ہوا۔ تو رشید بھی مزنہ کی بڑی خاطر داشت کرتا تھا۔ جو پاس خاطر تمام عباسیہ اور ہاشمیہ خاتونوں کا تھا وہی اُس کا بھی تھا۔ اور خلافت رشید کے اوائل میں جب مزنہ کا انتقال ہوا تو رشید اُس کے جنازے پر نماز پڑھا۔ اور شاہانہ کروفر سے جنازے کو قبرستان میں لے گیا۔

آہ! خدا کی نعمتون کا شکرادا کرنے مین کبھی ہمارا یہ سلوک دشمنون کے ساتھ تھا۔ کاش اب اتنا نہین تو اُسکا عشر عشیر دوستون ہی کے ساتھ ہوتا۔ مگر نہین۔ اب ہم نفس کے بندے ہین۔ صرف اپنے نفس کو دیکھتے ہین۔ اور نہین پتہ لگتا کہ ہم مین اور بہائم مین کیا فرق رہ گیا ہے؟

یورپ کے بانکے نائٹ ٹمپلرز

گر یورپ کے ان بانکے نائٹون مین اُسوقت اور زیادہ اہمیت پیدا ہو گئی جب صلیبی مجاہدون کا لشکر بیت المقدس کے فتح کرنے کے لیے یورپ سے چلا۔ کلیسا مسیحی نے اپنے برکت کے آغوش مین لے کے اُنھین مذہبی وقعت پہلے ہی دے دی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے جان و مال کو دین کی نذر کرکے جان دینے کے لیے گھر سے نکلے اور سینہ اور پیٹھ پر صلیبین بنا کے مشرق کی جانب روانہ ہوے تو اُن مین بالکل ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ اور بہ اعتبار ذمہ داریون اور خدمتون کے ان مین دو تفریقین ہو گئین۔

بیت المقدس مین پہونچنے اور اُس پر قابض ہو جانے کے بعد ان لوگونکو اُنکی سروکار تو ہولی سیپلکر (کنیسۂ مرقد مسیح) سے تھا۔ مگر حضرت سلیمان کا بنایا ہوا خانۂ خدا جو اب مسلمانون کی مسجد بنا ہوا تھا۔ جسے مسلمان مسجد اقصیٰ اور کبھی مسجد عمر کہتے تھے دنیا کی ایک قدیم یادگار تھا۔ اور عیسائی بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہی وہ مبارک بقعہ تھا جس پر اس سرزمین مین پہلا معبد الٰہی قائم ہوا۔ اس مین جتنے مسلمان پناہ گزین ہوے تھے وہ تو کمال بے رحمی سے شہید کیے گئے۔ اور اُن جانبازان توحید سے خالی کرانے کے بعد ضرورت تھی کہ اُس یادگار زمانہ عمارت سے بھی کوئی کام لیا جائے جسکی تعمیر مین خلفاے بنی امیہ نے لاکھون روپیہ صرف کر دیے تھے۔

چنانچہ صلیبی فاتحون مین سے چند شریف النسل اشخاص مسجد اقصیٰ مین

جمع ہوے - اور باہم حلف اُٹھایا کہ جو زائرین یہان آئین گے ہم اُن کی حمایت و خبرگیری کرین گے - یہ جماعت نائٹ ٹمپلرز (ہیکل سلیمانی والے نائٹ) کے نام سے مشہور ہوئی - اور اپنے گروہ کو اِن لوگون نے حصول برکت کے لیے دی برنارڈ کے نام سے وابستہ کر دیا - حرم سلیمانی مین بیٹھ کے انھون نے جو حلف اُٹھائی تھی اُس کی رو سے یہ لوگ صرف دین کے سپاہی بن گئے تھے - انھون نے دنیا چھوڑ دی تھی - وطن بھلا دیے تھے - بیت المقدس کے سوا کسی شہر کو اپنا وطن اور شہر نہ سمجھتے - گھر بار سے دست بردار ہو گئے تھے اور سوا مسیح کے خاندان کے کسی کو اپنا گھرانا نہ بتاتے - جائداد سب کی مشترک رہتی - اور مشترک زندگی بسر کرتے - ایک ہی سرمایہ سب کی دولت تھا - خطرون اور مصیبتون مین ایک دوسرے کے جان نثار تھے - گویا ایک قوت اور ایک ہی روح سب کے افعال و اعمال - حرکات و خیالات - اور کامون اور ارادون پر حکومت کر رہی تھی - اِن کا سامان زینت صرف ہتھیار تھے - اِن کے گھرون مین جو عبادت خانون کا حکم رکھتے نہ روپیہ پیسہ ہوتا نہ سامان دولت و حشمت - زینت و نمایش کی چیزون سے انھین نفرت تھی - بہت ہی سادی اور بھدی چیزون سے اپنے ضروریات زندگی کو پورا کرتے - نمایش کے لیے وہان صرف ڈھالین تلوارین - نیزے - اور مسلمانون سے چھینے ہوے علم نظر آتے - لڑائی کا نام سنتے ہی اپنے فولادی اسلحہ لے کے دوڑتے - پھر نہ حریف کی کثرت سے ڈرتے اور نہ دشمنون کے جوش و خروش کی پروا کرتے - فتحین اُن کا سرمایۂ ناز تھین - مسیح کے نام پر جان دینا اُن کی اعلیٰ ترین کامیابی تھا - اُنھین یقین تھا کہ فتح صرف خدا کی عنایت سے حاصل ہوتی ہے - مگر کوشش مین جان دے دینا اپنا فرض ہے - غرض اِن نائٹون کا پہلا گروہ یہ تھا -

دوسرے گروہ کی بنیاد یون پڑی کہ صلیبی مجاہدین جب یورپ سے چلے تو اُن کے ہمراہ وہان سے ایک اسپتال بھی آیا تھا جو فلاکت زدہ زائرون اور بیت المقدس کے مفلس و شکستہ حال نصرانیون کی خبرگیری کے لیے تھا - خصوصاً اُن بہادرون کی تیمارداری کے لیے جو مسلمانون سے لڑین - اس خدمت کو

جن لوگون نے اپنے ذمہ لیا وہ بھی ایک مستم کے بانکے تسلیم کیے گیے یعنے نائٹ ہاسپیلرز کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور اُنھون نے اپنے کو ولی یوحنا کی طرف منسوب کرکے اپنا خطاب "نائٹس آف سینٹ جان" یعنی ولی یوحنا کے بانکے، قرار دیا۔

یہ دونون قسم کے نائٹ فولادی خود اور چار آئینے پہنتے نائٹس آف ہولی سپلکر "مرقد مسیح کے بانکے" کہلانے کے باعث سب سے زیادہ معزز خیال کیے جاتے اور چونکہ لاطینی سلطنت ارض مقدس" کو (جو لاکھون گرویدان بندگان خدا کے خون کا سیلاب بہا کے عین مسلمانون کے بیچ مین قائم کی گئی ھی) ان لوگون سے مدد ملتی وہ اِن کی بے انتہا قدر کرتی۔ اور اپنی زندگی کو انھین کے اسلحہ پر منحصر تصور کرتی۔ زائرین یہان سے واپس جاکے ساری مسیحی دنیا مین ان کی جان بازی اور بہادری کے قصے بیان کرتے۔ چند ہی روز مین ان کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ہر حصۂ ملک کے اُمرا اور دولت مند خصوصاً وہان کے پُرانے بانکے آ آکے اِن کے گروہ مین شامل ہونے لگے۔ اور تھوڑے دنون بعد یورپ کا کوئی نامور اور دولت مند خاندان نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اِن مذہبی بانکون اور وضعدار مجاہدون کی جماعت مین نہ شریک ہوگیا ہو۔ ایک تیسرا گروہ ٹیوٹانک نائٹون کا بھی قائم ہوگیا جو نائٹ ٹمپلرز کا ہم مذاق تھا۔ تینون گروہون مین فرق اور امتیاز یہ تھا کہ ٹمپلر سفید چوغہ پہنتے جس پر سُرخ صلیب بنی ہوتی ہاسپیلر والے سیاہ چوغہ پہنتے اور اُس پر سفید صلیب ہوتی۔ اور ٹیوٹانک نائٹ سفید چوغہ پہنتے جس پر سیاہ صلیب ہوتی۔ نائٹ ٹمپلرز کو جن کے حالات ہم بیان کرنا چاہتے ہین خاص مسجد اقصی مین جگہ دی گئی تھی۔

مسجد اقصی کو مسیحی لوگ متبرک نہ سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے اعتقاد مین اُس کا سارا تقدس حضرت مسیح کے بعد جاتا رہا تھا اور خدا نے اُس پرانے عبادت خانے کو چھوڑ دیا تھا۔ انھین تو صرف حضرت مسیح کے مولد و مرقد یا ارض مقدس کے پرانے کنیسون سے کام تھا اسلیے عیسائیون کا قبضہ ہوتے ہی وہ عبدالملک بن مروان کی بنائی ہوئی عالیشان مسجد جو ہیکل سلیمانی کے اصلی آثار پر قائم تھی مسلمانون کا قلع قمع کرکے قصر شاہی قرار دی گئی۔

ان جنگجو بانکون اور مذہبی فدائیون کے گروہ کی بنیاد یون پڑی کہ فرانس کے علاقۂ برگنڈی کے ایک نائٹ "ہیوڈ پگانیس" نے مع اپنے آٹھ رفقا کے (سنہ ۱۱۱۸ء) مین بیت المقدس کی اسقف اعظم کے سامنے جا کے حلف اُٹھائی کہ "ہم اپنی زندگی بیت المقدس کے راستون کی نگہبانی اور زائرون کی حفاظت کے لیے آنے کے نذر کر دین گے۔ باضابطہ طور پر قانون ملت کی پابندی کرین گے۔ اور بہ انتہا اطاعت کیشی۔ اور خود فراموشی کے ساتھ آسمان کے بادشاہ کی طرف سے جدال و قتال کرین گے" یہ پہلا عہد تھا جس نے ان مذہبی بانکون کے پیدا ہونے کی بنیاد قائم کی۔ اور جب شاہ بیت المقدس بلدون ثانی نے خاص مسجد اقصیٰ کے اندر اپنا کلب قائم کرنے کے لیے جگہ دے دی تو اس نئے گروہ کو اور مضبوطی حاصل ہو گئی۔

دس برس بعد شہر ٹرائے مین بمنظوری پوپ ہونوریوس ثانی ایک کونسل ہوئی جس مین دینی بانکون کے اس گروہ کے لیے ایک دستور العمل مدوّن ہو گیا۔ اس مین وہ قاعدے تھے جو پوپ اور اسقف بیت المقدس کی منظوری سے رائج ہو لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگون کی دینی جان نثاری اور نہایت جان بازی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ساری مسیحی دنیا گرویدہ ہو گئی۔ اور ہر جگہ اور ہر سرزمین مین اُن کے لیے سرمایہ فراہم ہونے لگا۔ جس مین قوم نے اس قدر مستعدی دکھائی کہ ملک وامرا اپنی سلطنتین اور ریاستین ان کی نذر کیے دیتے تھے اور اطالیہ سے لے کے اسپین تک ہر چھوٹے بڑے حکمران نے بڑی بڑی جائدادین ان لوگون کی نذر کر دین۔ اور یہ گروہ باوجود سادگی اور مشقت و تنگی کی زندگی بسر کرنے کے دنیا کے تمام تاجدارون سے زیادہ دولت مند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہزارہا خلقت گھر بار چھوڑ چھوڑ کے ان کے جتھے مین ملنے لگی۔

ان کا پہلا سرغنا جو "ماسٹر ٹمپلر" کہلاتا وہی "ہیو" قرار پایا۔ دوسرا ماسٹر اُس کے بعد رابرٹ ڈکراؤن ہوا۔ اُس کا جانشین "ڈیور آرڈ" قرار پایا۔ اور یونہین ماسٹرون کے انتخاب کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈیور آرڈ کے عہد مین ان لوگون کی سپہگری اس قدر کامیاب اور باقاعدہ تھی کہ اکثر سلطنتین اپنی فوجین انہین

کے قواعد کے مطابق مرتب کرنے لگین - اور اب اس وقت سے ان کی تاریخ دیکھنے کا شوق ہو تو حروب صلیبیہ کی تاریخ پڑھنی چاہیی - اسلیے کہ صلیبی لڑائی مین اہم فوجی خدمات یہی لوگ انجام دیتے تھے -

مگر دولت ہندی نے چند ہی روز مین ان کی حالت مین تغیر پیدا کرنا شروع کیا - اور ناکامیون مین ان کے طرز عمل پر بدگمانیان کی جانے لگین - جب ۵۴۳ھ محمدی (۱۱۴۸ء) مین جرمن فرمان روا کونراڈ بیت المقدس مین پہونچا ان لوگون نے اپنے کلب مین اسکی دعوت کی - اور اُسے اپنا گرویدہ بنا لیا - مگر اسی سال جب دمشق کے محاصرے مین مسلمانون نے صلیبیون کو فاش شکست دی اور انھین محاصرہ چھوڑ کے بدحواس بھاگنا پڑا تو اُس شکست کا الزام انھین بانکون کے سر تھوپا گیا - اور کہا جانے لگا کہ صرف نائٹ ٹمپلرز کی دغابازی سے یہ شکست ہوئی - اس کے دوسرے برس شہر غزہ کا قلعہ ان لوگون کے حوالے کیا گیا جسے اُنھون نے خوب مضبوط کیا - اس کے چار سال بعد اُن کا ماسٹر ٹمپلر برنارڈ چالیس نائٹون کو ہمراہ رکاب لیے کے بڑی بہادری سے شہر عسقلان مین گھس پڑا - مگر مسلمانون نے گھیر کے اس طرح مارا کہ ان مین سے ایک کو بھی زندہ واپس آنا نہ نصیب ہوا سب مارے گئے - اور ہم مذہبون سے یہ داد ملی کہ یہ لوگ خود اپنی حماقت کی نذر ہوئے - اور طمع نے اُنکو فنا کر دیا - چند روز بعد مشہور ہوا کہ ایک مصری شاہزادہ جو عیسائیون کے ہاتھ مین گرفتار ہو گیا تھا اور دین مسیحی قبول کرنے پر بھی راضی تھا اُسے ان نائٹون نے روپیہ لے کے اہل مصر کے حوالہ کر دیا - اور اسی طمع مین ان کی وجہ سے اور بھی کئی خون ہوے -

۵۹۵ھ محمدی (۱۱۶۶ء) مین ان نائٹون کو یہ الزام دیا گیا کہ یرون کے پار کا ایک مضبوط قلعہ اُنھون نے روپیہ لے کے نورالدین زنگی کے کسی سردار کے حوالے کر دیا - چنانچہ اس جرم کی پاداش مین خود مسیحی بادشاہ بیت المقدس املریق نے بارہ ٹمپلرون کو پھانسی پر لٹکا دیا -

یہی واقعات پیش آ رہے تھے کہ سلطان صلاح الدین اعظم لشکر لے کے مصر آپہونچا۔ ہزارون نائٹ مختلف میدانون مین لقمۂ نہنگ شمشیر ہوئے اور بیت المقدس اور شام کے تمام شہرون پر اُس نے قبضہ کر کے مسیحی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اُسوقت ٹمپلرز مسجد اقصی اور بیت المقدس کو چھوڑ کے ساحلی شہر عکّہ مین پہونچے۔ اور جب ایک زمانہ کے بعد عکّہ بھی مسیحیون کے ہاتھ سے نکل گیا تو طرابلس الشام مین جا کے پناہ گزین ہو گئے۔

آہ شبلی آہ!

عالم اسلامی مین یہ کس قدر جگر خراش واقعہ ہی کہ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی ہم سیاہ کارون کا ساتھ چھوڑ کے خلد برین کو سدھار گئے اور ہر مسلمان کی زبان پر ہے "انا للہ وانا الیہ راجعون" ہم بھی یہی آیۂ کریمہ پڑھ رہے ہین مگر نہین معلوم ہمین یہ سفر کب پیش آئی گا؟ اور کب اس عالم برزخ مین پہونچ کے اپنے قدیم دوست اور پرانے رفیق زندگی شبلی نعمانی سے معانقہ کرین گے۔ مولانا شبلی کے حالات زندگی ہم آئندہ نمبر مین لکھین گے۔ اور چونکہ ہماری اور اُن کی پبلک زندگی کا آغاز قریب قریب ایک ہی زمانے سے شروع ہوا اسلیے شاید ہم اورون سے زیادہ کامیاب رہین۔ پنجاب کے اخبارون مین یہ بالکل غلط چھپ رہا ہے کہ مولانا شبلی پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل تھے۔ اُنھون نے مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سے پرائوٹ طور پر ادب عربی کی کتابین ضرور پڑھی تھین مگر پنجاب یونیورسٹی کو ابھی یہ شرف نہین حاصل ہوا ہے کہ وہ اِس پایے کا محقق گرانمایہ اور فاضل بلند پایہ پیدا کرے۔ مولانا شبلی اُن لوگون مین تھے جو دنیا مین اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔ اور اُن کا کمال اُنھین کے ساتھ گیا۔ تاریخ اسلام مین جلب روایت اور تحقیق و تنقید کی جو شان اُنھون نے دکھائی ساری دنیا کے موجودہ علماے اسلام مین سے کوئی نہ دکھا سکا۔ اور ہم

آئندہ نمبرون مین بتائین گے کہ اُن کے علمی کمالات نے دنیا پر کیا اثر ڈالا۔ اور اُن کے تصانیف قومی لٹریچر مین کیا اثر رکھتے ہین

حیدرآباد کی تاریخ مین شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ نواب سالار جنگ بہادر مدارالمہام ریاست کو چھ مہینہ کی رخصت بیماری عطا ہوئی اور اُن کی جگہ پر کوئی قائم مقام نہین مقرر ہوا۔ دولت آصفیہ نظام مین مدارالمہامی ایک ایسی خدمت ہی جس کے بغیر ایکدن گزرنا بھی دشوار ہوتا ہی۔ مگر سریر آصفیہ پر فی الحال کیا ایسا جوان بخت و جوان سال اور مدبر بے مثال جلوہ افروز ہی کہ مدارالمہام کی ضرورت نہین سمجھی گئی اور صاحب اقبال مالک تاج و دیہیم نے کمال اطمینان کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ ہم بغیر کسی مدارالمہام کے کاروبار سلطنت چلالین گے۔ اعلیحضرت میر عثمان علی خان بہادر کے آغاز سریر آرائی سے ہم ممدوح کی بیدار مغزی و کارگذاری اور رعایا پروری و خوش تدبیری کی تعریف سُن رہے ہین۔ بارہا سنا گیا کہ جس مستعدی و توانائی سے اعلیحضرت کام کر رہے ہین کوئی عہدہ دار سلطنت بھی نہین کرسکتا۔ آج اِن سب باتون کی تصدیق ہوگئی۔ اور زمانہ پر بخوبی روشن ہوگیا کہ حضور بندگان عالی بغیر کسی مددگار کے مہمات سلطنت کو بخوبی انجام دے سکتے ہین۔

ریویو

الخط العثمانی ۔ راجہ راجیشور راؤ بہادر اصغر دولت آصفیہ کن کے ایک عالی مذاق رکھنے والے جاگیردار نے ادب اردو کی بہت سی قابل قدر خدمتین کی ہین۔ فی الحال اُنھون نے مذکورہ بالا رسالہ کے ذریعہ سے اپنا نیا خط اردو پبلک کے سامنے پیش کیا ہی جسے اُنھون نے حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی جانب منسوب کرکے الخط العثمانی کے نام سے نامزد فرمایا ہی۔ اسمین حروف کی شکلین موجودہ اردو خط سے ملتی ہوئی ایسی بنائی گئی ہین کہ جدا جدا رہین۔ اور ٹائپ کی دشواریان خط اردو سے دور ہو جائین۔ ہمارے نزدیک خط کا ایجاد کرنا کوئی دشوار کام نہین دشواری ترویج مین ہی۔ اگر حضور نظام اور برٹش گورنمنٹ متحد ہو کے اپنے دفاتر اور سررشتہ تعلیم مین کسی خط کو جاری کرنا منظور فرمائین تو پھر کاملین ملک بآسانی کوئی مناسب خط ایجاد کردین گے۔ اور یون خالی ایجاد کرنا ایک بے نتیجہ اور مہمل کوشش ہی۔ سرجان ملکم نے اپنا خط ایجاد کرکے کیا کرلیا جو کوئی اور کچھ کرے گا؟

نامی جنتری سنہ ۱۹۱۵ء ۔ ہر گھر مین جنتری کا رہنا لازمی ہی۔ لیکن ہمارا مشورہ ہے کہ جنتریون مین سے صرف نامی جنتری کو اپنے پاس رکھیے جو مولانا رحمت اللہ رعد کی یادگار زمانہ کامیابی طبع کا مکمل ترین نمونہ ہی۔ سنہ ۱۹۱۵ء کی جنتری مولانا نے شائع کردی جس مین افغانستان کی آخری تاریخ کے ساتھ بہت سی بکار آمد اور ضروری چیزین ہین۔ امرا کا فرض ہی کہ اس کے اعلی رنگین ایڈیشن کی کاپیان منگوا کے زیب دفاتر خاص بنائین۔ ہر جگہ کتب فروشون سے دستیاب ہو سکتی ہی۔ خاص ایڈیشن کے عمدہ نسخے خود مولانا سے کانپور مین خط بھیج کے منگوا لیے جائین۔

دلگداز میں آغاز ۱۹۱۴ء سے مضمون "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" شائع ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ایسا مضمون ہے کہ اس کا سلسلہ آخر ۱۹۱۵ء تک جاری رہے گا۔ اور کیا عجب کہ ۱۹۱۶ء میں بھی چلتا رہے۔ ابھی تک ہم نے فرمان رویان اودھ کی تاریخ کو ختم کر کے صرف زبان اردو پر بحث کی ہی۔ کہ دہلی سے لکھنؤ کو کب اور کیونکر ملی۔ اور لکھنؤ نے اس میں کیسی اور کس قدر ترقی کی۔ مگر ہم لکھنؤ کے دربار کا تمدن بتانا چاہتے ہیں جو صرف زبان ہی کیا مخصوص نہیں ہے۔ سیکڑوں چیزیں ہیں جن کا یہاں نشو و نما ہوا۔ اور وہ سب بجائے خود خصوصیات رکھتی ہیں۔ ہم علم و فضل فنون جنگ دیگر فنون ہو یعنی کھانے پینے۔ لباس و معاشرت۔ آشیا ہو سائٹی۔ اور یہاں کے مختلف گروہوں اور حرفوں پر بحث کریں گے۔ اور یہاں کی ایجادوں اور جدتوں کو حتی الامکان تحقیق کر کے ناظرین دلگداز کے ملاحظہ میں پیش کریں گے۔ امید ہی کہ تمدن اودھ کی یہ تاریخ ایسی مکمل ہوگی کہ تکمیل کے بعد اُسے ایک جلد میں علیحدہ شایع کرنا ضروری خیال کیا جائے گا۔ افسوس پرانی یادگار زمانہ بڈھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور جو ہیں آفتاب لب بام ہیں۔ گو کہ وقت تنگ ہوگیا مگر ابھی باقی ہی۔ اور اگر جستجو و کوشش سے کام لیا گیا تو لکھنؤ کے حالات پاستان کا بہت کچھ حصہ محفوظ رہ جائے گا۔ ورنہ لکھنؤ چاہے ہزاروں سال تک برٹش گورنمنٹ کے سایہ میں پھلے پھولے عہد ماضیہ کے دلچسپ حالات بالکل فنا ہو جائیں گے۔ اور وہ لکھنؤ کسی کو یاد نہ رہے گا جس نے سارے ہندوستان میں اپنی معاشرت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اور جس کی بنا پر لکھنؤ کو ہندوستان کا پیرس کہا جاتا تھا۔

دلگداز

اُردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ

ایڈیٹر

مولنا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

منیجر و پبلشر

خاکسار حکیم محمد سراج الحق عفا اللہ عنہ

جو

دلگداز پریس مین چھپ کے لکھنؤ محلہ کٹرہ بزن بیگ خان

سے شائع ہوا

کا بازار سرد پڑ گیا تھا اسلیے گمان ہوا کہ یہ آپ ہی کی نیک نفسی کی برکت ہی۔ جس کا گہرا نقش ہمارے دلون پر بٹھانے کے لیے اول کوشش یہی جو آپ خاموش رہے اور ہر طرف آپ کی واہ واہ ہو رہی تھی کہ بھلی کیسے پاک طینت و نیک نفس بزرگ ہین کہ جھگڑے فساد کو جانتے ہی نہین۔ مگر دوسری کوشش یہی شروع ہو گئی کہ آپ نے پیٹ سے پاؤن نکالنا شروع کیے۔ چپکے سے اور بہت ہی چھپا کے ایک ہلکی سی چینگی مملکت آسٹریا مین ڈالی۔ اور آسٹریا و سرویا مین تناتنی ہونے لگی جس کو دنیا ایک معمولی بات سمجھی اور کسی نے ادھر کو خیال بھی نہ کیا۔ مگر وہ چینگی یکبیک بھڑکی۔ آگ چارون طرف پھیلنا شروع ہوئی۔ اور آپ نے دھونکا دھونکا کے اُسے شمال و مغرب کیطرف بڑھایا جہان بڑے بڑے دم و خم کے لوگ رہتے ہین اور قوت و شوکت کے ساتھ امن پسندی کے مدعی ہین۔ ادھر ایسے روشن خیال اور دانائی و فطرت مین عدیم المثال واقع ہوئے ہین کہ ساری دنیا کو یقین تھا کہ وہ اپنے ہی گھر مین آگ لگنے دین گے اور نہ دنیا مین کہین اور۔ لوگ کہتے تھے کہ جس سے بھی آگ لا کے ڈالی جائے تو ان حلیم الطبع بزرگان مغرب کی متانت و سلامت روی کا پانی اور ان کی امن پسندی کی پالسی کی برف باری اُسے بجھا دیے رہے گی۔ کیونکہ ان کو بے لڑے بھڑے کامیابی حاصل کر لینے کے ایسے اچھے اچھے مجرب و آزمودہ تیر بہدف نسخے معلوم تھے کہ اگر کوئی وحشی قوم لڑنے کا ارادہ بھی کرتی تو اُس پر بجائے آگ برسانے کے یہ ایسی خوبی سے صلح جوئی کی برف باری شروع کر دیتے کہ دم بھر مین اُس کے ہاتھ پاؤن ٹھٹھر کے رہ جاتے اور یہ کمال آسانی کے ساتھ اُسے رسیون مین جکڑ کے بٹھا دیتے اور وہ ایسا مفلوج و از کار رفتہ ہو جاتا کہ زندگی بھر سر اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔

مگر ہمارے کرم فرما حضرت پارسائیل کی گرمجوشیون نے اُس مغربی برف کو گھلا کے پانی کر دیا۔ آپ کے بہت سے اخوان الشیاطین اس سے پہلے بھی بارہا دنیا مین آگ لگانے کی کوشش کر چکے تھے۔ مگر کسی کی نہ چلی تھی۔ اور سب ہمت ہار کے ناکام واپس گئے تھے۔ مگر آپ نے چند روز کی خاموشی کے بعد اس قیامت کی آگ لگائی کہ کسی کے بجھائے نہ بجھی۔ آناً فاناً مین ایک معمولی چینگی سے انگارا۔ انگارے

سے مشتعل ہوئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر بھڑکی اور پھیلی کہ بلقان سے آسٹریا
آسٹریا سے روس۔ روس سے جرمنی۔ جرمنی سے فرانس میں جا پہونچی۔ اور ساری
مغربی دنیا میں جہاں دیکھیے شعلے بلند تھے۔ اسی اثنا میں دو شیروں کی لڑائی میں جس
طرح ایک لومڑی کا چرکس نکل گیا تھا ویسے ہی بلجیم جرمنی و فرانس کے بیچ میں پڑ کے
بے موت مارا گیا۔ دنیا کے انتہائی مغربی پھاٹک پر جو انگلستان [illegible] کا دہانہ
میں بیٹھا ہوا تھا۔ [illegible] آگ لگی اور وہ اپنے سمندر کا پانی پھینکتا ہوا دے
اور گویا دنیا میں اسی لیے ہے کہ ہر جگہ سکون و اعتدال کو قائم رکھے۔ اور کسی کو کسی
کے گھر میں آگ نہ لگانے دے۔ سمندر کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی نہ تھی
اس نے جو بلجیم میں یہ آگ لگی دیکھی تو پانی کا رخ اسی طرف کر دیا۔ مگر ہمارے
[illegible] حضرت پار سال کی عنایت سے وہ پانی بھی شعلے بن گیا۔ اور بلجیم میں بجائے
آگ کے بجھنے کے اور زیادہ شعلے بلند ہوئے۔ ان شعلوں نے بڑھ کے اپنی غیر انگیز لوگوں
[illegible] میں آگ لگا دی۔ اور [illegible] کی لہروں سے چنگاریاں اڑ اڑ کے خاص انگلستان
میں بھی آگ لگا دینے کو تیار ہو گئیں۔

[illegible] مثل مشہور ہے [illegible] "اتقوا شدید غضب الحلیم" (بردبار کے غصہ سے
پناہ) انگلستان نے اپنے گھر کے دامن میں آگ برستے دیکھی تو پھر اسے کہاں
[illegible] اس کی شعلہ بار آنکھوں سے بھی چنگاریاں نکلنے لگیں جنھوں نے ہفت اقلیم
اور ساتوں سمندروں میں آگ لگا دی۔ اور سارا کرۂ ارض کرۂ نار بن گیا۔ آخر کار اس
عالمگیر آگ کے شعلے ساری دنیا کو مشتعل کرتے ہوئے ترکی تک پہونچے اور آخر آخر میں
وہاں بھی شعلے بھڑکنے لگے۔ غرض حضرت پار سال کی لگائی ہوئی آگ نے جو جزیرہ نمائے
بلقان سے شروع ہوئی تھی ساری دنیا میں آگ لگا کے پھر بلقان ہی میں آکے دم لیا۔

اور اب ختم سال پر جبکہ حضرت پار سال ہم سے رخصت ہو رہے ہیں آپ
کی گرم صحبت سے سارا [illegible] مشتعل ہے۔ اور جدھر دیکھیے بازار قتل گرم ہے۔
جانوں کے سلسلے منقطع ہو رہے ہیں۔ اور دنیا کی آبادی گھٹتی جاتی ہے۔ کاش آپ کو
اتنا ہی ترس آتا کہ جو آگ لگائی ہے اسے بجھا کے جاتے۔ مگر نہیں اس کار خیر کو اپنے
سر سے ٹال کے آپ اپنے قائم مقام سال آیندہ پر چھوڑے جاتے ہیں۔ دیکھیے اس نے

ورق نکال کے اُسکی پلیٹ بنوائی ہے جو میرے پاس احتیاط سے رکھی ہے گو ابھی تک چھپوانے کی نوبت نہین آئی۔ دوسرا خط فرمان روا ے مصر مقوقس کے نام ہے جس کا فوٹو ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفہ ڈی ایس مارگولیوتھ مین مصر کے رسالۂ الہلال سے لے کے درج کیا گیا ہی۔

ان دونون خطون کی تحریر ایک ہی زمانے۔ ایک ہی وضع۔ اور ایک ہی شان کی ہی۔ اور دونون کے نیچے آپ کی مہر ہے خطوط کی عبارت کے الفاظ بھی وہی ہین جو احادیث مین صحیح روایات سے مروی ہین۔ بہرحال ان کو دیکھ کے یقین ہوتا ہے کہ اصلی تحریرین ہین۔ اور یہی میرا خیال ہی۔ چنانچہ مین ان خطون کے فوٹون کو تمام اگلے تبرکات سے زیادہ واجب التعظیم اور حرز جان بنانے کے قابل خیال کرتا ہون۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان مبارک نامہ ہاے رسالت پر جان فدا کر دیجیے۔ افسوس مسلمانون کو توفیق نہین ہوتی ورنہ اُن کا فرض تھا کہ یہ دونون اصلی خطوط رسالت جن پر آپ کی مہر مبارک ثبت ہی اُن کی تاریخ کا پتہ لگاتے کہ کیونکر محفوظ رہے۔ کہان سے کہان پہونچے۔ کس سے کس کو ملے اور آخر مین کیونکر اہل یورپ کے ہاتھ آئے۔

ان خطوط کے بعد کی تحریر کا نمونہ حضرت عثمان کے نسخہ ہاے قرآن پاک ہو سکتے ہین۔ جن کا کوئی نسخہ اسوقت تک کسی ہندوستانی مسلمان کی نظر سے نہین گزرا۔ کہا جاتا ہی کہ اُن مین ایک قرآن قسطنطنیہ مین موجود ہی۔ اگر کوئی صاحب کسی تدبیر سے اُس کی زیارت سے شرفیاب ہو کے اُس کے کسی صفحہ کا فوٹو حاصل کرین اور اسے شائع کر دین مسلمانون پر بڑا احسان کرین۔

مذکورۂ بالا دونون خطوط رسالت کی تحریر کی شان یہ ہے کہ نہ نقطے ہین نہ اعراب ہین نہ علامات اوقاف ہین۔ الف سیدھی کھڑی لکیر نہین بلکہ نیچے کا سرا پیچھے مُڑا ہوا ہے جس سے اُس کی قطع "ں" کی سی ہی "عظیم" کا لفظ یون لکھا ہے "عطىم"۔ "القبط" کی صورت یہ ہی "العىط"۔ "سلام" کی یہ طرز تحریر ہی "سلم"۔ "الہدی" کی صورت یہ ہی "الهدى"۔ [illegible] کی صورت [illegible] اور "بعضنا بعضًا" کو "ٮعصا ٮعصا" [illegible] معلوم ہوتا ہی کہ نقطے کے ساتھ تنوین [illegible]

ایک الف جو موجودہ رسم خط مین بڑھا دیا جاتا ہی یہ اُسی زمانے کا ہے۔ اشھدوا
کی صورت "اسھد وا" جس سے پتہ چلتا ہو کہ جمع کے آخر کا الف بھی اُسی زمانے
کا ہے۔ اس کی پابندی نہین ہے کہ لفظ سطر مین ختم ہی ہو جاسے۔ "ورسولہ"
مین سے "ور" ایک سطر کے آخر مین ہی۔ اور "سولہ" دوسری سطر کے شروع
مین "تقوا" مین سے "ت" ایک سطر مین ہے اور "قوا" دوسری سطر مین
"مسلمون" مین سے "مسلم" ایک سطر کے آخر مین ہی اور "ون" دوسری
سطر کے شروع مین۔

خلفاے راشدین کے عہد مین اس خط مین کسی نمایان تغیر کا پتہ نہین چلتا۔
سب سے پہلے اس تحریر کے نقصان پر ابوالاسود دوئلی کی نظر پڑی جن کا حال مین نے
مئی اور جون ۱۹۱۴ء کے دلگداز مین لکھا ہی۔ انھین نے رسم خط کی اصلاح کی اور
انھین نے ابتدائی قواعد نحو عرب کو بھی مدوّن کیا۔

زیاد نے حکومت بصرہ کے زمانے مین اُن سے خواہش کی تھی کہ قرآن کے
رسم خط کی اصلاح کیجیے مگر اُنھون نے غالباً قرآن کے متعلق سنّت قدیم مین دخل
دینا بدعت خیال کر کے انکار کر دیا۔ لیکن ایک دن ایک قاری قرآن کو "اِنَّ اللّٰہَ
بَرِیٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ" مین "رَسُوْلُہٗ" کو "رَسُوْلِہٖ" پڑھتے سُن کے ایسے
گھبرائے کہ زیاد کے پاس دوڑے گئے۔ اور کہا مین اب آپ کی خواہش پوری
کرنے کو موجود ہون۔ پھر اُس سے ایک کاتب لیا۔ اور اُسے پاس بٹھا کے ہدایت
کی کہ مین قرآن کو لکھواتا ہون۔ جس حرف کے ادا کرنے مین مین اپنا مُنہ کھول دیا
کرون اُس کے اوپر تم ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ جس حرف کو مین مُنہ کو گول کر کے ادا کیا کرون
تم اُس کے آگے ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ اور جس حرف کے ادا کرنے مین آواز کا رخ
نیچے کی طرف ہو تم اُس کے نیچے نقطہ دیا کرو۔ غرض قرآن مین پہلے پہل یہ اعراب لگائے
گئے۔ جن کی صورت ابتدائی ایجاد مین بجاے ترچھی لکیرون کے نقطون کی سی تھی اور
پیش بجاے حرف کے اوپر کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ آج کل جو نقطے ب ت اور ث
مین یا ج ح خ کا امتیاز بنایا کرتے مین اُن کا اُس وقت تک مطلقاً پتہ نہ تھا۔ اور
نہ شاید اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ابوالاسود دوئلی نے سنہ ۶۹ھ مین انتقال کیا۔ اُن کے بعد کہتے ہین کہ میمون بن اقرن نے ۔ پھر عنبسہ بن معدان فہری نے پھر عبداللہ بن ابی اسحق حضرمی نے ۔ پھر ابوعمرو بن علاء المتوفی سنہ ۱۵۴ھ نے اس خط مین اور اصلاحین کین۔ مگر ہم نہین جانتے کہ وہ کیا اصلاحین تھین۔ یہان تک کہ خلیل ابن احمد نحوی المتوفی سنہ ۱۷۰ھ اور علی بن حمزہ کسائی المتوفی سنہ ۱۹۲ھ کا زمانہ آیا۔ جبکہ کوفہ اور بصرہ مین نحو و صرف اور علم زبان کا شباب تھا۔ کہتے ہین کہ خلیل نے ترقی خط کی طرف بہت توجہ کی۔ اور اس درجہ کو پہونچا دیا کہ کسائی نے جو مامون رشید کا اُستاد اور علمی ترقیون کا بیحد شائق تھا خط عربی مین ایک نئی شان پیدا کی جس کو اہل کوفہ نے بیحد پسند کیا۔ اور وہی خط خط کوفی۔ کے نام سے مشہور ہوا (ملاحظہ ہون کتاب الفہرس ابن الندیم۔ ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب و ابن البواب کاتب۔ اور آغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۲ حالات ابوالاسود دوئلی) اگرچہ مین نہ مانون گا کہ کسائی نے یک بیک پرانے خط کو بدل کے خط کوفی کر دیا۔ بلکہ مسلسل تغیرون اور ترمیمون نے رفتہ رفتہ خود ہی اس خط کی صورت بنا دی تھی کسائی نے قواعد نقاشی و خوشنویسی کو کام مین لا کے قوم کی تحریر کی ایک خاص شان پیدا کر دی۔ جسے لوگون نے عموماً پسند کیا اور اُسی کی پیروی کرنے لگے۔

تاہم اس سے یہ صاف ظاہر ہی کہ خط کوفی کی ایجاد سنہ ۱۶۲ھ کے قریب ہوئی ہی۔ اس سے پہلے جو خط مروج تھا کوفی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک کوفہ کو کوئی علمی حیثیت ہی نہین حاصل ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کوفہ کی سکونت اختیار کی۔ اور اسی وجہ سے اکثر عوام مین مشہور ہے کہ حضرت علی کے ہاتھ کے لکھے ہوسے قرآن خط کوفی مین تھے۔ مگر انھیں اس کی خبر نہین کہ اُن دنون کوفہ تو بے شباب تھا۔ اور کوفہ مین حضرت علیؓ بھی تھے۔ مگر خط کوفی نہ تھا جس کا کاتب حضرت علیؓ کو فرض کر لیا گیا ہے۔ خط کوفی کا دور دوسری صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔

مامون کے زمانے کی ایک فرد حساب کا فوٹو مین نے مدت ہوئی مولانا شبلی کے پاس دیکھا تھا۔ جس کی اصل یورپ کے کسی کتب خانہ مین موجود ہی۔ گو اسوقت

پوری تفصیل سے اُس کے حرفون کی شکلین یاد نہین ہین۔ مگر اجمالی نظر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہایت ہی پختہ اور پاکیزہ خط ہے۔ اور خط کوفی کی گھسیٹ ہے۔

اب مجھے یہ بتانا ہے کہ خط کوفی مین اور پرانے خط مین کیا فرق تھا مین نے خط کوفی کا کوئی مکمل قرآن نہین دیکھا ہے۔ لیکن ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمد" مصنفہ ڈی۔ اس۔ مارگولیوتھ مین خط کوفی کے ایک قرآن کے ایک صفحہ کا فوٹو موجود ہے۔ اصل نسخہ بوڈلین لائبریری کا ہے۔ اور معلوم نہین کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس مین الف کی قطع "ـا" د کی قطع "ـد" ن کی قطع "[" ہے۔ اس مین شک نہین کہ خط خوبصورت اور زیادہ واضح و روشن ہو گیا ہے مگر اُسی پرانے خط سے ملتا ہوا ہے صرف پختگی اور ایک مصورانہ مناسبت و ہم وضعی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اس کوفی خط کے قرآن مین اعراب کا کہین پتہ نہین۔ نہ نقطے ہی ہین اور نہ ترچھی لکیرین ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوالاسود کی ایجاد کا عام طور پر رواج نہین ہوا تھا خاص ہی خاص نسخہ ہاے قرآن مین اُن کے رسم خط کی پابندی کی جاتی ہو گی۔ مگر عام کاتب اُن کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

اس خط کوفی مین سب سے بڑی مفید ترقی یہ ہوئی ہے کہ موجودہ نقطون کی بنا پڑ گئی۔ جن سے اُن تمام مختلف الصوت حرفون مین امتیاز کر لیا جا سکتا ہے جو ہم شکل ہین۔ مگر خط کوفی کے نقطے ہمارے موجودہ خط نسخ کے نقطے نہین ہین۔ بلکہ اُن کی جگہ نیچے اوپر باریک باریک ترچھی لکیرین زیر زبر کی سی اختیار کی گئی ہین۔ مثلاً "یا ایھا المزمل قم اللیل" کو "یا ایھا المزمل قم اللیل" کی وضع مین لکھا ہے۔ اس سے بے شک یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب ب ت ث اور اسی طرح کے دیگر حروف مین امتیاز کی ضرورت محسوس ہوئی تو بجاے نقطون کے ترچھی باریک لکیرین اختیار کی گئین۔ اور نقطون سے جو ابوالاسود نے اجمالاً اعراب و حرکات بتانے کا کام لیا تھا۔ وہ خاص خاص قرآنون مین تھے۔ عام تحریرون مین اور کتابون مین اِن کی ضرورت

نہین سمجھی جاتی تھی۔

اب اس وقت سے کچھ کم ڈیڑھ سو برس تک خط کوفی کا زمانہ رہا۔ مگر زمانہ جو جو گزرتا جاتا تھا اس خط مین بھی کچھ نہ کچھ تغیر اور رد و بدل کرتا جاتا تھا۔ خط کوفی جب کہ ہمین نظر آتا ہے زود نویسی کے لیے موزون نہ تھا۔ چنانچہ سنہ ۲۷۲ھ مین زمانے نے ابو علی محمد بن علی بن حسین کاتب کو "جو ابن مقلہ" کے لقب سے مشہور ہی پیدا کیا۔ یہ بہت بڑا شخص تھا۔ اور اگرچہ اُس کی زندگی اس قدر پُر آشوب تھی کہ ترقی کی تو خلافت بغداد کا وزیر اعظم بن گیا اور اقبال نے ساتھ چھوڑا تو ہاتھ کاٹا گیا۔ زبان کاٹی گئی۔ قید ہوا۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتین جھیل کے سنہ ۳۲۸ھ مین چھپین برس کی عمر مین قید خانے ہی کے اندر مرا۔ لیکن ناقدر دان دشمن اُس کی جان لے سکتے تھے اُس کے کمالات کا مٹانا غیر ممکن تھا

دیگر کمالات کے علاوہ ابن مقلہ خوشنویسی اور خط نسخ کی اصلاح مین بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مروجہ خط کوفی کو تقویم پارینہ کر کے موجودہ خط نسخ ایجاد کیا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب) اس نئے خط مین اعراب و حرکات کے اظہار کے واسطے ابو الاسود دوئلی کے نقطون کو موقوف کر کے زیر۔ زبر کے لیے حرف کے اوپر اور نیچے ترچھی لکیرین اور پیش۔ جزم تشدید۔ دو زبر اور دو زیر کی موجودہ شکلین اختیار کی گئین۔ اور متشابہ حرفون کے باہمی امتیاز کے لیے خط کوفی کی باریک ترچھی لکیرون کو چھوڑ کے نقطے قائم کیے گئے۔ اور تمام حرفون کی صورتون مین ایک مقبول عام خوشنمائی سادگی اور آسانی پیدا ہو گئی۔ خلاصہ یہ کہ ہمارا موجودہ خط نسخ ابن مقلہ کا ایجاد ہے ابن مقلہ کے خط کی یہ شان اس قدر پسندیدہ ثابت ہوئی کہ ساری کتابت اسی مین ہونے لگی۔ اور یکایک خط کوفی ایسا مٹا کہ آج اُس کا لکھنا درکنار دنیائے اسلام مین اُس کا کوئی پڑھنے والا بھی نہین ہے۔

ابن مقلہ کے کچھ کم ایک صدی بعد ابن بواب کاتب پیدا ہوا جس نے اپنی مشہور عام خوش نویسی سے خط نسخ کو اتنا سے کمال کے درجے کو پہونچا دیا۔ ابن بواب کا نام ابو الحسن علی بن ہلال تھا۔ مگر چونکہ ایک دربان کا بیٹا تھا اس لیے

"ابن البواب" کے لقب سے مشہور ہوا۔ علامہ ابن خلکان اُس کی نسبت لکھتے ہین "اگلون پچھلون مین سے کوئی شخص اُس کے مثل کتابت نہین کر سکا۔ خط کوفی سے بدل کے موجودہ خط کو ایجاد تو ابو علی بن مقلہ نے کیا تھا۔ لیکن ابن بواب نے اس کی شان کتابت شایستہ مہذب اور خوشنما بنادی۔ اور تمام لوگون کو اتفاق ہی کہ اس بارۂ خاص مین وہ منفرد اور بے نظیر تھا" ابن بواب نے ۴۱۳ھ یا ۴۲۳ھ مین انتقال کیا۔ اور خط نسخ مین ایسی شان پیدا کر کے چھوڑ گیا جس کی لوگ آج تک پیروی کر رہے ہین۔

اس مسئلہ پر اس قدر تحقیق کرنے کے بعد مین خواجہ صاحب کے سوالات کا جواب دیتا ہون۔

(۱) ۸ نومبر کے زمیندار مین ایک واقف کار صاحب نے بتادیا ہی کہ مولوی خدابخش خان کے کتب خانۂ بانکی پور مین حضرت عثمان اور حضرت علی کے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن مجید موجود ہین۔ مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہان حضرت عثمان کے ہاتھ کا تو کوئی قرآن نہین۔ ہے ہان حضرت علی کے ہاتھ کے چند پارے بتائے جاتے ہین۔ مگر جب تک کوئی خط عرب کی تاریخ جاننے والا اُن پر تنقیدی نظر ڈال کے نہ بتائے اعتبار نہین کیا جا سکتا۔ تاہم اس عہد کا کوئی قرآن مل جائے تو ہم کو اس مسئلہ مین صحیح نتیجہ تک پہونچنے مین بہت کامیابی ہو سکتی ہے۔

(۲) آپ کی تحقیق کے اس حصہ سے مجھے اتفاق نہین کہ سیدنا عثمان کا مصحف خط کوفی مین تھا۔ اسلیے کہ خط کوفی اُس زمانے کے تقریبًا ڈیڑھ صدی بعد ایجاد ہوا ہے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہی کہ اُس مین نقطہ اور حرکات و سکنات نہ تھے۔

(۳) اس دفعہ کے مضمون (الف) کے متعلق عرض ہی کہ خط نسخ کی تاریخ مین نے اوپر تفصیل سی بتادی ہے جس سے تمام استفسارات کا جواب ملسکتا ہی۔ اتنا اور عرض کرنا ہے کہ مین نے کبھی کوئی قرآن خط نسخ اور خط کوفی مین ملا جُلا نہین دیکھا۔ لیکن ابن مقلہ کے ظہور سے چند روز پیشتر جو قرآن لکھے گئے ہون گے وہ یقینًا ایسے ہی خط مین ہون گے جن کی شان خط کوفی اور موجودہ نسخ سے ملی جُلی ہو گی۔

ضمن (ب) کے متعلق عرض ہے کہ نقطون کا آغاز خط کوفی مین یا یک ترچھی خطوط کی وضع مین ہوا جو خطوط ابن مقلہ کے زمانے مین نقطے بن گئے۔ ان کے پیشتر بادی النظر مین حروف منقوط و غیر منقوط یا ایک اور دو اور تین نقطون والے حرفون مین مابہ الامتیاز کوئی علامت نہ تھی۔ اور صرف قیاس اور معانی کی مناسبت سے اُن کا امتیاز کیا جاتا تھا۔ جسطرح کہ اردو مین ہم حرکات کا امتیاز بغیر کسی علامت کے کر لیا کرتے ہین۔ "ب" اور "ت" کا امتیاز خط کوفی سے پہلے کے پرانے خط مین نہ مفرد مین تھا نہ مرکب مین۔ مگر کوفی مین جیسا کہ مین اوپر بیان کر آیا ہون نیچے اوپر باریک خطوط کا امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔ "ت" کی شکل "ف" اور "ب" کی "ب" تھی۔

ضمن (ج) بعض کا یہ خیال بالکل صحیح ہی کہ نقطون سے پہلے حرکات و سکنات کا استعمال شروع ہوا۔ اور وہ بذریعۂ نقط تھا۔ اور نقطے اول حرکات و سکنات کے لیے استعمال ہوئے۔ موجد حرکات ابوالاسود دوئلی نے زیر زبر پیش کے اظہار کے لیے اپنے کاتب کو اوپر نیچے اور سامنے نقطہ ہی لگانے کی ہدایت کی تھی۔ جو باعتبار روایت ہر طرح قابل تسلیم ہی۔ امتیاز حروف کے لیے نقطون سے اور حرکات کے سمجھنے کے لیے ترچھے خطون وغیرہ سے کام لینے کا آغاز ابن مقلہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر مین خیال کرتا ہون کہ اس سے پیشتر ہی کاتبون کا رجحان اس ترمیم و تہذیب کی طرف ہونے لگا ہو گا۔ ابن مقلہ نے اُسے اختیار کر کے اس قدر رواج دیا کہ سب نے یہی طرز تحریر اختیار کر لیا۔

ضمن (د) بے شک قدیم کتابت مین "ذٰلک" اور "جنّٰت" کے ایسے لفظون مین الف نہین لکھا جاتا تھا۔ اور نہ اُس کے امتیاز کے لیے کوئی علامت تھی۔ مذکورہ صحف رسالت مین الفاظ "رحمان" اور "یا اہل" بغیر الف کے صرف کھڑے زبر سے یعنی "رحمٰن" اور "یٰاھل" کی صورت مین لکھے گئے ہین۔ اُن دنون "حرث" اور "حارث" کے نامون مین امتیاز دشوار تھا۔ اس لیے کہ دونون مذکورہ نام "حرث" کی صورت مین لکھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر حارث کا لفظ "حرث" لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر سوالات کا جواب بھی اس مضمون کے ابتدائی مباحث سے حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔

موجودہ نعمتون کی بے قدری

حضرت رسالت (روحی فداک یا رسول اللہ) نے بعض روز روز حاضر ہونے والون سے فرمایا "زرغباً تزدد حبا" (مجھ سے ایک دن چھوڑ کے ملا کرو اس سے تمھارے دل مین میری محبت زیادہ ہو گی) اس ارشاد نبوت کے فلسفہ پر بھی کبھی تم نے غور کیا ہی؟

انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی احمقانہ واقع ہوئی ہی کہ جو نعمتین اُس کو مل چکی ہین اُن کی قدر نہین کرتا۔ اور جو اُسے نصیب نہین اُنکی ہوس مین مرا جاتا ہی۔ مہینون ہم اپنے شہر کے باغون اور سبزہ زارون کی سیر نہین کرتے مگر اے ہمالیہ کی گھاٹیون اور اُس کی وادیون کے مرغزار جو نظر سے غائب اور خیال کے سایے مین ہو تم ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ ہماری گزرگاہون مین میونسپلٹی نے ہزارون لالٹینین روشن کر رکھی ہین جنھین کبھی شاذ و نادر ہی ہم نگاہ اُٹھا کے دیکھتے بھی ہین مگر اے سقف فلک کے غیر مرتب تارو تمھین بار بار دیکھتے ہین اور جی نہین بھرتا۔ شب و روز اسی فکر مین ہین کہ کسی طرح اُڑ کے تم تک پہونچین۔ یہ کیون؟ صرف اس لیے کہ تم دور ہو اور تم تک رسائی نہین ہو سکتی۔

ریل مین سفر کرتے وقت بارہا تجربہ ہوا ہو گا کہ پاس کے کھیتون اور درختون مین وہ خوبصورتی نہین ہے جو دور کے ملے ہوے درختون اور وادیون کی سواد مین ہم کو نظر آتی ہی۔ جانتے ہین کہ اُن کے قریب پہونچین گے تو وہ بھی ایسے ہی ثابت ہون گے جیسے پاس والے کھیت اور درخت ہین۔ مگر دل مانتا۔ اُنھین چیزون کا والہ و شیدا ہی جو دور ہین۔ اسی مسئلہ مین اس بات کا بھی راز ہی کہ جس قدر دیہات والون کو شہرون کی رونق و آبادی و چہل پہل۔ مکانون کی رفعت و شوکت اور سڑکون کی بھیڑ بھاڑ دیکھنے کا شوق ہے اُس سے زیادہ مشتاق اہل شہر دیہات کی خاموشی

وسادگی۔ نزہت و شادابی۔ وہان کے وسیع میدانون۔ اور لہلہاتے ہوئے کھیتون کے ہین۔

ہم بالطبع جدت پسند اور عجائب پرست واقع ہوے ہین۔ ہمیشہ دل پر یہ ہوس قابض رہتی ہے کہ روز کوئی نئی چیز ملے۔ اور اُن چیزون کو دیکھین جو نظر سے دور ہین

اردو کی بھدی سی مثل "گھر کی مرغی دال برابر" اسی رمز فطرت اور ہماری احمقانہ ہوس پرستیون کا شعار ہے۔ اچھی سے اچھی نعمت اور مفید سے مفید دولت دستیاب اور سہل الحصول ہونے کے باعث ہماری نظرون مین بے قدر ہوجاتی ہین۔ اور جن چیزون کا حاصل ہونا دشوار ہے اُن مین سے اکثر مضر اور خوفناک چیزین بھی دور سے ایسی بھلی معلوم ہوتی ہین کہ اُن کے شوق مین دل ضروری نعمتون کی قدر کرنا درکنار اُن سے نفع اُٹھانا بھی بھول جاتا ہے۔

لوگ شاہان سلف کی اس وضع پر آج اعتراض کرتے ہین کہ لوگون کی اُن تک رسائی نہ ہوتی تھی۔ دروازون پر پہرہ تھا۔ باہر اس قدر کم نکلتے کہ اکثر اہل ملک دل مین اُن کی ایک جھلک دیکھ پانے کی تمنا ہی لیے مرجاتے۔

ایک سطحی خیال والا نکتہ چین کہہ دے گا کہ یہ اُن کے غرور ونخوت کی وجہ سے تھا یا شب و روز مہ جبین عورتون کی صحبت مین پڑے رہنے کے باعث مگر نہین۔ اُن کی یہ وضع صرف اس لیے تھی کہ عام نگاہون سے دور رہنے کی وجہ سے اُن کی قدر بڑھے۔ دوستون کے دلون مین محبت زیادہ ہو۔ اور دشمنون پر پورا رعب قائم رہے۔ زیادہ میل جول سے بے قدری ہی نہین ہوتی بلکہ رعب بھی اُٹھ جاتا ہے۔ شاہی شان وشوکت معمولی چیزین نظر آنے لگتی ہین۔ حضرت عمرؓ کے دُرّے سے کسریٰ و قیصر کے جسم مین لرزہ پڑ جاتا تھا مگر مغیرہ بن شعبہ کے ایک ذلیل غلام نے شہید کر ڈالا۔ حضرت علی کی ذوالفقار نے بڑے بڑے پہلوانون اور سیہ گردون کے غرور توڑ دیے تھے مگر اپنے ہی گروہ کے ایک حقیر و نابکار کے ہاتھ سے شہید ہوے۔ جولیس قیصر کی تلوار نے ساری دنیا مین لرزہ ڈال دیا تھا مگر اپنے گرد کے چند بے وفا دوستون کے ہاتھ کا شکار ہوا۔ اور نادر جیسا قتال انسان

اور مرہٹون کی فوجون کو شکستین دیدی تھین اور اُس کی تلوار کے ایک اشارے سے دہلی مین خون کی ندیان بہادی تھین اپنی پاس کی فوج کے چند بے وفاؤن کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ہم سلاطین کے سامان آرایش و آسایش کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہین ہمین نظر آتا ہو کہ دنیا بھر کے عیش تاجدارون کو حاصل ہین۔ اور خدا کی ساری نعمتین اُن کے عیش کدون مین جمع ہو گئی ہین۔ نہ ہمین اُن کا سا کھانا نصیب نہ اُنکا سا پہننا نہ اُنکے سے اطاعت گذار خدام و اہل دربار مل سکتے ہین اور نہ اُن کی صحبت عیش کے سے معشوقان طرحدار نہ ویسے خزانے ہمارے قبضے مین ہین اور نہ ویسے ممالک و اقوام۔ لیکن غور کرو تو اسی عیش پرستی کے لحاظ سے جس قدر حسد بادشاہون کو تم پہ آتا ہے اُس قدر تمھین اُن پر نہین ہو سکتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اُن کا حسد بیجا اور بامعنے ہوا ور تمھارا بے اصل اور لغو۔ اُن کو جو نعمتین حاصل ہین وہ حقیقت مین نعمتین اور بہت بڑی اعلی درجہ کی نعمتین ہین مگر کثرت ہر وقت موجود رہنے۔ اور بسہولت حاصل ہو جانے کے باعث اُن کی نظر مین وہ نعمتین ہی نہین باقی رہین۔ بہ خلاف اُن کے جو چھوٹی چھوٹی نعمتین تمکو عطا ہوئی ہین وہ ایسی مشقت اور دشواری سے حاصل ہوتی ہین کہ تم اُن مین بڑی سے بڑی نعمتون سے زیادہ لطف اُٹھا لیتے ہو۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمھاری حالت پر اُن کا حسد کرنا تو بیجا نہین۔ مگر تم جو اُن کی حالت پر حسد کرتے ہو یہ بالکل بے موقع اور بے حقیقت ہے۔

مگر دنیا کی عام حالت یہ ہو رہی ہو کہ جس لالچ کی نگاہ سے تم اُن کے عالیشان محل کو دیکھتے ہو اُسی لالچ سے وہ تمھارے ٹوٹے جھونپڑے کو دیکھتے ہین۔ جس شوق سے تم اُن کے پلاؤ قورمے اور الوان نعمت کو دیکھتے ہو اُسی شوق سے وہ تمھاری روکھی روٹی اور بن گھاری دال کو دیکھتے ہین۔ جسطرح تمھین اپنی سادی اور کم قیمت غذا بے لطف اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے اسی طرح اُنھین اپنی پر تکلف اور قیمتی غذاؤن مین مزہ نہین آتا۔ اور جسطرح تم اُنکی ہزارون لونڈیون حرمون اور بی بیون پر حسد کرتے ہو ویسے ہی وہ تمھاری ایک پاک دامن عفیفہ اور حیا کش بی بی پر حسد کرتے ہین۔

یہ باہمی حسد اور ایک دوسرے کی حالت کو لالچ سے دیکھنا کیون ہے؟ اس لیے کہ جس طرح تم کو اپنا غربت کا سامان معمولی اور تمھارے پاس ہونے کی وجہ سے بے مزہ اور بے لذت نظر آنے لگا ہو ویسے ہی اُن کے لیے اپنا اعلی درجہ کا سامان عیش پھیکا اور بے مزہ ہوگیا ہے۔ انھین باتون اور انسان کے اس تلون کو دیکھ کے فلسفی اس نتیجہ کو پہونچ گئے ہین کہ لذت اور عیش صرف تغیر اور ایک حالت سے بدل کے دوسری حالت پیدا ہونے کا نام ہے۔ وہ سمجھتے ہین اور بہت صحیح سمجھتے ہین کہ دشواری سے حاصل ہونے اور تاخیر و انتظار کے بعد دستیاب ہونے کی برکتین دنیا کی ہر چیز کو لذیذ بنادیا کرتی ہین۔

اسی کا ایک کرشمہ یہ ہو کہ ہمین اپنی دنیادی ہستی مین موجودہ حالت اس قدر بے لطف و بے مزہ نظر آتی ہے کہ اُس کی طرف توجہ کرنے کی بہت کم لوگون کو نوبت آتی ہو مگر گذشتہ اور آیندہ حالت کے خیال مین جسے دیکھیے مصروف ہو۔ اگلی چیزون مین باقی کوئی نہین ہو۔ سب گذر گئین اور صرف اُن کی یاد دلون مین ہو۔ اس یاد مین بھی اس قدر مزہ ہو کہ گو اُس سے کوئی نتیجہ نہین حاصل ہوسکتا لیکن سب کی زبان پر اگلون کی داستانین ہین۔ کس کس طرح مزہ لے لے کے کہہ رہے ہین کہ فلان صحبت کیسی دلچسپ تھی؟ اور فلان احباب مرحوم کس قدر سچے تھے؟ آہ نہ اب ویسی صحبتین دیکھنے مین آئین گی۔ اور نہ ایسے دوست نصیب ہون گے۔

اب گزرے انسانون کو چھوڑ کے آیندہ کی طرف رخ کرو اُدھر تم کو آغوش فردا مین عجیب عجیب قسم کی دلکش و دلفریب تمنائین نازون کے پلے لاڈلی بچون کی طرح کھیلتی اور کھل کھلاتی نظر آئین گی۔ اور تمھارا جی چاہے گا کہ اُن خوبصورت بچون کو بے اختیار گود مین اُٹھا کے کلیجے سے لگا لو۔ اور یہ نہین ہوسکتا تو اِن پیاری صورتون کو دیکھتے ہی رہو۔ استقبال کے گلشن اقبال مین ہر قسم کی لذتین اور ہر طرح کے مزے نظر آئین گے۔ مگر افسوس گو وہ تمھین اپنی ہی طرف آتے نظر آتے ہین لیکن اتنی طرف دور ہین کہ تمھارا ہاتھ اُن تک

نہین پہونچ سکتا۔ اور انتظار کی شکل برداشت کرنے کی ہم اپنے مین طاقت نہین پاتے۔

بخلاف گذشتہ و آیندہ کے حال کی وہ قیامت زا اور امیدکش ساعت ہے کہ اُس کی سواد مین پہونچتے ہی ہر چیز معمولی اور بے مزہ ہو کے رہ جاتی ہی۔ وہی دلچسپیان جو آغوش فردا مین حد سے زیادہ دلکش نظر آتی تھین آج کی قلمرو مین آتے ہی کچھ ایسی بے لطف ہو گئین کہ قدر کے قابل ہی معلوم ہوئین۔ نہ اُن سے لطف اُٹھایا۔ اور نہ تمھین یہی محسوس ہو سکا کہ اُن مین کوئی لذت ہی۔ لیکن حال کے نہایت ہی محدود اور تنگ دائرے سے نکل کے جیسے ہی گذشتہ کے عشرت آباد مین پہونچ گئین تم ہاتھ ملنے لگے کہ افسوس کیسی نعمت اور کیسی راحت کی چیز ہاتھ سے نکل گئی۔ اور ہم قدر نہ کر سکے۔

موجودہ حالت اور آج کی گھڑی محض اسی وجہ سے بے لطف ہی کہ ہم سے قریب اور ہماری دسترس کے اندر ہی۔ اور گذشتہ و آیندہ کی دلکش اور لذت آلود نیرنگیان اسی لیے پُربہار و پُرلطف ہین کہ ہم سے دور ہین۔ اور ہمارے بس مین نہین۔

شعرا کی زبان سے ہم معشوق کی بے وفائی کی شکایت سنتے سنتے عاجز آ گئے ہین۔ بارہا دل مین خیال گذرا کہ کیا ہمارے شاعرون اور عاشقونکو کوئی باوفا معشوقہ نہین ملتی جو ایک بیوفا۔ بدعہد۔ جھوٹے۔ اور وعدہ فراموش معشوق پر مٹے ہوے ہین؟ رات دن اُسی کی بے وفائی کے ظلم وستم کا دکھڑا روتے ہین۔ مگر اُس کے ہاتھ سے جان نہین چھڑا سکتے۔ آخر غور کرنے سے کھلا۔ کہ یہان بھی وہی "موجودہ نعمتون کی بے قدری" کا مسئلہ پیش ہی انسان کی احسان فراموش اور ناقدر دان فطرت ہی ایسے معشوق کو چاہتی ہی جو اُس پر ظلم کرے۔ عاشق نواز معشوق ان بے وقوفون کی نظر مین معشوق ہی نہین ہی۔ جو اِن کے بلانے سے چلا آیا۔ اِن کی دلداری کرتا رہا۔ اور اِن کی خواہشون کا مطیع ہو گیا۔ اُس مین کسی قسم کی لذت نہین ہو سکتی۔ کیونکہ اُس کا حسن و جمال سہل الحصول کی نذر ہو گیا۔ اور اُس کی رعنائی و زیبائی

پاس آجانے کی وجہ سے خاک مین مل گئی۔ اِن کے نزدیک لذت اُسی معشوق مین ہے۔ جو ہر بات مین اِن کی ضد کرے۔ یہ صورت دکھانے کو کہین تو وہ منہ چھپائے آنے کو کہین تو چلا جائے۔ پاس بلائین تو دور بھاگے۔ یہ خوشامد کرین تو گالیان دے۔ اُس کے قدمون پر سر رکھین تو وہ ٹھوکر مارے۔ غرض اپنی ہر ادا۔ ہر آن۔ اور ہر انداز سے اسی بات کو ظاہر کرے کہ اُس کا ملنا غیر ممکن ہے۔

لہذا اد بے وقوف انسان اپنی انھین حماقتون کی وجہ سے تو خراب ہو رہا ہے۔ کاش اپنے پاس کی نعمتون کی قدر کرتا۔ اور اپنی دنیوی زندگی کو جنت بنا لیتا۔ اور جن لوگون نے موجودہ گھڑی اور حاصل شدہ برکتون کی قدر کی اُنھون نے اپنی اس فانی زندگی کو جنت کی زندگی بنا لیا۔ مگر افسوس مسلمانون مین عجیب انقلاب ہو گیا ہے۔ اِن کے اگلون نے تو موجود نعمتون کی قدر کرکے اپنی دنیوی زندگی فردوس برین کی زندگی بنا لی تھی مگر فی الحال اِس کلیہ سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی صورت نہین نظر آتی کہ الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر۔

شبلی نعمانی

مولانا شبلی کی وفات سے مسلمانون مین جو کمی ہو گئی ہے اُس کا پورا ہونا بہت دشوار ہے۔ ہندوستان مین بہت سے علما و فضلا پیدا ہون گے۔ بہت سے شعرا پیدا ہون گے۔ بہت سے مصنف پیدا ہون گے۔ بہت سے انگریزی کے کامل و متبحر پیدا ہون گے۔ مگر شبلی پھر پیدا ہون ممکن نہین۔ وہ اُس عالم سرمدی مین گئے۔ اور جنت مین جہان سے کوئی واپس نہین آتا کسی کی یاد مین نوحہ کا کرنا اُسے ستاتا ہے۔ لہذا ہم اپنی آہ و زاری سے اُن کی وہان کی ابدی مسرت و فارغ البالی مین فرق نہ ڈالتے اور اُنھین نہ ستاتے۔ مگر کیا کرین کہ شبلی ہنوز نشین نہ دنیا مین کوئی اپنا نظیر چھوڑ گئے ہین اور نہ اُن سے کسی محقق گران پایہ کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ اور یہ ایسا غم جانکاہ ہے کہ ہمین آج ہی یہ چین سے بیٹھنے دے گا اور کبھی آیندہ۔

مولانا کے علمی کارنامون کا آغاز ہماری آنکھون کے سامنے ہوا۔ ہمارے سامنے ہی اُنھون نے ترقی کی شہرت حاصل کی۔ اور ہماری ہی آنکھون کے سامنے دنیا سے سدھار گئے۔ ہم سے اُن سے طالب علمی کے زمانے سے ملاقات تھی۔ اُن کا سنہ ولادت تو ہمین یاد نہین مگر اتنا جانتے ہین کہ ہم وہ قریب العمر ہین۔ مولانا کو ہجوم امراض قبض و بواسیر کے تکالیف۔ اور معدے کی کمزوری نے بہت ہی ضعیف و ناتوان بنا دیا تھا۔ جسکی وجہ سے

اُن کی عمر اصل سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق اُن کی عمر چھپن ستاون سال سے زیادہ نہ تھی۔
ابتدائے عمر میں درسیات اور کتب معقول اُنھون نے اپنے وطن مین مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھین
چند روز حیثیت طالب العلم جونپور کے مدرسہ حنفیہ میں رہے۔ اور غالباً مولوی ہدایت اللہ خان صاحب مرحوم سے تحصیل کی۔ آخر
مین ادب عربی کے شائق بن کے لاہور پہونچے اور مولانا فیض الحسن صاحب سے پرائیوٹ طور پر ادب کی کتابین پڑھین۔ شاید
اسی وجہ سے پنجاب کے اخبارات مین شائع ہوا ہے کہ اُنھون نے پنجاب یونیورسٹی کی ڈگریان مولوی عالم اور مولوی فاضل
حاصل کین۔ مگر یہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ہے۔ یہ ہمین نہین معلوم کہ مولانا نے حدیث کی کتابین پڑھین یا نہین۔ اور
پڑھین تو کہان اور کس سے پڑھین۔

تحصیل علم کے بعد مولانا نے ارادہ کیا کہ قانونی پیشہ اختیار کر کے مختاری و وکالت کی سندین حاصل کرین۔
جس غرض کے لیے چند روز تک ضلع بستی مین قیام کیا۔ مگر حالات اور رجحان طبیعت سے آشکارا ہو رہا تھا کہ جس میدان
مین فروغ پانے کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے وہ میدان یہ نہین ہے۔ چنانچہ اُن دنون اگرچہ مقدمہ فہمی اور عدالتی
کارروائیون سے کام رہتا تھا۔ مگر اُن کا مشغلہ علمی مباحث اور عالمانہ تصانیف ہی تھے۔

مولانا نے جن درس گاہون مین تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا اُن کی صحبت نے ابتدا ہی مین اُنھین سخت
حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق مین اُنھون نے اپنے نام کے ساتھ "نعمانی" کا لقب لکھنا شروع کیا۔ جسکی وجہ سے
بعض ناواقف لوگون نے اُنھین غلطی مین پڑ کے نسباً نعمانی یعنی امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کی نسل مین خیال کر لیا
مگر اسکی کوئی اصلیت و حقیقت نہین ہے۔ وہ متشدد حنفی تھے۔ اور حنفیت مین اپنے آپ کو اورون سے
نمایان ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کے سوانح عمری مین اُنھون نے
"سیرۃ النعمان" لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملہ کیے۔ اور علی العموم گروہ محدثین کے
اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہان تک کہ امام ابوالحسن اشعری بھی محض اتباع حدیث کے باعث اُن کے
مورد سہام بن گئے۔

اُن دنون مولوی ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی کی درس گاہ کی شہرت تھی۔ جن کے فیض علمی سے
سارا ہندوستان بلکہ ممالک دور و دراز کے لوگ بھی بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب کی
یہ شان تھی کہ بخلاف تمام موجودہ علمائے حنفیہ کے ائمہ حنفیہ سلف مین سے جس کے قول کو اہل حدیث
کے مذہب سے قریب تر پاتے اختیار کر لیتے۔ اور بہت سے مسائل مین اہل حدیث کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ نماز مین
امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے مین اُنھون نے امام محمد کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اور سورہ
فاتحہ پڑھنا مستحب بتاتے تھے۔ یہ امر مولانا شبلی کو سخت ناگوار ہوا۔ چنانچہ اُنکی تردید مین ایک عربی رسالہ

لکھ کے شائع کر دیا۔ جسکا نام "اسکات المعتدی" تھا اور جیسے ہی اُسکی اشاعت ہوئی اُسکی تردید مین مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کے فاضل شاگردون سے مولوی نور محمد صاحب ملتانی مرحوم اور ملا شیعہ نے اپنے اپنے رسالے شائع کیے جن مین علاوہ نفس مسئلہ کے ادبی غلطیان بھی نکالی تھین۔

مولانا اِنھین بحثون مین پڑے ہوے تھے کہ علیگڈھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی۔ اُنھون نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کر لیا چنانچہ مولانا بستی اور وہان کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کے لکھنؤ ہوتے ہوے علیگڈھ گئے۔ مین اُسوقت داروغہ حید بخش کی مسجد مین اُن سے ملا تھا۔ اور اُن کے چہرہ سے محسوس کر رہا تھا کہ یہان کے طلبہ مین سے ہر ایک کو وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی مین تھے۔ اسلیے کہ اُسوقت تک پبلک سے اُن کو سروکار نہ تھا علیگڈھ مین سید صاحب نے اُنھین اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان مین جگہ دی جو سب سے الگ بالکل باہم اور بے ہمہ تھا۔ اور ایک خاموش مقام تھا اُن مین جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کے سید صاحب نے اُن سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے۔ اور روز گھنٹون صحبت رہتی۔

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور و خوض مین رہتے اور تحقیق و تدقیق کی غرض سے اُنھین اکثر حدیث و فقہ و تاریخ و سیر کی کتابون کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو اُنھون نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی و وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اس سے زیادہ سید صاحب اُن کی تلاش جستجو اور طلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔ اس زمانے مین مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور اُن کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونون کے ساتھ ہفتون کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے مجھسے حد درجہ کی بےتکلفی تھی۔ اور مین اس بات کو ہر صحبت مین محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونون کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہین۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن سے مشورہ کیے نہ کرتے۔ اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہی کہ میرے علم مین اُن کی سب سے پہلی نظم جو اِن دنون شائع ہوئی "صبح امید" ہے جس مین اُنھون نے مسلمانون کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ مین ظاہر کیا ہی۔ اور اسی زمانہ مین علیگڈھ کا ایک طالبعلمانہ

شائید پر اُنھون نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔

اِن چیزون نے اُنھین فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس مین شک بھی نہین کہ وہ ایک نیچرل شاعر تھے اور اپنی نظمون کو ایسی نغمہ خیز دھن مین سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے بہت پسند کیا اور طلبہ نے اُسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دھن بنا کے سارے ہندوستان مین پھیلا دیا۔ مگر پھر بھی مین کہون گا کہ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ علم کے عالم مین اُن کی شان ایک شاعر کے درجے سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی۔

اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ تاریخی تنقید و تحقیق مین مصروف تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ "مسلمانون کی گذشتہ تعلیم" پر اُن کا لکچر تھا جسے اُنھون نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس مین پیش کیا تھا۔ یہ لکچر مسلمانون کی نظر مین بالکل ایک نئی اور بہت ہی دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اُس پر دلگداز مین ریویو ہوا ہی تو کوئی نہ تھا جو اُس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔ اسی نوعیت کی اُن کی دوسری کتاب "المامون" تھی جو علی العموم بہت پسند کی گئی۔ اور اسی کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہین۔ اور آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہین۔ اب سید صاحب کی صحبت اور پبلک کی حوصلہ افزائی نے مولانا کو اسی کوچے مین آگے بڑھانا شروع کیا۔ سیرۃ النعمان لکھی۔ سیرۃ الفاروق لکھی۔ اور تاریخی جستجو کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کتابون کی تلاش مین قسطنطنیہ پہونچے۔ اور واپس آ کے اپنا سفرنامہ شائع کیا۔ جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ جس شوق مین وہان گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور اسی وجہ سے اُن کی یہ تصنیف بھی ایک ناکام تصنیف ہے۔

اس موقع پر اُن کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کر دینا بھی لطف سے خالی نہ ہو گا۔ کہ سرسید اصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ مین تھے لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک اُنھین معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہوتا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے اُن کے دل مین جو بھڑک تھی وہ بھی ممکن نہ تھا کہ اُنھین نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔ لہذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے وہ بلا واسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے۔ اور آخر مین اس بات کی

کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کرین۔ اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعریت کی طرف کھینچنا چاہتے ہین اُنھون نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا تخت دشمن اور فقہ کے پردے مین چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی کے طلبہ تو اُن کی باتون سے خوشش ہو ہو کے دینداری و خوش اعتقادی کے دھوکے مین معتزلی ہونے لگے۔ اور موجودہ علماے حنفیہ کو اُن سے سخت عناد ہو گیا۔

اب اس کے ساتھ ہی اُن مین ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ اُن کی طبیعت مین باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت۔ علیگڈھ کالج کی مرجعیت۔ اور اُن کی ذاتی قابلیت نے اُنھین ابتداءً اس حیثیت سے پبلک مین انٹرڈیوس کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور اُن کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہین۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ رکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانون مین اس خیال کو اور پختگی حاصل ہو گئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اِس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سُبکی تصور کرتی تھی۔ اپنی اُن تصنیفون اور نظمون کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن مین خود ہی اپنی اِس حیثیت کو آتنکار اکر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علیگڈھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلما مین شرکت کی اور سمجھے کہ اِس ذریعہ سے مین علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے پر پہونچ جاؤنگا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہی۔ مین نے اُن کو بارہا اِس خیال سے روکا۔ اور اُسی زمانے مین کہ دیا تھا کہ علما بس مین آنے والے نہین ہین۔ اِن مرحومین اُمت مین سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس جماعت مین فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہون اُس پر آیۂ کریمہ "لو کان فیھما الھتان الا اللہ لفسدتا" پوری پوری صادق آتی ہے۔ اُن کے بہت سے دوستون نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علیگڈھ کالج ہی ہی۔ مگر اُنھون نے نہ مانا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو اُنھون نے ندوہ کو بیحد فائدہ پہونچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر مین ندوہ والے مرحومین اُمت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے۔ جس کا اُن کے دوستون کو بیحد ملال ہوا۔ اور خود بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوے مرے۔

دوسری طرف علیگڈھ پارٹی سے علحدہ ہونے کا نتیجہ ہوا کہ نئے تعلیم یافتہ

گروہ مین سے بہت سے قابل لوگ اُن کے خلاف ہوگئے۔ جو ظاہر مین تو اُن سے موافق تھے مگر موقع پاتے ہی اُن پر اعتراض کر جاتے۔ اُدھر مولانا کے دل مین کچھ ایسی ضد پیدا ہوگئی کہ سید صاحب کا جو درجہ اُن کے قدر شناسون کے دل مین تھا اُس سے انھین گرانا چاہتے۔ اور بعض صحبتون مین ایسی باتین کہہ جاتے جو لوگون کو اور زیادہ ناگوار گزرتین۔ ندوہ کا انتظام ہاتھ مین لینے کے زمانے مین اُن کی یہ حالت تھی کہ کالج مین اور مسلمانون کے ساتھ سید صاحب کا جو طرز عمل دیکھ چکے تھے اُسی کو اپنا دستورالعمل قرار دے لیا تھا۔ اور ساتھ ہی سید صاحب سے اپنی سلبی لگی اور برأت ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر در اصل یہ وہ باتین تھین جو اُن سے کبھی نبا نہ تھین۔

اسی دوران مین اُنھون نے اور کئی کتابین لکھین۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب الفاروق علیگڈھ مین شائع ہوچکی تھی۔ علم الکلام۔ الکلام۔ سوانح مولانا روم وہ کتابین ہین جو مسلمانون کے سامنے اعتزال کو لغایت کا لباس پہنا کے پیش کرتی ہین۔ شاعرانہ مذاق مین تاریخی جستجو کے امتزاج نے اُن سے موازنۂ دبیر و انیس اور "شعر العجم" کو تصنیف کرایا۔ مگر سب سے اہم تصنیف سیرۃ رسول صلعم ہی جس کو ناتمام چھوڑ کے دنیا سے گئے ہین اُن کی وصیت کے مطابق مولانا حمید الدین صاحب اور مولوی سلیمان صاحب ندوی نے اس کام کو اپنے ہاتھ مین لیا ہے اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے آخر تک مربی گری کرنے کا وعدہ فرمایا ہی۔ کوشش ہو رہی ہی کہ یہ کام بہت جلد پورا ہو اور ہمین امید ہی کہ یہ مولانا کی اعلیٰ ترین اور مفید ترین تصنیف ثابت ہوگی۔

مولانا کا اہم کام رسالہ "الندوہ" تھا جس نے مسلمانون کے لیے بہت سا محققانہ تاریخی سامان فراہم کر دیا۔ اور اس کے سلسلہ مین مولانا نے بڑے بڑے اہم مسائل مین تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ قیام قسطنطنیہ کے زمانے مین اُنھین عثمان پاشا مرحوم کی سفارش سے سلطان المعظم نے تمغہ مجیدیہ عطا کیا۔ اور گورنمنٹ سے اُن کو شمس العلما کا خطاب عطا ہوا جو چیزین خان بہادرون کے نزدیک چاہے کیسی ہی اہمیت رکھتی ہون ہمارے نزدیک چندان قابل لحاظ نہین۔

نرخ نامۂ اجرت اشتہار

آپ کو غالبًا معلوم ہوگا کہ دلگداز کی اشاعت دو ہزار سے زیادہ ہی اور ایک مشہور اور مستند رسالہ ہونے کی وجہ سے تمام خریدار اُس کے پرچون اور اُسکی جلدونکو محفوظ رکھتے ہین - اور اشتہارات کے لیے اشاعت کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہین ہوسکتا - عام اخبارات پر صرف ایک دفعہ اشاعت کے وقت لوگونکی نظر پڑتی ہی اور دلگداز کے اشتہار دن پر سہا سال تک ہمیشہ نظرین پڑتی رہتی ہین - مجھے یقین ہی کہ دلگداز مین اشتہارات کو شائع کرا کے آپ جو فائدہ اُٹھا سکتے ہین اور کسیطرح ممکن نہین - اِس سے پہلے دلگداز مین اشاعت اشتہارات کیطرف بہت کم توجہ کیگئی لیکن اب خاص اہتمام کیا گیا ہی - دلگداز کی قیمت اسقدر کم ہی کہ قطعی اُمید ہی کہ سال کے اندر اندر اِس کی اشاعت چار پانچ ہزار ہوجائیگی - ڈیڑھ روپیہ سالانہ چندہ مع محصولڈاک اور پھر ختم سال پر ایک نیا ناول مفت اس صورت مین کون خریداری نہ کرے گا -

نرخ نامہ حسب ذیل ہے

قسم کاغذ	مدت اشتہار	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
معمولی اشتہار	سالانہ	۵۰	۳۵	۲۵
"	چھ ماہ	۳۰	۲۰	[illegible]
"	تین ماہ	۲۰	[illegible]	[illegible]
"	ایک مرتبہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]

دلگداز پریس

عمدہ اور اعلی درجہ کی چھپائی اور پھر اُسکا وقت پر ملجانا غیر ممکنات مین سے تصور کیا گیا ہی اِس کمی کو دیکھ کے دلگداز پریس نے چھپائی کا نہایت اعلی درجہ کا انتظام کیا ہی - اور اِس کا اہتمام کیا ہے کہ جس تاریخ کتاب کے مکمل چھاپ دینے کا وعدہ کیا جائے اُسی تاریخ دیدی جائے اس مطبع کو خاص فوقیت یہ بھی حاصل ہی کہ مولنا محمد عبد الحلیم صاحب شرر سے اصلاح و مشورے اور تصحیح و ترمیم مین مدد ملسکتی ہی - جن صاحبون کو اپنی کتابین عمدہ اور جلد چھپوانا ہون فورًا اطلاع دین - مگر خیال رہے کہ صرف اعلی درجہ کی چھپائی ہوتی ہی - چھپائی کا نرخ مراسلت سے طے ہوسکتا ہی کیونکہ اُسکا دار و مدار زیادہ تر کاغذ اور لکھائی کی نوعیت پر ہے۔

المشتہر منیجر دلگداز - کٹرہ بزن بیگ خان

(لکھنؤ)

تمام تصانیف مولانا شرر اور مطبع دلگداز کی دوسری کتابیں

تصنیفات مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر

تاریخ و سیر وغیرہ

(۱) جنید بغدادی حضرت جنید کے حالات ۔

(۲) ابوبکر شبلی حضرت شیخ شبلی کے حالات

(۳) تاریخ سندھ ۔ سندھ کی مکمل تاریخ ۲ جلد قیمت

جلد اول ۔ جلد دوم

(۴) حروب صلیبیہ ۔ مصنفہ مسٹر کاکس کا ترجمہ [illegible]

(۵) تاریخ بغداد ۔ مرکز خلافت عباسیہ قیمت

(۶) ملکہ زنوبیہ ۔ ایک عربی شہزادی

(۷) خواجہ معین الدین چشتی ۔

(۸) الحکم الرفاعیہ مصنفہ شیخ احمد رفاعی کا ترجمہ ۔

(۹) آغا علی صاحب رئیس لکھنؤ مرحوم کے حالات ۔

(۱۰) سکینہ بنت حسین جناب سکینہ کے حالات ۔

(۱۱) سرسید کی دینی برکتیں ۔

ناول

(۱۲) رومتہ الکبریٰ ۔ سب سے نیا تاریخی ناول

(۱۳) حسن کا ڈاکو ۔ سب سے نیا اخلاقی ناول حصہ اول ۔ دوم

(۱۴) اسرار دربار حرام پور ۔ نمبر ۱ ۔ نمبر ۲

(۱۵) زوال بغداد ۔ شیعہ سنیوں کا جھگڑا اور نسل علی کا استیصال

(۱۶) غیب دان دلہن ۔ یا کذب اور ضعیف اعتقاد بی بی کی برکتیں ۔ اس کی حیرت انگیز غیب دانی ۔

(۱۷) ماہ ملک ۔ سچا تاریخی ناول

(۱۸) یوسف و نجمہ کامل ۔ [illegible]

(۱۹) شہید وفا ۔ [illegible] سلطنت کا خاتمہ

(۲۰) فتح اندلس ۔ [illegible]

(۲۱) مقدس نازنین ۔ ایک لڑکی کا پوپ بن جانا ۔

(۲۲) ملک العزیز ورجنا ۔ [illegible]

(۲۳) ایام عرب ۔ جاہلیت عرب کے حالات ۔ ۲ حصہ

(۲۴) فردوس بریں ۔ [illegible]

جلد ہائے دلگداز

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۱ء ۔ جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۹ء

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۴ء ۔ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۰ء

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۵ء ۔ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۱ء

جلد دلگداز سنہ ۱۹۰۶ء ۔ جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۲ء

جلد دلگداز سنہ ۱۹۱۳ء

دیگر اعلیٰ مطبوعات دلگداز پریس

معاشرت ۔ ایک اعلیٰ درجے کی اخلاقی کتاب انگریزی کی گلستان سر جان لبک کی "یوز آف لائف" کا ترجمہ ۔

رفع النقاب ۔ مروجہ پردہ کے خلاف ایک مدلل رسالہ ۔

جمیلہ ۔ ایک اعلیٰ درجے کا اخلاقی ناول مصنفہ مولوی [illegible]

بیوفا ۔

المشتہر حکیم محمد سراج الحق ۔ منیجر دلگداز کٹرہ بزن بیگ خاں ۔ لکھنؤ